کڑوے بادام
ڈاکٹر سلیم اختر

کڑوے بادام

افسانے

ڈاکٹر سلیم اختر

سنگِ میل پبلی کیشنز، چوک اردو بازار، لاہور

ضابطہ

۱۹۸۸ء

تعداد : ۱۰۰۰

پبلشر : نیاز احمد
سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

پرنٹرز : آر-آر پرنٹرز، لاہور

قیمت : ۹۰/۰۰ روپے

ISBN 969-35-0062-8

شو روم : ۲۵-شاہراہِ پاکستان (لوئر مال) لاہور

ترتیب

تال پاتال

بحرِ ظلمات

"میں"

آنکھ کھُلنے پر کچھ دیر تک یہ احساس نہ ہو سکا کہ میں کہاں ہوں، نہ میں اپنے کمرہ میں تھا اور نہ ہی اپنے بستر پر ـــــ تو پھر کہاں ؟ اعصاب میں عجب سرشاری تھی کہ کھُلی آنکھیں ابھی تک بند آنکھوں کے سپنے میں تھیں۔ وہ عجیب حسُن تھا، شعلہ ؟ شبنم ؟ مہک ؟ تو پھر کیا ـــ ؟ سراپا ایسا کہ عورت ہونے کے باوجود عورت نہ لگتی، تو پھر وہ کون تھی ؟ پری ؟ حور ؟ کہ ازلی عورت کا اکمل ترین پیکر ؟ شاید اسی لئے وہ بے لباس تھی، لیکن ایسی عریانی کہ نظارہ حجاب میں تبدیل ہو جائے اور نگاہ تارِ نقاب کا کام کرے۔ یہ وہ حسُن تھا جس کا صرف تصوّر کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ سراپا تھا جو صرف خوابوں میں دیکھا جا سکتا ہے اور یہ وہ عورت تھی جو خوابوں میں بھی حاصل نہیں کی جا سکتی ـــــ میں اندھیرے کمرے میں جیسے دیر تک اسی کو جگمگاتے دیکھا کیا۔ تب میں نے زندگی کی پہلی (اور غالباً آخری دعا مانگی)

"اے خدُا! یہ عورت مجھے بخش دے اور اس کے عوض میری نصف زندگی لے لے!"

میں اس وقت سالِ اوّل کا طالب علم تھا، اور یہ بات ہے ۱۹۵۱ء کی، اگرچہ یہ خواب عنفوانِ شباب میں دیکھے جانے والے بھیگے خوابوں کے برعکس تھا، مگر اعصاب پر

اثرات ویسے ہی تھے۔ یہی نہیں بلکہ طویل مدت تک میں اُس خواب کو جنسی معنی دیتا رہا لیکن کافی عرصہ بعد جب میں نے یونگ کی نفسیات کا مطالعہ کیا تو اُس خواب سے وابستہ گہری معنویت کا انکشاف ہوا، خواب کا نسوانی پیکر عام مفہوم میں عورت نہ تھی بلکہ اپنے مکمل ترین حسن میں یہ تکمیلِ وجود کی علامت تھی۔ اس لیے صداقت کی مانند وہ لباس کی محتاج نہ تھی اور اِس عالم میں تھی کہ اُس کے اکمل ترین حسن کی چاندنی لبادوں میں مقید نہ کی جا سکتی تھی، ویسے بھی تکمیل کو خوش رنگی کے مصنوعی سہاروں کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اُسے حاصل کرنے کی دعا مانگنا بھی لاشعوری طور پر تکمیلِ وجود
کی خواہش کا اظہار تھا۔ میں نہیں جانتا وہ دعا قبول ہوئی یا نہیں لیکن اگر میں کسی بھی امر میں تکمیل کے قریب قریب ہی پہنچ پایا تو جانوں گا کہ دعا قبول ہو گئی اور نصف زندگی کی قیمت پر یہ سودا مہنگا بھی نہیں۔ یہ میرا ایمان ہے۔

وہ پیکرِ خواب زندگی بھر ذہن پر حاوی رہا اور میرے اعصاب اُسے فراموش نہ کر پائے۔ چنانچہ زندگی میں ملنے والی مؤنثوں کا اسی سے موازنہ کرتا رہا اور اسی لیے عام زندگی کی عورتیں اُس کے مقابلے میں بہت ہیچ اور دلگر اور بھیانک نظر آتیں، میں مارے کراہت کے پیچھے ہٹ جاتا۔ ان کی آوازوں کی کرختگی، جسم کی بدبو، نگاہوں کی مکاری اور مصنوعی پن، اور سب سے بڑھ کر اُن کی نیتوں کا نیک نہ ہونا۔ یہ سب مجھے اُن سے بیزار کر دیتا۔ یہ رویہ اِس حد تک پختہ ہو گیا کہ میں اچھا خاصا زن بیزار بن کر رہ گیا۔ (جس کی باقیات مجھ میں ابھی تک موجود ہیں۔) لیکن جب خواب کے درست معنی سمجھ میں آ گئے اور علامت کی تہہ کو پا لیا تو سمجھا کہ لاشعوری طور پر میں اُن مؤنثوں کو بھی اپنے وجود کی تکمیل کے ذرائع تصور کرتا تھا۔ جبکہ اُن کا مقصد کم سے کم کچھ اور۔ اور زیادہ سے زیادہ گھر بسانا ہوتا تھا۔ جبکہ میں لفظ شادی سے ہی الرجک تھا کہ میں

عمر نیا کو ایک عورت کے لنگر کے ساتھ بسر کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اب اگرچہ وہ بات تو نہیں رہی مگر اب بھی عورت سے اس کے مونث پن کے علاوہ کچھ اور بھی چاہتا ہوں، وہ حسن جو محض دائروں اور قوسوں کا مرہون منت نہ ہو، ایسی دلبری جو دل لینے دینے کی سوداگری سے مشروط نہ ہو اور قرب کی وہ سرشاری جو اعصاب اور غدود کی محتاج نہ ہو۔ اسی لئے مجھے اپنے بعض ادیب دوستوں کے برعکس مونثوں کے پیچھے پیچھے پھرنے کی کبھی بھی ضرورت محسوس نہ ہوئی، نہ ہی میں نے کبھی حقیقی یا مفروضہ یا مبینہ تعلقات کو بارہ مصالحے کی چاٹ بنا کر حلقۂ احباب کی رال ٹپکانے کی کوشش کی ہے۔ جہاں تک عورت کے چکروں کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میں نے نروان حاصل کر لیا ہے۔ اس لاتعلقی پر مبنی جس رویّہ نے جنم لیا اس نے مجھے نفسیاتی مضامین اور جنسی افسانے لکھنے میں بہت مدد دی۔ جسم پر لکھنے میں دو بڑے خطرات مضمر ہیں۔ ایک مصلحِ اخلاق نہ بنا جائے، دوسرے سنسنی خیز نہ بنا جائے، جہاں یہ دونوں یا ان میں سے ایک نے بھی غلبہ پا لیا تو جان لو کہ افسانے کا بیڑا غرق ہو گیا۔ اسی لئے منٹو بہتر افسانہ نگار ثابت ہوا۔ جبکہ تمام تر بےباکی کے باوجود لارنس جسم کی اخلاقیات کا داعی بن کر رہ گیا۔

میرے لئے برتر وجود تحریر سے عبارت ہے۔ اس لئے ڈھائی سطر اس کے بارے میں بھی:

میں نے کم عمری سے لکھنا شروع کر دیا تھا اور پانچویں جماعت میں اپنا نام شائع کرا چکا تھا (اس زمانے میں، میں انبالہ میں تھا) دسویں جماعت (۱۹۵۱ء) تک بچوں کے تمام اچھے اور اہم پرچوں میں میری کہانیاں، خط، مضامین اور نظمیں شائع ہوتی رہیں جبکہ اس وقت تک کہانیوں کی چار پانچ کتابیں بھی طبع ہو چکی تھیں۔ آٹھویں جماعت میں تھا کہ لاہور کے ایک قلمی پرچہ میں میرے پہلے دو افسانے "قربانی" اور "ساحرہ" شائع

ہوئے ۔ اَب تو اس پرچہ کا نام بھی یاد نہیں، البتہ اتنا دھیان پڑتا ہے کہ اس کی پیشانی پر "پاکستان میں سب سے زیادہ چھپنے والا" رقم ہوتا تھا لیکن میرے دو افسانے ہی شائع کر کے اُس کی روح قفسِ صحافت سے پرواز کر گئی —— ناتوانی سے حریف دمِ عیسیٰ نہ ہوا!

۱۹۵۱ء میں (جبکہ میں میٹرک کا طالب علم تھا) "شمع" دہلی میں "ایک مجبور یہ ایک طوائف" اور "کٹھ پتلی" شائع ہوئے ۔ یہ دونوں افسانے کرسچین کال گرلز کے بارے میں تھے ۔کلبوں کا ماحول تھا ، روشنیاں تھیں اور شراب و شباب تھا ۔

ابا جی کی عبدالحمید عدم سے بہت دوستی تھی ۔ اسی ناطے میرا اُن کے گھر آنا جانا بھی تھا ۔ ابا جی نے عدم صاحب سے میرے لکھنے کے شوق کا ذکر تو انہوں نے میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے میری شاعری کی اصلاح شروع کر دی شاعری کیا تھی بس نثری غزلیں تھیں ، جنہیں عدم صاحب کمالِ محنت سے پابند غزلوں میں تبدیل کر دیتے ، لیکن جلد ہی مجھے یہ احساس ہو گیا کہ "میوز" مجھ پر مہربان نہیں ۔ چنانچہ اُسے خود سے بہتر لوگوں کے لئے چھوڑ دیا ۔ اب اس "شاعری" میں سے مجھے صرف اپنا تخلص یاد رہ گیا ہے —— انجان!
ذرا ڈاکٹر سلیم اختر انجان لکھئے تو کیا مضحکہ خیز لگتا ہے ۔

کالج میں —— میں فلسفہ کا طالب علم تھا اور تصوف پر کتابیں پڑھتا تھا ۔ تصوف کا توڑ فرائڈ نے کیا جبکہ فلسفہ پڑھنے کی خواہش بھی بعد کے نفسیاتی مطالعے میں دب کر رہ گئی ۔ ۱۹۵۵ء میں بی اے کے بعد میرے پاس ڈگری کے علاوہ اپنی اعصابیت بھی تھی ۔ جس میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا تھا ، تب میں نے خود شناسی (یا پھر خود تشخیصی ؟) کے لئے تحلیلِ نفسی کا مطالعہ شروع کیا اور اپنی ذات کے لئے اُسے بے حد سود مند پایا کہ خود میں نیوراتی ہوتے سے بھی بچا اور دوسروں کے نفسیاتی مسائل اور اپنی ذہنی الجھنوں کی تفہیم کے لئے بھی نگاہ پیدا ہو گئی ۔ نفسیات اور جنس پر میری متعدد کتابیں ہیں ۔ جن کے مطالعے کے بعد مجھے اکثر قارئین اپنی جنسی اور نفسیاتی الجھنوں

کے بارے میں خطوط لکھتے رہتے ہیں - میں نے اُنہیں بساط بھر مشورے دیئے ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ اکثر نے اُن کی افادیت کا اعتراف بھی کیا ہے -

جو شخص نفسیات میں یوں ڈوبا ہو کہ اپنی ایک بیٹی کا نام سائیکی رکھے اُس کے لئے اپنی تحریر میں نفسیات سے صرفِ نظر ممکن نہ تھا - اسی لئے میری تحریر میں نفسیات نے معانی بھرے ہیں - وہ جو دل کا پردہ تھا آخر کو اپنا فن ٹھہرا -

آج سفید سر، ۳۵ کتابوں، ایک بیوی اور تین بچّوں کے ساتھ مڑ کر پیچھے دیکھتا ہوں تو وہی خواب والی عورت مکمل ترین بے حجاب حسن کے ساتھ نظر آتی ہے - وہ کچھ اشارہ کر رہی ہے، غالباً پیچھے مُڑ کر دیکھنے سے منع کر رہی ہے کہ پتھر بن جانے کا خدشہ ہے - شاید وہ یہ سمجھا رہی ہو کہ میں تو قدم قدم تمہارے ساتھ چل رہی ہوں یا پھر مستقبل میں ملنے کی نوید سُنا رہی ہو - مدّتوں میری یہ آرزو رہی تھی کہ اُسے ایک مرتبہ پھر خواب میں دیکھوں لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ ایسی آرزو بے کار ہے کہ وہ میری ذات ہی کا حصّہ ہے، یہ تو میری " ''ANIMA'' ہے - مرد کو متوازن کرنے والی نسوانی روح!

جہاں تک افسانوں کے اس مجموعہ کا تعلق ہے تو آپ کو یہ نفسیاتی اور جنسی کہانیوں سے پاک نظر آئے گا - اس لئے نہیں کہ اب میں نے سر سفید ہو جانے کے بعد ان کہانیوں کو جوانی کی غلط کاریاں سمجھتے ہوئے عاق کر دیا ہے - ایسی بات نہیں بلکہ سیدھی سی وجہ یہ ہے کہ کتاب ضبط ہو جانے کا خدشہ تھا (نیاز احمد صاحب کو) حالانکہ یہ تمام کہانیاں مطبوعہ ہیں اور ان کہانیوں سے جن لوگوں کا اخلاق خراب ہونا تھا، ہو چکا ہوگا - تاہم رفعِ شر کے لئے ان سب کہانیوں کو بطور سزا اپنے اس مجموعہ سے جلا وطن کر دیا پاک لوگوں کی محفل میں عطر پھلیل لگا کر حاضر ہونا چاہیئے - یہی نہیں بلکہ احتیاطاً منہ میں الائچی بھی رکھی لینی چاہیئے - لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام!

نیاز صاحب کا منصوبہ تمام افسانوں پر مشتمل ایک ہی مجموعہ کی اشاعت

کا تھا اور میں بھی خوش تھا کہ چلو عمر بھر کی کمائی ایک ہی "کلیات" میں سمٹ جائے گی۔
لیکن نفسی جنسی کہانیوں کے اخراج سے میرے کئی نمائندہ افسانے (جیسے بکری، بسیرے
دی جورو، نقلی چوکیدار، بنجر مرد زرخیز عورتیں، بیوی کا الاؤ، کاناچور، مودی
کی اینٹ) کتاب میں شامل ہونے سے رہ گئے۔

اگرچہ میں نے بالعموم نفسی جنسی رنگ کی کہانیاں لکھیں۔ لیکن ان کے ساتھ ساتھ
ایسی معاشرتی کہانیاں بھی سرزد ہوتی رہیں جنہیں نفسیات کے مقابلہ میں "بے ضرر کہانیاں"
قرار دیا جا سکتا ہے۔ ادھر گذشتہ پانچ سات برس سے میں نے صرف استعاراتی اور
علامتی کہانیاں ہی لکھیں۔ کچھ نیم تجریدی کہانیاں بھی ملیں گی۔ چنانچہ کتاب کا دوسرا حصہ
"حجرۂ ہفت بلا" "مقتال پاتال" اور "بحر ظلمات" کے عنوانات تلے اسی انداز کی کہانیاں
ملیں گی۔ میرا تازہ ترین کام بھی یہی ہے۔ یوں دیکھیں تو بحیثیت کہانی کار
میرے فن کے تین رُخ بنتے ہیں۔

جنسی نفسیاتی کہانیاں، معاشرتی کہانیاں اور استعاراتی علامتی کہانیاں۔
میری ذہنی تربیت کیونکہ حقیقت نگاری کی روایت میں ہوئی اس لئے استعارہ اور
علامت کو بھی میں ذریعۂ ابلاغ جانتا ہوں۔ کہانی میں اگر معانی اور علامت مصافحہ
نہیں کر پاتے تو پھر علامت کا کوئی جواز نہیں، علامت سے شعوری اخفا کا کام لینا
اور استعارہ کے ابہام سے معانی کی متنوع جہات پیدا کرنا اور بات ہے لیکن ان کی
بھول بھلیاں میں قاری کو گم کر دینے کا مطلب ادب کے سماجی کردار سے چشم پوشی
کرتے ہوئے محض اپنی نرگسیت کا اظہار ہے۔ اسی لئے تو کنویں میں نکالی گئی آواز اسی
محدود دائرہ میں محبوس رہتی ہے اور یا تھ روم موسیقی نل کے شور سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔

— ایک اعتراف

تنقید کے مقابلہ میں میرے لئے افسانہ لکھنا ہمیشہ مشکل رہا ہے۔ سال میں بمشکل ایک دو افسانے لکھ پاتا ہوں بالکل ایسے جیسے کچھ لوگ صرف عید کے دن عیاشی کرتے ہیں۔ اور پان کھا کر میلہ لوٹنے نکلتے ہیں تو اس طرح یہ ایک دو افسانے ہی میری سال بھر کی عیاشی ہوتے ہیں۔ لیکن شاید عیاشی کا لفظ غلط ہے۔ کیونکہ میرے لئے افسانہ لکھنا کبھی بھی خوشگوار تجربہ نہیں ثابت ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لکھنے سے پہلے اور لکھنے کے دوران میں اعصابی تناؤ میں مبتلا رہتا ہوں۔ اس حد تک کہ افسانہ مکمل کر لینے کے بعد بھی کتھارسس کا احساس نہیں ہوتا۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے نچڑ گیا ہوں۔ شاید اس لئے میں زیادہ افسانے لکھنے پر قادر نہیں۔ ادھر دن بدن میرا تخیل MORBID ہوتا جارہا ہے۔ جس کے مظہر "لہو کی چھپا ہٹ" اور "شاہی دسترخوان" جیسے افسانے ہیں۔ یہی نہیں مجھے مافوق الفطرت سے جو دلچسپی رہی ہے وہ بھی افسانوں میں رنگ آمیزی کر رہی ہے۔ چنانچہ "پکار" "اماوس" اور "سائے کی طرح ساتھ پھریں" OCCULT سے میری دلچسپی کے اظہار کی صورتیں ہیں۔

بے ضرر کہانیاں

محاذ ۱۹۷۱ء

میں یہ تو محسوس کر رہا ہوں کہ سڑک میری دیکھی ہوئی ہے۔ لیکن یہ یاد نہیں آ رہا کہ سڑک کس شہر کی ہے۔ یہ لاہور کی تو ہرگز نہیں، اتنا مجھے یقین ہے شاید پشاور کی ہو یا پھر کراچی کی۔

میں ایک خوف زدہ بچے کی مانند اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہوں۔ شام کے سائے پھیلتے جا رہے ہیں۔ میری بیوی کچھ کہہ رہی ہے لیکن میرا ذہن ابھی تک اسی الجھن میں ہے کہ یہ سڑک کہاں کی ہے؟ معلوم کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اسی سے تو مجھے شہر کے نام کا علم ہوگا۔ ایک تانگہ کو دیکھ کر جان میں جان آئی ہے۔ اپنے علاوہ ایک اور متنفس کو اس اجاڑ شہر میں دیکھ کر زندہ ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ ہم دونوں بھاگ کر اس کے قریب ہوتے ہیں تو تانگہ کو خالی پاتے ہیں۔ نہ جانے تانگہ والا کہاں مرگیا۔ گھوڑا ہم دونوں کو مشکوک نظروں سے دیکھتا ہے اور پھر جیسے بڑے بڑے دانتوں والا منہ کھول کر ہمیں کھانے کو دوڑتا ہے۔ ہم دونوں بھاگتے ہیں۔

"میرے بچے!" وہ پھولی ہوئی سانس کو روکنے کی کوشش کرتی ہے۔

"بچے کہاں؟" میں اسے یاد دلاتا ہوں۔ "وہ تو گھر میں ہیں۔"

"گھر؟"

"ہاں! ہاں!! گھر" میں جیسے اسے ذہن نشین کرا رہا ہوں "گھر"

"مگر گھر کہاں ہے؟"

"گھر؟"

"ہاں! ہاں!!

"گھر ہی کی تلاش میں تو پھر رہے ہیں۔"

خاموش سڑک پر ہمیں اپنی آوازوں سے وحشت ہونے لگتی ہے۔

"شی - شی!" میں اسے چپ کراتا ہوں۔

ہم دونوں رُک کر خاموش پھولی ہوئی سانس سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔ خاموشی گاڑھی ہوتی جا رہی ہے۔ اتنی کہ خود خاموشی کو بھی سُنا جا سکے۔ میں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے دوبارہ خاموش رہنے کو کہتا ہوں۔ ہم دبے پاؤں چل رہے ہیں۔ چلتے جاتے ہیں حتیٰ کہ اچانک ہی خود کو ایک مکان میں پاتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ ہم اس میں کیسے آن پھنسے، لیکن یہ ضرور جانتے ہیں کہ یہاں سے نکلنا محال ہے۔ مکان ویران ہے۔ فرش پر کاغذات اور پھٹی کتابوں کے اوراق ہیں جنہیں غالباً پردوں کے بغیر کھڑکی باہر سے لائی ہو۔

ہم دونوں ایک دوسرے کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں جھانک رہے ہیں۔ دونوں کو بیک وقت کسی ہاتھ کے اپنی گردنوں کی طرف بڑھنے کا احساس ہو رہا ہے۔ ہاتھ نظر نہیں آتا، یہ ہاتھ نظر نہیں آ سکتا لیکن دیکھے بنا ہی اس کے بالوں اور موٹی موٹی ظالم انگلیوں کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی ہے کہ اگر یہ ہاتھ میری گردن کو چھو گیا تو میں ختم!

ہم دونوں دروازے کی طرف بھاگتے ہیں لیکن کھلے دروازے میں جیسے برقی رو دوڑ رہی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ غیر مرئی تختے ہمارے لیے کبھی نہ کھلیں گے۔

ہم دونوں مضبوطی سے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیتے ہیں۔ ہاتھ لحہ لحہ قریب ہوتا جاتا ہے جس طرح دو محبت کرنے والے کھلی آنکھوں سے ہاتھ میں ہاتھ دے کر موت کے کنویں میں چھلانگ لگا دیتے ہیں۔ اسی طرح ہم دونوں بھاگ کر دروازہ پار کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے گویا کسی عفریت کی گود میں جا گرے ہوں۔

آنکھ کھلنے کے بعد بھی میرے منہ سے چیخیں نکلنی بند نہ ہوئیں۔ میری بیوی کھڑی دل پر سے میرا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ "اٹھیے۔"

مگر مجھ میں ہاتھ ہٹانے کی سکت نہ تھی اور میری چیخیں جیسے میرے ہاتھ کو دل پر اور بھی دباتی جا رہی تھیں "ہائے اللہ! کیا ہوگیا آپ کو" وہ اندھیرے کے کنوئیں میں سے جیسے چیخ رہی تھی "اٹھیئے۔ کلمہ پڑھیئے...."

اور پھر ہوائی حملے کا سائرن بجنے لگا۔

سائرن کی آواز جیسے جھنجھوڑ کر پوری طرح بیدار کر دیتی ہے۔

اندھیرے میں چمکتا کلاک تین بجا رہا ہے۔ سائرن کی آواز اس ان دیکھے ہاتھ کی مانند گویا میرے دل کو مٹھی میں دبا رہی ہے۔ سر د پسینہ سے جسم بھیگ چکا ہے اور اعصاب گویا تن کر اب ٹوٹنے کو ہوں۔ عین اسی وقت بم کا پہلا دھماکہ ہوتا ہے اور میں چیخ کر بیوی سے لپٹ جاتا ہوں۔

میں خوف سے کانپ رہا ہوں۔

"ہوش کریں آپ"۔ وہ خود بھی کانپ رہی ہے "ہوش کریں" وہ جیسے کسی بچے کو چمکار رہی ہے۔ اتنے میں ایک اور دھماکہ ہوتا ہے۔ اور میری بے اختیار چیخ سے گویا کل عالم بیدار ہو جاتا ہے۔ میں گویا بخار میں کانپ رہا ہوں۔ اس کے ساتھ مجھے اپنے منہ سے بے معنی آوازیں نکلنے کا بھی احساس سا ہے۔ شاید میری آنکھوں سے آنسو بھی بہے ہوں۔ کیوں کہ میں نے خوف سے کھلتے اور بند ہوتے ہونٹوں پر نمکین سا ذائقہ محسوس کیا ، وہ لمحات میرے ذہن میں گڈمڈ سے ہیں۔ صرف اپنے شدید خوف کا احساس ہے ایسا خوف جو انسان زندگی میں اگر دوسری مرتبہ محسوس کرے تو جانبر نہ ہو سکے۔ میری بیوی مجھے مسلسل جھنجھوڑے جا رہی ہے مگر میری چیخ ہر دھماکہ کی بازگشت ثابت ہو رہی ہے اور پھر اچانک بمباری رک جاتی ہے مگر نہیں یہ میری بیوی کا زنانہ دار تھپڑ ہے جس نے مجھے گویا چونکا دیا ہے۔ میرا خوف سے کھلا منہ ایک دم بند ہو جاتا ہے۔

یوں تو دوسروں کی دیکھا دیکھی میں نے بھی اپنے سکوٹر پہ "کرش انڈیا" چسپاں کر رکھا تھا لیکن حالت میری ابتر تھی۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران میں لاہور سے دور ایک چھوٹے سے قصبے میں تھا اس لیے وہ جنگ مجھ سے اتنی ہی دور تھی جتنی کہ مثلاً ویت نام کی! اگر میں سرکاری ملازم نہ ہوتا

تو مدتوں کا ان لوگوں کی مانند شہر چھوڑ کر بھاگ چکا ہوتا جن کی سامان سے لدی کاروں پر "گرشش انڈیا" لکھا تھا ۔ جب میں اپنے چھوٹے بیٹے کو محلے کے بچوں کے ساتھ کاندھے پر لکڑی کا ڈنڈا رکھے لفٹ رائٹ، لفٹ رائٹ کرتے دیکھتا تو سر شرم سے جھک جاتا میری بیوی دن بھر محلہ کی عورتوں کے ساتھ امدادی کاموں میں مصروف رہتی ۔ ہماری ساری قوم کی طرح ہمارے محلے کے لوگ بھی نڈر اور پُرجوش تھے ۔ دن کو جب ہوائی جہاز آتے تو لوگ بھاگ کو ٹھوں پر چڑھ جاتے ۔

" وہ رہا "

" کہاں پر؟

" اندھے وہ دیکھو . . . . وہ رہا !"

" ہاں ! ہاں !"

ہوائی جہاز عید کے چاند کی مانند دیکھے جاتے ۔

میں خود پر لعنت بھیجتا کہ میں ان کی طرح کیوں نہیں ، میرا خون خوف سے کیوں پانی بن گیا ہے اور سائرن کی آواز سے میرے اعصاب کیوں مردہ بن جاتے ہیں ۔ میری بیوی نے مذاق کر کے مجھے ٹھیک کرنے کی کوشش کی ، لیکن جب اس نے میری حالت متغیر دیکھی تو پھر اس نے مجھے کبھی نہ چھیڑا ۔ چنانچہ سائرن کی آواز سن کر بچوں سے پہلے وہ مجھے سنبھالتی ۔

ایک دن !

ہوائی جہاز نے عین ہمارے کوٹھے پر سے یوں غوطہ لگایا کہ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے ، برتن بج اٹھے اور گھر میں زلزلہ آ گیا ۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں اس وقت چیخا تھا یا نہیں لیکن جب ہوش آیا تو میں نے خود کو پلنگ تلے پایا ۔ میرا حلق خشک تھا اور جب میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری تو اسے اکڑے پایا ، آواز دینے کو منہ کھولنا چاہا تو احساس ہوا کہ وہ تو پہلے ہی سے کھلا ہے ۔ میں چیخ کر بیوی کو آواز دینے کی کوشش کرتا ہوں لیکن کابوس کی مانند میرے منہ سے آواز نہیں نکلتی ۔ صرف ٹھنڈا پسینہ اور بے ترتیب سانسیں ۔

بیوی مجھے آواز دیتی آ رہی ہے۔

"آپ کہاں ہیں؟"

میرے بولنے میں خوف مانع ہے یہ خوف بیوی کا ہے۔ یہ خوف شوہر ہونے کا ہے، یہ خوف بچوں کا باپ ہونے کا ہے۔ یہ خوف مردانگی کا بھی ہے۔ یہ خوف کئی زنگوں کا ہے۔ اس کی آواز قریب آ رہی ہے اور میں گھٹنے پیٹ سے لگائے گیند بنا حالتِ جنین میں ہوں۔ وہ اسی کمرے کا رُخ کر رہی ہے۔ میرے دل کی دھڑکن شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی ہے، وہ اس پلنگ کی طرف آ رہی ہے۔ وہ قریب تر ہو رہی ہے۔ پلنگ کے پاس اس کے پاؤں رُکتے دیکھتا ہوں۔ سانولے پاؤں ننھے سے پاؤں جو ہوائی چپل میں بھی اچھے لگتے ہیں۔ میں جیسے سمٹ کر ذرّہ بن چکا ہوں۔ در و دیوار کی درز میں سما جانا چاہتا ہوں۔ دیوار جس کے اکھڑے پلستر کی مانند میرا خوف زدہ وجود ٹوٹ رہا ہے۔

وہ خاموش کھڑی بے پروا سرگوشی کرتی ہے۔

"آپ یہاں تو نہیں؟"

لہجہ میں تخاطب کم اور نہ ہونے کی دعا زیادہ ہے۔

اس کی سرگوشی دوبارہ سنائی دیتی ہے۔

یہ کوئی موقع نہیں ایسی بات سوچنے کا لیکن نہ جانے کیوں میرے ذہن میں زندگی کی وہ پہلی رات آجاتی ہے۔ جب اسے پہلے پہل بے حجاب دیکھا تھا۔ میں نے مردانگی کا رعب جھاڑنے کو کیا کیا جتن نہ کیے تھے۔ وہ نیچے جھانکے بغیر واپس چلی جاتی ہے۔ شاید اس نے میری سانسیں سن لی تھیں۔ شاید وہ ان سانسوں کو کسی چوہے کی سانسیں سمجھی ہو (اسے چوہوں سے بہت گھن آتی ہے) لیکن چوہا اس طرح انسانوں کی مانند کیوں سانس لینے لگا؟ غالباً اس نے اپنی عزت رکھنے کو میری عزت رکھ لی!

میں نے بعد میں اس کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی لیکن وہ ایسے ہی سپاٹ تھا

جیسے بالعموم بیویوں کا ہوا کرتا ہے۔ البتہ ہم دونوں چور رستوں سے بنے تھے۔ میں تو اپنے آپ سے تھا مگر وہ کس سے تھی، شاید وہ بھی اپنے آپ ہی سے ہو۔

ایک رات:

وہ رات دیگر راتوں سے کچھ زیادہ ہی دہشت ناک ثابت ہوئی۔ بلیک آؤٹ میں ڈوبا گھر اور گھر کو گھیرے ہوئے لاہور شہر، مجھے ہراساں کر رہا تھا مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ چاندنی بری لگی، اس کی دودھیا روشنی میں اب رومانس نہ تھا۔ یہ تو دشمن کو میرا گھر دکھانے والی دشمن چاندنی تھی۔ بھلا یہ مجھے کیسے بھاتی! میں اندھیرے کمرے میں لحاف میں منہ لپیٹے آنکھیں کھولے گٹھڑی بنا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے نیند نہ آئے گی۔ میرا سارا وجود گویا کان بنا اس آواز کا منتظر ہے جس سے ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔

وہ مجھے آواز دیتی ہے: "آپ سو گئے کیا؟"

"نہیں تو"

"سوتے کیوں نہیں؟"

"نیند نہیں آتی"

"کیوں؟"

"ویسے ہی"

وہ خاموش ہو جاتی ہے۔

"تم کیوں نہیں سوتیں؟"

"نیند نہیں آتی"

"کیوں؟"

"ویسے ہی"

میں خاموش ہو جاتا ہوں۔

"آپ سونے کی کوشش کریں۔"

"کر رہا ہوں"

وہ خاموش ہو جاتی ہے۔

"تم بھی تو سونے کی کوشش کرو۔"

"کر رہی ہوں۔"

اب ہم دونوں خاموش ہیں مجھے شدت سے اس گفتگو کے بے معنی ہونے کا احساس ہو رہا ہے

اس مرتبہ ایسی سرگوشی ابھرتی ہے جیسے باہر کوئی یہ بات نہ سُن لے "باہر چاند نکلا ہے۔"

چاند سے ہماری بہت سی یادیں وابستہ ہیں مگر میں خاموش رہتا ہوں۔ میرا ذہن تو چاند کے

کسی غار کی مانند بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ وہ پھر سرگوشی کرتی ہے۔

"آج چاند کی کونسی تاریخ ہے؟"

"پتہ نہیں"

اب اس کی آواز اتنی مدہم ہے کہ وہ مجھے اس کی نہیں بلکہ خود چاندنی کی آواز محسوس ہوتی

ہے: "میرے پاس آجاؤ۔"

میں خاموشی سے اٹھ کر اس کے پہلو میں لیٹ جاتا ہوں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیتی ہے۔

اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا ہے۔ ہم اس تاریک لحاف کے غار میں دو لاوارث بچوں کی طرح

گویا بخار میں کانپ رہے ہیں۔ ہماری زبانیں خاموش ہیں، ہمارے ہاتھ خاموش ہیں اور میرا سرد

جسم خاموش ہے۔ یہ میری حرارت اور توانائی کدھر گئی؟

میں آنکھیں کھولے لیٹا ہوں، اس کے سر کے بوجھ سے میرا بازو اکڑ گیا ہے لیکن میں ہلتا نہیں

شادی کے ابتدائی ایام میں وہ اسی طرح کسی بچے کی مانند بازو پہ سر رکھ کر سوتی تھی۔ میں اس زمانے

کی باتیں یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن کمال ہے کہ ذہن میں کچھ بھی تو نہیں ـــ ذہن، اعصاب

اور جسم۔ جیسے ایک ہی آواز کے منتظر ہوں۔

میرا دوست اور اس کی بیوی کار پر ہم سے ملنے آئے ہیں۔ وہ میری اڑی اڑی رنگت دیکھ کر پوچھتا ہے "ارے یہ تم نے کیا منحوس صورت بنا رکھی ہے"

"کوئی خاص بات نہیں"

اس کی بیوی بھی کہتی ہے "یوں لگتا ہے جیسے آپ بیمار رہے ہوں"

"نہیں بھابی! میں تو بالکل ٹھیک ہوں"

تو پھر یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے"

کچھ نہیں" میں بیزاری سے جواب دیتا ہوں "آپ کو تو وہم ہو گیا ہے"

چائے پی کر جانے لگے تو وہ میری بیوی سے کہنے لگا "ہم راوی کے پل پر جا رہے ہیں۔ آپ بھی چلیئے"

"راوی کا پل؟" میں پوچھتا ہوں "کیا کرنے؟"

"کچھ نہیں۔ ذرا گھومنے"

"ذرا گھومنے" میں اس کے لہجے کی نقل اتارتا ہوں۔

اس کی بیوی کہتی ہے "دراصل ہم وہاں اینٹی ایئرکرافٹ گنز دیکھیں گے۔ آپ بھی چلیں"

"ہاں ہاں! ضرور" میری بیوی خوش ہو کر کہتی ہے۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے" میں اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہوں۔

"تم جانتی ہو سب ہوائی جہاز اسی پل کے لیے تو آ رہے ہیں"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے، ذرا ہم بھی تماشا دیکھیں گے"

"تماشہ؟ یہ جنگ تماشہ ہے کیا؟"

"ابے مرا کیوں جا رہا ہے، یوں تو جنگ کی ہر فلم دیکھنے پہنچے ہوتے ہو اور اب اصل جنگ سے جان نکلی جا رہی ہے"

"وہ اور بات ہے"

" اگر تم اس لحاظ سے دیکھو تو یہ بھی اور بات ہے "

" ہاں چلیئے نا " میری بیوی نے زور دیا " ذرا اسی بہانہ آپ کی طبیعت بھی بہل جائے گا

اور میرے نہ نہ کرنے کے باوجود انہوں نے مجھے کار میں ڈال دیا۔

راوی کے پل پر پہلے ایسی ہی رونق تھی جیسے تمام لاہور پک نک منانے امڈ آیا ہو۔ مورچوں پر چاک و چوبند فوجیوں کو دیکھ کر کچھ میرے اوسان بھی ٹھکانے آئے ، وہ سب کسی طرح کی اوٹ کے بغیر پل پر گنیں لیے ڈٹے تھے۔ لوگوں نے ان کی توپوں کو ہار پہنا رکھے تھے۔ دوست کی بیوی بتا رہی تھی : " یہ ہار داتا صاحب کے مزار سے لوگ لاتے ہیں "

میرا دوست بولا " جب تک یہ فوجی یہاں پر ہیں داتا کی نگری کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا "

میری بیوی بولی : " مجھے تو انہیں دیکھ کر بہت سہارا محسوس ہو رہا ہے۔ یہ یہاں اس لیے ہیں کہ ہم شہر میں آرام کی نیند سوئیں "

" بھابی " وہ کہہ رہا تھا " آپ یقین کیجیئے مجھے تو جب کبھی خوف کا احساس ہوتا ہے تو میں ادھر آجاتا ہوں اور ان سے اور ان کی توپوں سے مجھے گویا نئی طاقت مل جاتی ہے "

میں ان کی باتوں کو سن رہا ہوں لیکن کان کسی اور آواز کے منتظر ہیں۔ میں ان کے ساتھ ہوں بھی اور نہیں بھی۔ میں توپوں کو دیکھ رہا ہوں۔ لیکن ان سے پرے بھی کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

سائرن کی آواز سن کر میں چیختا ہوں " کار کو روکو ! کار روکو ! جلدی کرو !! جلدی !! "

میری بیوی پریشانی سے مجھے دیکھتی ہے۔ کار رکتے ہی دروازہ کھول کر نیچے نشیب کی طرف بھاگتا چلا جاتا ہوں۔ ہم سب کھجور کے درختوں کے پیچھے لمبی لمبی گھاس میں دبک جاتے ہیں۔

اور پھر تین ہوائی جہاز نمودار ہوتے ہیں بالکل فلموں کی مانند خوبصورت لگ رہے ہیں۔ فلموں میں ایسے مناظر سے کیا سسپنس ہوتا ہے لیکن ٹھنڈی ہوا میں گھاس پر بیٹھے ہوئے ہم ۔ زندہ آدمیوں کی موجودگی میں سچ مچ کے ہوائی جہازوں کا آنا بالکل اور ہی طرح کی بات ہے۔ توپوں کی آوازیں آرہی

ہیں۔ ان تینوں میں سے ایک ہوائی جہاز قوس کی صورت میں غوطہ لگاتا ہے اور کہیں بم گرنے کا دھماکہ ہوتا ہے۔ میں منہ کے بل گر پڑتا ہوں اور اسی طرح گرے گرے میں نے بموں کے دھماکے اور توپوں کی آوازیں سنی ہیں۔ میرا بے اختیار چیخنے کو دل چاہتا ہے لیکن میں نے ضبط کیا ہے بس! آنکھیں میچے خاموش پڑا ہوں۔

کئی صدیوں بعد دوسرا سائرن سنتا ہوں۔ پھر میں اپنے دوست کی آواز سنتا ہوں۔ اس کی بیوی کی آواز سنتا ہوں اپنی بیوی کی آواز سنتا ہوں اور کچھ اور لوگوں کی بھی! یہ سب کیسے اٹھنے کو کہہ رہے ہیں اور یہ کیسے اٹھا رہے ہیں؟

میرے دوست نے سہارا دے کر مجھے اٹھایا۔ میں بمشکل کانپتی ٹانگوں پر کھڑا ہوا۔ ٹانگیں سو گئی تھیں اور جب اس نے ایک دم ہاتھ چھوڑا تو میں لڑکھڑا گیا۔

اور پھر میری بیوی جیسے چیخی، "یہ کیا؟"

میں اپنے ہی بنائے ہوئے تالاب میں کھڑا تھا۔

دو سیارے

ابھی تالا کھول ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی سنی، بھاگم بھاگ اندر آیا، شاپنگ کے پیکٹ صوفے
پر پٹکے اور فون اٹھایا "ہیلو"
جواب میں میرے کانوں نے جس دھاڑ کی آواز سنی وہ صرف ایک شخص کی ہو سکتی تھی اور جن گالیوں
سے وہ میرا سواگت کر رہا تھا وہ بھی صرف ایک شخص دے سکتا تھا اس کی گونجیلی آواز میرے کان کے پردے
کو مرتعش کر کے تالو میں جیسے گدگدی کر رہی تھی۔

"You swine, you filthy animal, you son of a ...."

میں نے جواب دیئے بغیر فون کان سے ہٹا کر علیحدہ رکھ دیا۔ شاپنگ کی چیزیں رکھیں، کپڑے
بدلے، یہ اینڈرسن تھا امریکی سفارتخانہ میں ملازم تھا اور ٹیکساس کا رہنے والا تھا اس کے لہجہ میں جو
"سدرن ڈرال" تھا وہ مجھ ایسے کے لیے کسی معمّہ سے کم نہ تھا مثلاً وہ اپنے مخصوص انداز میں اگر یہ کہے:

"They 's just one li'l ole thing ah gat ta show iffen ah headh so much as one lil'e ole word of that theath . . . "

....

تو اسے عام فہم انگریزی میں ترجمہ کرنا کم از کم میرے بس کا تو روگ نہیں۔ اس کے لہجہ کی طرح اس کی
ساری شخصیت کو بھی اسی "سدرن ڈرال" سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ سوا چھ فٹ کا تانبہ کی رنگت والا
اینڈرسن جو شراب پیتا نہیں بلکہ اس میں مچھلی کی مانند تیرتا تھا۔ اپنے سینہ میں سونے کا دل رکھتا تھا
اس کے علاقہ میں اس کی نرم دلی   بے تعصبی کی وجہ سے اس کے دوستوں نے جب اسے گالی دینی

ہوتی تو وہ اسے "نگر لور" کہتے تھے۔ مجھ پر وہ بے حد مہربان تھا اور اگر میں شادی شدہ ہوتا اور پاکستانی نہ ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ اظہار خلوص کے لیے وہ بیویاں بدلنے کی تجویز پیش کر دیتا۔ جب وہ شادی کے بعد سٹیٹس سے پہلی مرتبہ اپنی بیوی نینسی کو لے کر آیا تو میں مبارک باد دینے گیا۔ نینسی ساڑھے چار فٹ کی کومل سی لڑکی تھی، چھوٹی سی گڑیا ایسی ناک اور بڑی بڑی بچوں ایسی آنکھیں۔ شہد کے رنگ کے بال، نہایت صاف جلد اور رنگت۔ میں نے اس کے حسن انتخاب کو سراہتے ہوئے نینسی سے ہاتھ ملانے کی کوشش کی تو وہ چیخا جس کا سلیس انگریزی میں ترجمہ یوں ہوگا۔

"You idiot, kiss the bride don't insult her"

اس احساس سے کہ دوست کی بیوی ماں بہن ہوتی ہے، میرے چہرے پر سرخی چھا گئی۔ میری پریشانی پر دونوں نے قہقہہ لگایا جب نینسی نے آگے بڑھ کر خود میرے لبوں کو بوسہ دیا تو یہ خوشی سے چیخا

"BRAVO! BRAVO!!

کپڑے وغیرہ تبدیل کرنے کے بعد میں نے اطمینان سے فون اٹھایا تو وہ پوچھ رہا تھا

"You dozing?"

"نہیں تو"

"CAT GOT YOUR TONGUE?"

"تمہیں میرے بولنے سے کیا لینا۔ تم اپنا بولتے جاؤ۔ آدھے گھنٹے سے بک بک کئے جا رہے ہو اور میرے پلے تمہاری ایک بات بھی نہیں پڑی اب ذرا آرام سے گفتگو کرو"

بہر حال اس کی ذرا آرام کی گفتگو سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شادی کی پہلی سالگرہ ہو رہی ہے اور مجھے بھی آنا ہے یہاں تک تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن جب وہ یہ خوشخبری سناتا ہے کہ میرے لیے ایک "بلائنڈ ڈیٹ" کا بھی بندوبست کیا گیا ہے تو میرا دل بیٹھ جاتا ہے۔ اینڈرسن یوں ظاہر کرتا ہے گویا وہ مجھ پر احسان کر رہا ہے جبکہ حقیقت یہ ہو گی کہ میرے لیے نہیں بلکہ اس بلائنڈ ڈیٹ کے لیے میرا بندوبست کیا گیا ہو گا۔ میں بدک جاتا ہوں۔ اس پہ وہ پھر گالیاں شروع کر دیتا ہے،

مگر اس مرتبہ نینسی اس کے ہاتھ سے فون لے لیتی ہے پہلے وہ معذرت کرتی ہے اور پھر وہ صرف یہ کہتی ہے کہ یہ اس کی بڑی عزیزہ سہیلی ہے اور صرف اس پارٹی کے لیے وہ پیرس سے آرہی ہے۔ یہاں کسی کو نہیں جانتی So would I be an angel اب بھلا میں اینجل بننے سے کیسے انکار کر سکتا ہوں۔

یہ بڑی ڈیشنگ قسم کی لڑکی ہے جسے امریکی اصطلاح میں "ڈش" (ایپل پائی؟) سمجھا جا سکتا تھا، لیکن وہ پاکستانی "ڈش" تو ہرگز نہ تھی اور پردیس میں دیسی کھانوں کی لذت صرف پردیسی ہی جانتے ہیں۔

قد میں مجھ سے تین انچ لمبی، پتلی دبلی اور سوکھی گویا بانس نے گاگل لگا رکھی ہو۔ جدید ترین تراش کا لباس تھا جس سے یہ ثابت ہوتا کہ واقعی اس کی چھاتیاں نہیں ہیں اس کی منی اسکرٹ دیکھ کر میکسی کی افادیت واضح ہو گئی الغرض وہ ٹوگی سے بھی بڑھ کر ٹوگی تھی۔ وہ پیرس میں ملبوسات کی ایک بہت بڑی فرم میں ڈیزائنر تھی ازراہ عنایت اس نے مجھے بھی پیرس میں ویک اینڈ بسر کرنے کی دعوت دی پر میں نے ٹال دیا۔

یہ سب کچھ بھی شاید "اینجل" بننے کی خاطر برداشت ہو جاتا، لیکن اس کی باتیں مسلسل اور ناختم ہونے والی باتیں۔ ایک ہاتھ میں سگریٹ دوسرے میں مارٹینی مسلسل ہنستے ہونٹ اور میں ایک مودب شاگرد بنا اس کے سامنے خاموش۔ ہمارے پاس سے نینسی گزری تو مجھے سعادتمندی کے اس عالم میں دیکھ کر خوش ہو کر بولی Enjoying لیکن وہ میری روتی صورت پر غور کرنے یا میرا جواب سننے سے پہلے ہی دوسرے مہمانوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ امریکی عورتیں ہر آدھ گھنٹے بعد باتھ روم میں ضرور جاتی ہیں مگر یہ تین گھنٹے سے میرے ساتھ جڑ کر بیٹھی، پی رہی ہے اور بول رہی ہے اور اسے ایک مرتبہ بھی نہ اٹھنا پڑا، کمال ہے! جیسے میری سوچ نے اس پر کچھ اثر کیا وہ اٹھتے ہوئے بولی:

Excuse me

اس کے جانے پر میں نے سکھ کا ایک طویل سانس لیا، کمرے میں سگریٹوں کا دھواں عورتوں کے

میک اپ اور خوشبویات کی ملی جلی خوشبو، الکحل کی بو اور ان سب سے بڑھ کر چالیس پچاس حلقوں سے نکلے قہقہے جن میں عورتوں کی ہنسی کے نام پر چیخیں۔ سر میں شدید درد ہو رہا تھا اور آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ سامنے میز پر اس کا چھوڑا ہوا جام پڑا تھا میں آدھی مارٹینی اور اس میں پڑے زیتون کو احمقوں کی طرح دیکھ رہا تھا۔ جام کے کنارے اس کی لپ اسٹک سے سرخ ہو رہے تھے۔ شدید بوریت اب بے زاری میں تبدیل ہو رہی تھی۔

ان تمام مہمانوں میں سے میں اور کسی کو نہ جانتا تھا۔ ایسی پارٹیوں کی سب سے بڑی قباحت ہی یہی ہوتی ہے کہ میزبان کے علاوہ کوئی کسی کو نہیں جانتا اس لئے جو جس کو جانتا ہو وہ اس کے ساتھ چپکا رہتا ہے اور اسی میں بلائنڈ ڈیٹ کے خطرات مضمر ہیں اس کی چند منٹ کی عدم موجودگی سے مجھے عجب راحت کا احساس ہو رہا تھا۔ میں اطمینان سے صوفہ کی پشت پر سر ٹیک کر کمرے کو یوں لاتعلقی سے دیکھ رہا ہوں جیسے میں سینما کی کرسی پر براجمان ہوں۔

ٹیپ ریکارڈر پہ ڈانس کی دھن چل رہی ہے اور کھڑے مہمانوں سے بننے والے دائرہ کے درمیان دو تین جوڑے ناچ کے بہانہ ایک دوسرے سے لپٹے لڑکھڑا رہے ہیں۔ کچھ مہمان پی رہے ہیں تو بعض یوں ہی بلاوجہ ایک دوسرے سے چپکے کونوں میں دبکے بیٹھے ہیں دور ایک صوفے کے پیچھے سے مجھے چار ٹانگیں آپس میں الجھی نظر آتی ہیں۔ شاید میں زیادہ پی گیا ہوں یا زیادہ بور ہو گیا ہوں۔ یہ چاروں ٹانگیں آدمیوں کی ہیں میں سر جھکا کر آنکھیں مل کر دوبارہ دیکھتا ہوں پہلے سوچتا ہوں جاکر تفتیش کروں پھر سوچتا ہوں لعنت بھیجو مجھے کیا؟

پارٹی فل سوینگ پہ ہے۔ مگر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آرکسٹرا کا اونگا بونگا میرے سر کے اندر بج رہا ہے، ڈرم میرے کانوں کے پردوں پہ بج رہا ہے تو وائلن میرے تنے ہوئے اعصاب سے! میرا سارا وجود چیخ رہا ہے پانی کا ایک گلاس، پانی کا ایک گلاس، میری تمام سلطنت پانی کے ایک گلاس کے لیے! لیکن میں جانتا ہوں پانی صرف لیٹرین میں ملے گا میں اگر بیہوش ہو کر گر پڑا تو میرے منہ میں پانی کی بجائے برانڈی انڈیلی جائے گی۔

اوہ نہیں۔ میرا وجود جیسے دہشت زدہ ہو کر بیٹھتا ہے۔ میری بلائنڈ ڈیٹ باتھ روم سے نکل چکی ہے اور لائیٹر سے سگریٹ سلگا رہی ہے۔ میں ایک دم گھبرا کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔ سگریٹ سلگا کر وہ ایک طویل کش لیتی ہے اور اب صوفہ پر مجھے نہ پا کر اس کی آنکھیں مجھے تلاش کر رہی ہیں۔ میں ایک بہت موٹی عورت کی آڑ میں ہو جاتا ہوں۔ مجھے نہ دیکھ کر وہ شرابوں والی میز کی طرف مڑ جاتی ہے اور میں تیزی سے باہر کو لپکتا ہوں۔ میں صبح فون پر اینڈرسن سے گالیاں سن لوں گا نینسی کی ملامت بھی برداشت کر لوں گا۔ حتیٰ کہ پیرس میں پاکستان کی بدنامی بھی لیکن دل کو یہ سوچ کر تسلی دے لیتا ہوں۔ ہزاروں لاکھوں پاکستانی دنیا بھر میں اپنے وطن کو بدنام کر رہے ہیں تو بھری پارٹی سے بلا اجازت میرے یوں اٹھ جانے سے کیا ہو گا۔

بوکھلایا ہوا نکل رہا تھا اور ساتھ ہی مڑ کر دیکھ بھی رہا تھا کہ کہیں مجھے وہ دیکھ تو نہیں رہی کہ ٹکرا جانے کے بعد کسی سے ٹکرانے کا احساس ہوا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ ہمارا رنگ ہمارا تعارف ہے اس انگریزی شور میں اپنے منہ سے اُردو کے الفاظ نکلتے سن کر یوں لگا گویا کسی اور سے یہ سن رہا ہوں۔

"معاف کیجیے، میں بھاگنے کی جلدی میں آپ سے ٹکرا گیا"

وہ مسکراتی ہے۔ سلونی رنگت، پنک لپ اسٹک، سفید دانت "کوئی بات نہیں۔"

ہم دونوں ابھی تک کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں کچھ کہنے کی خاطر میں کہتا ہوں

"آپ بھی میری طرح چوری سے بھاگ رہی ہیں۔"

وہ ہنستی ہے "یہی سمجھ لیجیے۔"

Why here you are, and I was . . . .

کانوں میں اس کی آواز آئی تو میں نے گھبرا کر اس کا ہاتھ پکڑا اور دروازہ کی طرف بھاگا۔ دوسری چھلانگ میں ہم کمرے سے باہر تھے۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ آہستگی سے ہاتھ چھڑانے پر مجھے یہ احساس ہوا کہ میں نے ابھی تک اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

"کیا بات ہے" وہ مجھے حیرت اور قدرے خوف سے دیکھ رہی ہے۔

"معاف کیجئے، میں — دراصل اس عورت سے بھاگ رہا ہوں"۔

"عورت؟" اس کی ایک بھوں سوالیہ انداز میں اوپر کو اٹھی ہے۔

"وہ ۔ وہ جو بہت ہی لمبی ہے۔ میری بلائینڈ ڈیٹ ہے"۔

"اتنی خوفناک ہے وہ —؟"

"نہیں، ایسی بات تو نہیں۔ بس میں ہی بے زار ہو گیا تھا۔ دراصل وہ باتیں بہت کرتی ہے اور میں اس تصور سے ہی جھرجھری لیتا ہوں۔

ہم ابھی تک دروازہ پر ہی کھڑے تھے۔ اندر سے موسیقی، قہقہوں اور باتوں کا شور بھنبھناہٹ کی طرح آرہا ہے۔ میں اس سے کہتا ہوں" اپنی افراتفری میں آپ کو گھسیٹ لایا۔ آپ واپس چلی جائیں"۔

"نہیں، میں بھی گھر جانے کو سوچ رہی تھی"۔

"تو چلیے! میں آپ کو گھر پہنچا آتا ہوں"۔

"شکریہ — ! مگر اس کی ضرورت نہیں"

"دیکھئے! اگر آپ کسی کے ساتھ ہیں پھر تو اور بات ہے اور اگر اکیلے ہی جانا ہے تو آپ جانتی ہیں کہ یہ وقت تنہا پھرنے کا نہیں ہے"۔

"پتہ تو ہے مگر میں نزدیک ہی رہتی ہوں زیادہ سے زیادہ آدھ میل کا فاصلہ ہوگا۔

"تو آیئے ہم پیدل چلتے ہیں"۔

"چلیے!"

ہم دونوں خاموش آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔ کمرے کی بند فضا، سگریٹ کے دھویں، شور، قہقہوں اور الکحل کی بُو۔ ان سب کے گھٹے ہوئے دائرہ سے باہر نکل آنے پر سرد ہوا تپتے گالوں اور ماتھے کو جیسے نرم انگلیوں سے سہلا رہی تھی کسے تاروں ایسے اعصاب جیسے سکون پاتے

جا رہے تھے میں رک کر سگریٹ سلگاتا ہوں۔ لائٹر کی روشنی میں اس کے چہرے کا نمک اور موٹی موٹی آنکھیں ایک لمحہ کو جیسے چمک جاتی ہیں۔ سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر جب دھواں باہر نکلا تو گویا آدھی تھکن، کوفت اور بیزاری اسی ایک کش کے ساتھ دھواں بن کر نکل جاتی ہے۔

"توبہ، توبہ! کیا خوفناک پارٹی تھی۔"

وہ ہنستی ہے "سبھی پارٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔"

"میں تو کبھی بھی نہیں آتا۔ اینڈرسن اور نینسی نے مجبور کر دیا۔ میں نے بلائنڈ ڈیٹ کے لطیفے تو سنے تھے لیکن آج تجربہ ہوا کہ وہ کتنی خوفناک ہو سکتی ہے۔ توبہ! توبہ!!"

"آپ تو ایسے بھاگ رہے تھے۔ جیسے۔ جیسے...."

"جیسے گدھے کے سر سے سینگ" میں فقرہ مکمل کر دیتا ہوں۔

وہ ہنستی ہوئی احتجاج کرتی ہے "میں یہ نہیں کہنے والی تھی۔ میں تو یہ کہنے والی تھی جیسے استانی سے شاگرد بھاگتا ہے۔"

"نہیں! وہ بات ہی ٹھیک ہے۔ تشبیہ کے مقابلے میں بامحاورہ گفتگو مزا دیتی ہے۔ لندن میں بامحاورہ اردو تو کہیں قسمت سے نصیب ہوتی ہے۔"

"آپ لندن سے خاصے بیزار نظر آتے ہیں"

"بے زار تو نہیں، البتہ بعض اوقات گھر کی یاد بری طرح سے آتی ہے جی چاہتا ہے چپڑی روٹیاں ہوں، ساگ ہو۔ تیز مرچوں کی چاٹ ہو دھی بھلے ہوں۔ حلوہ پوری ہو۔ گرم گرم جلیبیاں ہوں...."

"بس، بس!! میرے تو منہ میں پانی بھر آیا۔"

"میں مذاق نہیں کرتا، آدھی رات تک انگریزی سننے کے بعد اب آپ کے منہ سے اردو سن کر عجب سکھ کا احساس ہو رہا ہے۔"

"سکھ کا؟"

"بالکل"

"آپ جن چیزوں کا ذکر کر رہے ہیں ان میں سے اکثر یہاں مل جاتی ہیں۔"

"مل تو جاتی ہیں لیکن بات نہیں بنتی۔ لوہاری میں جاکر نہاری کھانے کا مزا یہاں کیسے مل سکتا ہے۔ کمال کی بات ہے۔ گھر پر میں نے کبھی ان چیزوں کی خواہش نہ کی تھی۔"

وہ کہتی ہے "دراصل کھانے کی بات نہیں بلکہ چیزوں سے جذباتی تعلق کی بات ہوتی ہے۔"

میں چلتے چلتے رک جاتا ہوں اور پہلی مرتبہ اسے نئی نگاہ سے دیکھ رہا ہوں وہ محجوب سی ہو جاتی ہے "کیوں، کیا ہوا؟"

"درست بات بالکل درست کہا اور اب مجھے احساس ہو رہا ہے میری بے چینی اور بیزاری کی یہی وجہ ہو سکتی ہے۔ چیزوں سے جذباتی تعلق کی بات۔" میں اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہوں "میں یہاں پر چیزوں سے جذباتی تعلق کی تلاش میں رہا ہوں"۔ ہم دونوں خاموش چلتے جا رہے ہیں۔ اس خوابیدہ سڑک پر جہاں نیون سائنز آنکھیں جھپک رہی ہیں اور شوکیس جاگ رہے ہیں یوں ہاتھوں میں ہاتھ تھامے خاموش اپنی چاپ سننا بہت اچھا لگتا ہے۔ عجب سکون کا احساس ہو رہا ہے میرے پہلو میں خاموشی سے چلتی یہ کیا سوچ رہی ہے میرے بارے میں یا اپنے بارے میں، کیا، میری مانند یہ بھی کسی چیز سے جذباتی تعلق محسوس کر رہی ہے۔ میں خود کو اس کے بہت قریب محسوس کر رہا ہوں۔ جیسے وہ میری اپنی ہو، جیسے یہ پارٹی اسی لیے دی گئی ہو کہ ہم دونوں مل سکیں، جیسے دور دیس سے ہم دونوں محض اسی لیے لندن پہنچے تھے کہ ہم دونوں ایک سرد اور خاموش رات کو یوں ساتھ چلتے قدموں کی چاپ کو دل کی دھڑکنوں میں مدغم ہونے دیں۔ میں بے خیالی میں اس کا ہاتھ آہستہ سے دبا دیتا ہوں۔ وہ رک کر میری طرف دیکھتی ہے اس کی سیاہ چمکیلی آنکھیں ایک لمحہ کو میری آنکھوں میں ڈوب کر جیسے دل پہ لکھی تحریر پڑھنے کی کوشش کرتی ہیں پھر ان پہ پلکوں کا سایہ ہو جاتا ہے وہ زیر لب کہتی ہے "میرا گھر آ گیا ہے۔"

"گھر؟ ۔ کونسا گھر؟ گھر ۔ ہم گھر ہی تو آ رہے تھے۔"

"ہم —؟" چمکیلی آنکھوں پر پلکوں کی چلمن ہے ۔

"اوہ! معاف کیجیے، میں دراصل کچھ اور ہی سوچ رہا تھا اور یہ یاد ہی نہیں رہا کہ ......"
اور پھر اچانک مجھے ایک ضروری بات یاد آئی "میں بھی کتنا احمق ہوں ابھی تک آپ کا نام بھی نہ پوچھ سکا۔"

"آپ نے پوچھا ہی نہیں" وہ سادگی سے جواب دیتی ہے ۔

"پہلے میں اپنا نام بتاتا ہوں ...."

"مجھے معلوم ہے ۔"

"معلوم ہے کیسے ؟"

"جنگ کے دنوں میں آپ بڑی تقریریں کرتے تھے، چندہ جمع کرتے تھے ۔"

"اچھا اور آپ کا نام ؟"

"اوشا"

"میرا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے ۔

جی ہاں ۔ میرا نام اوشا ہے اور میں انڈین ایمبسی میں کام کرتی ہوں ۔"

میں آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہا ہوں تو یہ انڈین ایمبسی میں کام کرتی ہے وہ جیسے میرے خیالات بھانپ لیتی ہے ۔ قدرے زور دیکر وہ پھر کہتی ہے "جی ہاں! میں انڈین ایمبسی میں کام کرتی ہوں اور میرا نام اوشا ہے" دو سانولے ہاتھ آپس میں جڑتے ہیں" نمستے"

وہ اپنے گھر میں داخل ہو چکی ہے، مگر میں ابھی تک وہیں کھڑا ہوں، میرے کانوں میں اس کے آخری الفاظ گونج رہے ہیں اوپر تیسری منزل پر ایک کمرہ میں روشنی ہوتی ہے ۔ کیا وہ مجھے دیکھ رہی ہے ؟

جلتا ہوا سگریٹ میری انگلیوں کو جلا رہا تھا ۔

اگلے دن عجب ذہنی کشمکش کے تھے ۔ میں اسے بھلانا چاہتا لیکن نگاہیں اس کی تلاش

یں رہتیں اور وقت بے وقت کانوں میں اسکی مخصوص ہنسی گونج جاتی۔ میں دل کو بہت سمجھاتا کہ ہمارے درمیان مذہب اور ملک کی دو ایسی خلیجیں ہیں جنہیں پاٹنا ناممکن ہے اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ مشرقی پاکستان میں بہنے والے خون میں میرے بھائی اور کئی دوستوں کا خون بھی شامل تھا۔ یہ سب کچھ بھلانا میرے لیے ناممکن تھا ادھر اوشا کے تصور سے میرے ذہن میں ایک اور عورت کی تصویر ابھر جاتی جو غالباً اوشا سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی اور جس کے بالوں میں ایک سفید لٹ چمکتی تھی۔ میں جیسے جھٹک جھٹک کر اوشا کو ذہن سے بھگاتا لیکن یوں محسوس ہوتا گویا اس کی تصویر کے لیے میرا ذہن فریم بن چکا ہو۔ ایک مرتبہ میں نے اُسے ایمبسی میں فون بھی کیا۔

"ہیلو" اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ شاید میری طرح وہ بھی دل کی دھڑکن دبا رہی تھی۔ اس کی آواز سن کر میری عجب حالت ہوئی اور کچھ کہے بغیر فون بند کر دیا۔

میں اس سے فرار کی کوشش کر رہا تھا لیکن یوں محسوس ہوتا جیسے وہ میرے خون کی گردش میں شامل ہو۔ ایک دن میں نے کاغذ پر اسکی تصویر بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ اس کی صورت سے ملتا جلتا اسکیچ بنایا اور پھر اس کے داڑھی مونچھ لگا کر اسے سورن سنگھ بنانے کی کوشش کی لیکن اس حرکت سے اتنی ندامت محسوس ہوئی کہ اسکیچ پھاڑ کر پھینک دیا اور گھبرا کر گھر سے باہر نکل آیا۔

اس دن زندگی میں پہلی مرتبہ بے ہوش ہو جانے کے لیے بار میں داخل ہوا۔

(۲)

میں ٹیمز کے کنارے کھڑا ہوں اس کا گدلا پانی ساکت لگتا ہے جیسے تھک گیا ہو، پل پر ٹریفک کا شور تو ہے مگر میرے کند اعصاب تک یہ شور نہیں پہنچ سکتا۔ یہ لندن کے ان چند خوشگوار دنوں میں سے ایک ایسا دن ہے جب لندن کسی مہربان حسینہ کی طرح مسکراتا ہے چمکتی دھوپ میں نیلا آسمان دھلا دھلا لگتا ہے۔ یہ شاید آسمان کی نیلاہٹ کا اثر ہو کہ ایسے دنوں میں نیلی آنکھوں والی خود بخود مہربان ہو جاتی ہیں۔ پل کی ریلنگ پر میری طرح اور بھی بہت سے لوگ بے مقصد کھڑے بلا ضرورت ٹیمز کو یا

ساتھ والے لوگوں کو تک رہے ہیں میرے ساتھ ہی ایک لڑکی کھڑی ہے اس کے مکئی ایسے بالوں پر جیسے استری پھیر دی گئی ہو، بڑی بڑی بھوری آنکھوں میں چہرہ کی زرد رنگت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے کھلی دھوپ میں کسی فرانسیسی بیچ پر جا کر ٹین حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ چھوٹی سی بچوں ایسی ناک اور چہرے پر شربتی تلوں کا جال۔ لڑکی پل پر یوں ٹکی ہے گویا نیچے دریا میں کسی کو تلاش کر رہی ہو۔ یوں آدھا دھڑ لٹکانے سے اگر ایک طرف چہرہ پہ بال لٹک آئے ہیں تو دوسری طرف منی اسکرٹ خطرناک حد تک اونچا ہو گیا ہے اس کے ساتھ کھڑی بوڑھیا اسے دیکھ رہی ہے تو ارد گرد کھڑے مرد اٹھے ہوئے منی اسکرٹ کو جب بوڑھیا سے نہیں رہا جاتا تو وہ اس سے مخاطب ہوتی ہے۔

Are you looking for something?

وہ آنکھوں پر سے بال ہٹائے بغیر جواب دیتی ہے .YEA

What's that?

A corpse!

ہم سب بھی اس کی گفتگو سن رہے تھے۔

A what?

A corpse

You don't mean it.

I am serious

Whose

Yours

بوڑھیا چونک کر غصہ سے اسے دیکھتی ہے اور منہ ہی منہ میں "LITTLE BRAT" بڑبڑاتی ہوئی چل دیتی ہے۔ میری بے اختیار ہنسی نکل جاتی ہے۔ لڑکی کے اس مذاق سے باقی مرد بھی محظوظ ہوتے ہیں وہ میری ہنسی سنکر میری طرف منہ کر کے خوشی سے مسکراتی ہے۔ میں اسے کہتا ہوں۔

"تم نے اس بے چاری بوڑھیا کو ڈرا ہی دیا۔"

SHE HAD IT COMING"

کیسے ہو۔ کیا تم اسے جانتی ہو"

on yea! She is my mother.

میں جھجھک کر خاموش ہو جاتا ہوں۔ مگر وہ اس بارے میں ہر طرح سے لاپرواہ معلوم ہوتی ہے۔ بات اس کی ماں ہی سے چلتی ہے لیکن جلد ہی اِدھر اُدھر کے موضوعات بھی گفتگو میں شامل ہو جاتے ہیں۔ خاصی دیر کے بعد گھڑی دیکھتا ہوں۔ "اب چلنا چاہیئے" میں کہتا ہوں وہ بھی میرے ساتھ چلنا شروع کر دیتی ہے۔ میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا ہوں، وہ ہنس کر کہتی ہے۔

I have nothing to do in the world.

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ کیونکہ میں بھی بے مقصد گھوم رہا ہوں۔"

ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے باتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ تیز ہوا سے اس کے بال اڑ رہے ہیں، اس کی چھاتیاں چھوٹی چھوٹی ہیں، عین فیشن کے مطابق، منی اسکرٹ میں سے نکلی لمبی ٹانگوں پر لوکاٹ ایسے بھین بال ہیں۔ سامنے ایک چھوٹا سا کیفے نظر آتا ہے میں اسے کافی پینے کی دعوت دیتا ہوں وہ خوشی سے کہتی ہے I would love to.

ایک نوجوان ولٹیریس ہم دونوں کو مشکوک انداز سے دیکھتی ہے مسکرائے بغیر آڈر لیتی ہے اور ماتھے پر بل ڈال کر کافی کے دو مگ یوں لا پٹختی ہے کہ ان کے نہ ٹوٹنے پر تعجب ہوتا ہے۔ یہ اس کے چوڑے کولھوں کو گالی نکالتی ہے .Bitch

ولٹیریس مڑتی ہے۔ کچھ کہنے کو منہ کھولتی ہے لیکن پھر چپ چاپ مڑ جاتی ہے۔ ولٹیریس کو اس کی اوقات بتا کر یہ گویا مطمئن ہو جاتی ہے اور پلکیں جھپکا کر میری طرف داد طلب نظروں سے دیکھتی ہے۔

کافی بدمزہ ہی نہیں بلکہ تیز گرم بھی نہیں۔ Lousy coffee

یہ جل کر کہتی ہے Lousy people Lousy waiters

"بس جانے بھی دو گرمی جھاڑنے کا کیا فائدہ۔"

I know why she is sore. The bitch

"بس کرو اب گالیاں نہ دو۔ یوں بھی تمہارے خوبصورت ہونٹوں سے گالیاں اچھی بھی نہیں لگتیں۔"

وہ آنکھیں نچا کر میری طرف دیکھتی ہے اور شرارت سے ہونٹوں پر زبان پھیرتی ہے میں کہتا ہوں۔

"ہمارا ایک شاعر تھا اس نے ایسے ہی موقع کے لیے ایک شعر کہہ رکھا ہے:"

What's that

"سنو ——

لگے منہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی صاحب خبر لیجیے دہن بگڑا!"

مجھے شعر پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً شعر غلط پڑھ گیا ہوں لیکن پھر سوچتا ہوں یہ کونسی کسی اہل زبان کی دخترِ نیک اختر ہے یہ لکھنؤ کی طوائف بھی نہیں سو اس کے لیے یہ شعر صحیح ہی ہوگا میں اپنی تمام صلاحیتیں صرف کرکے اس کا ترجمہ کرتا ہوں تو وہ خوشی سے تالی بجاتی ہے اسے یوں خوشی سے تالی بجاتے دیکھ کر اچانک مجھے احساس ہوتا ہے کہ اب تک ہم دونوں کا باضابطہ تعارف بھی نہیں ہوا۔ ہمیں تو ایک دوسرے کے نام تک کا بھی علم نہیں اور ہم اکٹھے کافی پی رہے ہیں گو یا مدتوں کی جان پہچان ہو۔ سو میں کہتا ہوں۔

"کمال ہے گھنٹے بھر سے ہم ساتھ ہیں اور تم نے مجھے اپنا نام تک بھی نہ بتایا۔"

Sheron

وہ اپنا نام بتاتی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہ وہ ایک فرم میں ملازم ہے۔

"بگ باس کی خوبصورت سیکرٹری؟"

وہ ہنستی ہے۔

Hell, no just a typist from the typing pool

ہم اٹھنے لگے تو شیرون آنکھ مار کر بولی Don't tip her,

میں اس کا کہنا مانتا ہوں اور ویٹریس کو بدمزہ کر کے ہم دونوں ہنستے ہوئے باہر نکلتے ہیں۔ وہ میرے بازو میں اپنا بازو ڈال کر چل رہی ہے میں اسے اپنے بارے میں بتاتا ہوں۔

Indian

میں جل کر کہتا ہوں "کالے آدمی ہندوستان کے علاوہ اور ملکوں میں بھی پائے جاتے ہیں" وہ چلتے چلتے رک جاتی ہے اور ناک سکیڑ کر مجھے دیکھتی ہے "WHY SO TOUCHY?"

ویٹریس کے سلوک سے جو کوفت ہوئی تھی۔ وہ گویا دس گنا بڑھ کر میرے اعصاب پر چھا جاتی ہے اس کی بھوری آنکھیں ہنس رہی ہیں لیکن ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں۔ ہم دونوں کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے اور اسے دھیرے سے دبا کر کہتی ہے۔

I like black . . . . I mean, I like coloured people

اور بیشتر اس کے کہ مجھے احساس ہو میرے منہ سے (اردو سے انگریزی میں ترجمہ کئے بغیر) نکلتا ہے۔

"DON'T PATRONIZE,
WE ARE NOT IN THE COMMONWEALTH"

وہ ایک جھٹکے سے ہاتھ چھوڑ دیتی ہے "Why so bitter."

میں خاموش رہتا ہوں، شیرون کی نیت خراب نہیں، میں اپنی الجھنوں سے اسے کیسے باخبر کر سکتا ہوں شاید وہ زندگی میں پہلی مرتبہ کسی کالے کے ساتھ چل رہی ہے شاید اس کے لیے یہ بھی اچھی خاصی ایڈونچر ہو تا کہ پیر کو ساتھی ٹائپسٹ لڑکی کو ویک اینڈ کی اس "مہم" کے بارے میں بتا سکے وہ ایک دو مرتبہ میری طرف دیکھتی ہے پھر کہتی ہے "

" کوئی بات نہیں I am sorry.

میں اسے بتانا چاہتا ہوں کہ ہم لوگ اپنے گندے اور غلیظ گھروندوں میں جو خواب دیکھتے ہیں لندن، پیرس اور نیویارک میں ان کی تعبیریں برعکس نکلتی ہیں، لیکن پھر سوچتا ہوں اسے کیا پتہ۔

یہ اپنی ماں سے بیزار ہو کر میرے ساتھ چند لمحے ہنس کر گزارنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اگر میں کھل کر ہنسنے کے قابل نہیں رہا تو اسے بیزار کرنے کا کیا فائدہ؟

وہ کہتی ہے Lets make peace.

مگر ہم لڑ تو نہیں رہے"

I know, but no more silly talk

وہ بالوں کو جھٹک کر کانوں کے پیچھے کرتے ہوئے جیسے گنگناتی ہے۔

"THE SUN IS LOVELY – SUCH DAYS ARE FOR FUN"

مجھے اسکول میں آٹھویں جماعت کا رٹا ہوا سبق یاد آتا ہے۔ Make hay while the sun shines. اور ساتھ ہی مسکرا دیتا ہوں وہ میری مسکراہٹ کا پوچھتی ہے تو میں اسے بتاتا ہوں۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دیتی ہے۔

My, my, at last the big and bad wolf is
showing its big teeth but that is much better.

اچانک ہم خود کو ٹریفالگر سکوائر میں پاتے ہیں جہاں کبوتروں کی غٹرغوں غٹرغوں سے مجھے اپنے یہاں کے مزار اور درگاہیں یاد آتی ہیں۔ وہ میرا ہاتھ چھوڑ کر بچوں کی طرح کبوتروں کی طرف دوڑتی ہے وہ کبوتروں کے نرغے میں ہے، کبوتر اس کے گرد منڈلا رہے ہیں اس کے سر اور کندھوں پہ بیٹھنے کی کوششوں میں اڑ اڑ کر گر رہے ہیں وہ زور زور سے قہقہہ لگا رہی وہ چیختی ہے Its fun its fun.

اس کے قہقہے مجھ پر اثر کرتے ہیں اور اعصاب پر چھایا ہوا بوجھ جیسے آہستہ آہستہ سرکتا جا رہا ہو۔ لیکن پھر یہ مسکراہٹ جیسے میرے ہونٹوں پہ جم کر رہ جاتی ہے مجھے یہ احساس ہے کہ مسکرانے کے لیے میرے ہونٹ پھیلے ہیں لیکن یہ مسکرانا نہیں بلکہ مسکراہٹ کا منہ چڑانا ہے۔ ہاں! وہی ہے، اس میں کسی طرح کا بھی شک نہیں۔ کبوتروں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ کے عقب میں کھڑی وہ مجھے دیکھ رہی

ہے یا میرے یار اور کسی کو ؟ جیسے خود کو پتھر میں تبدیل ہوتے محسوس کر رہا ہوں میں آنکھیں سکیڑ کر دیکھتا ہوں وہی ہے اجلی دھوپ میں رنگ برنگ کبوتروں کے پس منظر میں میرا بائی کے پسندیدہ رنگ کی ساڑھی میں اس کے چہرہ کا نمک اور سیاہ بالوں کی چمک نکھری نکھری ہے ۔ ہونٹ سختی سے یوں بھینچے ہیں کہ چہرے پر ان کی ایک سیدھی لکیر بن گئی ہے کبوتروں ، بچوں ، عورتوں ، لڑکیوں ، باتوں ، قہقہوں شور ، غٹرغوں اور تیز ہوا کے پار سے ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں یا شاید ایک دوسرے کے آر پار دیکھ رہے ہیں ۔

Hey, Hey

کوئی میرے کانوں میں چیخ رہا ہے اور پھر مجھے جھنجھوڑتی ہے میں جیسے خواب سے چونکتا ہوں اور پھر میری آنکھوں کے فوکس میں شیرون آتی ہے اس نے ایک کبوتر پکڑ رکھا ہے جو اس کی چھاتی سے لگا سرخ سرخ گول آنکھیں گھما رہا ہے ۔

Are you sleeping

" نہیں تو "

you look dazed.

" واقعی ؟ "

I thought you were looking at a ghost.

" تمہاری موجودگی میں ؟ "

وہ کھلکھلا کر ہنستی ہے اور کبوتر کی چونچ گالوں سے ملتی ہے ۔ میں گردن گھما کر دیکھتا ہوں ۔ وہ جا چکی ہے میں شیرون سے پوچھتا ہوں ۔

" خوش ؟ "

وہ جواب میں ہنس کر کبوتر کو اپنے ساتھ بھینچ لیتی ہے ۔ کبوتر کو جہاں بھینچا گیا میں اسی جگہ کو دیکھ رہا ہوں میری نظریں محسوس کرتے ہوئے وہ پوچھتی ہے ۔

What are you looking at?

"دیکھ نہیں، سوچ رہا ہوں"

وہ سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھتی ہے۔ میں جواب دیتا ہوں" کاش میں کبوتر ہوتا:"

only that much.

وہ شرارت سے مسکرا کر پوچھتی ہے۔

"فی الحال اتنا ہی کافی ہوگا"

وہ نور جہاں کے انداز میں کبوتر اڑا کر کہتی ہے۔

"THE PLACE IS VACANT!"

(۳)

اوشا میں ڈوبتے کو شیرون تنکے کا سہارا تھی!

ہماری شامیں اکٹھے گزرتیں اسے لندن کے ایسے ہوٹلوں کے بارے میں خاصی واقفیت تھی جہاں کھانا اچھا اور سستا مل سکے۔ وہ بڑی دلچسپ باتیں کرتی بعض اوقات زیادہ دیر ہو جاتی تو رات میرے فلیٹ میں بسر کر لیتی۔ اس مقصد کے لیے ایک ٹوتھ پیسٹ اور سلیپنگ سوٹ مستقلاً میرے یہاں رکھ چھوڑا تھا۔

میں نہا کر غسل خانہ سے نکلا تو شیرون عجب مسکراہٹ سے بولی۔

Dame on the phone.

میں نے فون اٹھایا۔ ہیلو!

صرف سانسوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے مڑ کر شیرون کو دیکھا وہ کندھے اُچکا کر باورچی خانہ میں چلی گئی "ہیلو" میں دوبارہ کہتا ہوں۔

"جی!" اوشا کی آواز سے میرے تمام جسم میں لہریں سی دوڑنے لگتی ہیں۔ مجھے بھی اپنی کپکپاہٹ

کا احساس ہے ہم دونوں خاموش غالباً سانسوں کو، دلوں کو اور شاید خود کو قابو میں کر رہے ہیں ۔ میں بمشکل آواز نکالتا ہوں ۔

" کیسی ہیں آپ ؟"

" ٹھیک ہوں ۔"

" میرا فون نمبر کہاں سے لیا ۔"

" نینسی سے ۔"

" نینسی کیسی ہے ۔"

" ٹھیک ہے"

مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں ممتحن ہوں اور وہ زبانی امتحان میں سوالات کے درست جواب دینے کی کوشش کر رہی ہے ۔ میں اس سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں ۔ اس لیے ہونٹ بھینچے خاموش کھڑا ہوں ۔ پھر وہ اچانک سوال پوچھتی ہے ۔" یہ لڑکی کون ہے ۔"

Just a . . . . . چور دل انگریزی سے چوری چھپا رہا ہے ۔

" وہی کبوتر والی "

" کون کبوتر والی ؟"

" جس کے ساتھ گذشتہ ماہ ٹریفالگر میں تھے ۔"

" بھارتی سی آئی ڈی بڑی تیز ہے ۔"

وہ جیسے سسکی لیتی ہے اور فون بند ہو جاتا ہے ۔ میں اسی طرح خاموش فون ہاتھ میں لیے کھڑا ہوں ۔ شاید ایک لمحہ بعد یا ایک صدی بعد کہیں دور سے شیرون کی آواز آتی ہے ۔

Break fast is ready.

شیرون ناشتہ کی میز پر خاموشی سے کافی پی رہی ہے اور مجھے گھورے جا رہی ہے میں جانتا ہوں کہ وہ خوش نہیں ہیں اسے سب کچھ بتاتا ہوں وہ خاموشی سے سنتی رہتی ہے ۔ میں نے بات

تو اس کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے شروع کی تھی لیکن جلد ہی یہ احساس ہوتا ہے کہ یوں بات کرنے سے اپنے ذہن کا بوجھ ہلکا ہو رہا ہے۔ بالآخر میں خاموش ہو جاتا ہوں، وہ بھی خاموش ہے، پھر وہ اٹھ کر میرے ساتھ صوفہ پر آ بیٹھتی ہے۔ میرے بالوں کو سہلاتی ہے اور پھر آہستگی سے میرا سر اپنے بازوؤں میں لے کر سینے سے لگا لیتی ہے۔ اچانک میں خود کو روتے پاتا ہوں۔ وہ بازوؤں میں یوں ہلا رہی ہے جیسے بیمار بچے کو سلانے کے لیے لوری دے رہی ہو poor dear — poor dear

آنسو تھم چکے ہیں لیکن میں اتنا شرمندہ ہوں کہ اس سے آنکھ نہیں ملا پاتا۔ وہ خاموشی سے اٹھتی ہے میری ٹھنڈی کافی کا پیالہ سنک میں انڈیل کر تازہ کافی بنا کر پیالہ میرے آگے رکھ دیتی ہے۔ گرم کافی سے اعصاب سکون پذیر ہو جاتے ہیں۔ شیرون باورچی خانہ میں گندے برتن صاف کر رہی ہے پھر وہ خاموشی سے کمرے کی بکھری چیزیں سمیٹتی ہے، انہیں ترتیب سے رکھتی ہے۔ بستر کی سلوٹیں درست کرتی ہے۔ میں خاموشی سے اسے دیکھ رہا ہوں اور وہ کام میں یوں محو ہے گویا اسے میرے وجود کا احساس نہ ہو۔

وہ میرے پاس آ کر بیٹھ جاتی ہے "NOW, YOU KNOW YOUR MIND"

میں سر جھکائے بیٹھا ہوں، وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتی ہے۔ میں سر اٹھا کر اسے دیکھتا ہوں اس کے ہونٹوں کے کونے کپکپا رہے ہیں اور ٹھوڑی میں ہلکی سی لرزش ہے شاید وہ مسکرانے کی کوشش کر رہی ہے شاید وہ نہ رونے کی کوشش کر رہی ہو وہ اٹھ کھڑی ہوتی ہے

Darling it was fun While it lasted

وہ باہر جاتے ہوئے اس احتیاط سے دروازہ بند کرتی ہے گویا اندر اس کا بچہ سو رہا ہو۔ میں جیسے پتھر کا ہو چکا ہوں!

میں فون اٹھا کر رکھ دیتا ہوں۔ دروازے اندر سے بند کر کے پوری آواز سے ریڈیو چلا دیتا ہوں۔ شیرون کو بونس ملا تھا اسی خوشی میں رات وہ شیمپین کی بوتل لائی تھی میں اسے کھول کر سامنے رکھ لیتا ہوں۔ میں کتنی دیر یوں بند رہا کتنے سگریٹ پیئے اور کتنی شیمپین اس کا کچھ احساس نہ تھا کمرے میں دھواں اور شور یوں

مل گئے گویا شور دھویں کا ہو یا پھر دھویں سے شور نکل رہا ہو۔ اسی شور میں مجھے دروازہ پر دستک کا بھی احساس
تھا لیکن دروازہ اگر کھولنا ہوتا تو تالہ ہی کیوں لگاتا دستک بند ہو جاتی ہے لیکن کچھ دیر بعد دوبارہ شروع ہو
جاتی ہے۔ مگر آج میں نے باہر کی آوازوں کے لیے کان بند کر رکھے تھے۔ بالآخر دستک بند ہو جاتی ہے
کچھ وقفہ اور پھر میں تالہ میں چابی گھومنے کی آواز سنتا ہوں۔ دروازہ آہستہ سے کھلتا ہے دروازہ میں
جنیٹر کھڑا مشکوک نظروں سے دیکھ رہا ہے، میں بھی اسے خاموشی سے دیکھتا ہوں مگر صوفے سے اٹھنے کی
کوشش نہیں کرتا وہ مجھے خاموش دیکھ کر کہتا ہے۔

Beg pardon Sir, You were not answering the door, and here, this lady was upset, so I thought may be I should have a peep.

اسے غالباً کمرہ میں میری اور کسی بلونڈ کی برہنہ لاشیں دیکھنے کی توقع تھی اور اب مجھے زندہ سلامت
دیکھ کر وہ قدرے ناخوش تھا۔

... Are you OK Sir?

میں سر ہلاتا ہوں وہ کمرے میں یوں نگاہیں دوڑا رہا ہے کہ اگر صوفہ کے پیچھے کوئی سڈول بنڈولی ہو
تو اس کی عقابی نگاہوں سے نہ بچ سکے۔ وہ بغیر کچھ کہے مڑتا ہے اور اب دروازہ کے فریم میں اوشا کی
تصویر ہے مگر اس کی سفید ساڑھی میلی میلی سی لگتی ہے اور چہرہ کا نمک تازگی سے عاری ہے۔ وہ دروازہ
میں کھڑی ہے اور میں اسی طرح صوفہ پر ٹانگیں پھیلائے اسے ٹکر ٹکر دیکھے جا رہا ہوں۔ شاید ہم دونوں
بے جان تھے۔ کمرہ میں ہم دونوں کے درمیان سگریٹوں کا کثیف دھواں تیر رہا تھا اور ریڈیو پر جاز کی دھن
زور شور سے بج رہی تھی۔

ایک لمحہ میں سب کچھ ایسے ہی تھا۔ مگر دوسرے لمحے میں یہ سب کچھ تبدیل ہو گیا کہ ہم دونوں ایک
دوسرے کے بازوؤں میں تھے اوشا رو رہی تھی اور سسکیوں سے اس کا جسم کانپ رہا تھا۔

جب وہ سکون پذیر ہوئی تو میں اسے آہستگی سے صوفہ پر لٹا دیتا ہوں۔ ریڈیو بند کر کے کھڑکیاں

کھول کر کمرہ تازہ ہوا سے بھرتا ہوں ۔ ریسیور اٹھا کر دوبارہ ٹیلی فون پر رکھ دیتا ہوں اور پھر خاموشی سے اس کے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ جاتا ہوں اس کے آنسو ختم ہو چکے ہیں مگر وہ خاموشش نظریں جھکائے بیٹھی ہے ۔

" میری جگہ کیسے تلاشش کی ؟ "

" ایجنسی سے "

" اوہ "

میں خاموش ہو جاتا ہوں وہ بولتی ہے " میں نے دو مرتبہ فون کیا لیکن فون خاموش تھا پھر میں ادھر آئی ، دستک دیتی رہی ۔ پھر میں نے سوچا ۔ میں نے سوچا ۔ ۔ ۔ "

" شاید میں نے خودکشی کرلی ہے "

" وہ جھرجھری لے کر کہتی ہے " میں بہت پریشان ہو گئی اس لیے جینیٹر کو لائی تو اس نے ماسٹر کی سے آپ کے کمرہ کا دروازہ کھولا ۔ ۔ ۔ "

" تو مجھے زندہ پاکر دلی مسرت ہوئی "

" میرے اس جواب پر وہ پہلی مرتبہ آنکھوں میں جھانک کر پوچھتی ہے ۔

" آپ مجھ سے متنفر کیوں ہیں ؟ "

" میں بے چارہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

مگر وہ میری بات کاٹ کر کہتی ہے " آپ طنز سے کام نہ لیں "

میں خاموش ہو جاتا ہوں وہ ابھی تک مجھے دیکھے جا رہی تھی میں پوچھتا ہوں ۔

" یہ آج صبح صبح میری یاد کیسے آگئی تھی "

وہ ایک دو لمحے خاموش رہتی ہے پھر سر جھکا کر قدرے شرما کر بولی ۔

" آج میں نے پکوڑے اور چاٹ بنائی تھی "

مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا " میرے لیے ؟ "

اس کا سر اور بھی جھک جاتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اس کے پاس بیٹھ جاؤں اور ہاتھوں میں اس کا ہاتھ لے کر کوئی خوبصورت سی بات کہوں مگر زبان ساتھ نہیں دیتی۔ وہ سر اٹھا کر کہتی ہے "اس رات آپ نے بڑے شوق سے ان چیزوں کا ذکر کیا تھا اس لیے میں نے سوچا آج اتوار ہے اور ۔۔۔۔"

"مگر کیوں؟" میں کہنا تو کچھ اور چاہتا تھا لیکن شاید میرے دوسرے وجود نے یہ بے معنی سوال کر دیا تھا۔

"کیوں کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے آخر اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی" مگر میں یہ تو نہ کہنا چاہتا تھا وہ کہتی ہے۔

"یہی سمجھ لیجیئے کہ میرا جی چاہا۔"

"بس! جی چاہا" یہ میں کیا کہہ رہا ہوں، یہ کیوں کہہ رہا ہوں، مگر میں جیسے مجبور ہوں میرا دوسرا وجود دم بدم قوی ہوتا جا رہا ہے۔ وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو جاتی ہے ہوا سے بال ہل رہے ہیں ساڑھی کا پلو لہرا رہا ہے میں خاموشی سے اسے دیکھ رہا ہوں پھر وہ مڑتی ہے اور میرے پاس بیٹھ کر اچانک پوچھتی ہے۔

"کیا اس جنگ میں کوئی عزیز مارا گیا تھا۔"

"بھائی اور کئی دوست۔"

"آپ مجھ سے ایسا کوئی سوال نہ پوچھیں گے؟"

"کیوں؟"

"کیا جنگ میں میرا کوئی نہیں مارا جا سکتا" پہلی مرتبہ اسے ایک اور روشنی میں نہائے دیکھ رہا ہوں "میرا ایک ہی بھائی تھا۔ وہ چھمب میں تھا ایک گولہ ان کے مورچہ پہ آ کر گرا۔ اس کی اور اس کے ساتھیوں کی لاشوں کے ٹکڑے تک فضا میں بکھر گئے ہم اس کی لاش نہ دیکھ سکے، اس پہ بین نہ کر سکے، اس کی ارتھی جلا کر گنگا میں پھول نہ بہا سکے، ہم کچھ بھی تو نہ کر سکے اور اب اس کی موت کی یادگار اس کی موت کا تار۔ کاغذ کا ایک بے معنی ٹکڑا جسے نہ کوڑے میں پھینک سکتے ہیں نہ سنبھال کر رکھ سکتے ہیں میری ماں اس صدمہ سے نیم پاگل ہو گئی۔ دنیا میں ہم بھائی بہن ہی تھے۔ اسے کمیشن ملے زیادہ عرصہ بھی نہ ہوا تھا اس کی منگنی ہو چکی

تھی۔ سب نے کہا لڑکی منحوس تھی مگر میں سوچتی ہوں لڑکی کا کیا قصور۔ آخر یہ سب کس کا قصور تھا"

وہ اپنا کانپتا ہوا ہاتھ میرے ہاتھ پہ رکھ دیتی ہے اس کے ہاتھ میں گرمی ہے، نرمی ہے لرزش ہے مجھے اپنا ہاتھ برف کا بنا محسوس ہو رہا ہے۔ میرا دوسرا وجود مجھ پر غالب آتا جا رہا ہے میں اس سے چھٹکارے کے لیے جدوجہد کر رہا ہوں لیکن اکٹوپس کی مانند اس کے لاتعداد پھیلے بازوؤں کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا ہے وہ کہہ رہی ہے "میں تلخ نہیں، میں نے سب کو معاف کر دیا ہے۔ اجنبی چہروں سے بھرے اس اجنبی شہر میں تمہاری طرف اس لیے بڑھی کہ شاید میں تمہیں تھوڑی سی خوشی دے سکوں۔ شاید میں ہی تھوڑی سی تلافی کر سکوں۔" گو میرا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ ہی میں ہے۔ لیکن اکٹوپس نے اپنا گھیرا اور بھی تنگ کر لیا ہے مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس رہا ہے میں پھٹ جانا چاہتا ہوں لیکن کسی انجانی قوت نے میرے ہونٹوں پہ اپنے ہاتھ رکھے ہیں میں اس خوف سے بھی منہ نہیں کھولتا کہ کہیں منہ سے وہ نہ نکل جائے جو میں نہیں کہنا چاہتا۔ دل کی دھڑکن جیسے کانوں میں ہو کانوں میں عجب شور ہے اور پھر اس شور میں جیسے اس کی آواز بہت دور سے آ رہی ہو۔

"کیا ہم تم دوست نہیں بن سکتے؟"

مگر میں اب بے بس ہوں اکٹوپس کا گھیرا مکمل ہو چکا ہے اس کے بازو میرے جسم کو جکڑے جیسے خون چوس رہے ہیں، میرے دل کا دروازہ بند ہو چکا ہے، ذہن کے دریچے بند ہیں اور آنکھوں کی کھڑکیاں بند ہیں۔ میرا دوسرا وجود باہر پہرہ پر ہے اور اندر میں محبوس!

گریزپا

سیاہ سڑک کو دو حصّوں میں تقسیم کرنے والی موٹی سی سفید لکیر دھوپ میں چمک رہی تھی۔ اس لکیر کے قریب کسی شوقین امیرزادہ کا پھینکا ہوا آدھا سگریٹ نیلگوں بل کھاتے دھوئیں کی لکیر میں تبدیل ہو رہا تھا۔ وہ سڑک کے کنارے بس اسٹاپ کے قریب، فٹ پاتھ پر بیٹھا تھا۔ بس ابھی ابھی مسافروں کو سمیٹ کر گویا اسٹاپ پر جھاڑو پھیر گئی تھی اور اب فٹ پاتھ پر وہ بے زار بے زار سا بیٹھا تھا۔ دھوپ میں خاصی شدت محسوس ہو رہی تھی لیکن کچھ ایسی سستی تھی کہ ہلنے کو بھی دل نہ چاہا۔ اس کے رنگ، جانگیہ اور بنیان میں صرف کپڑے اور جلد کا فرق تھا اور دور سے وہ کول تار کی سڑک ہی کا ایک حصّہ معلوم ہوتا۔ اس نے بنیان میں ہاتھ ڈال کر پہلے پیٹ کھجایا اور پھر سینہ ملنے لگا۔ ملتے ملتے کیا لگا مَیل کی مروڑیاں اُتارنے لگا یہ اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ ایسے ہی جیسے بعض شریف آدمی تنہائی میں ناک میں اُنگلی گھماتے رہتے ہیں۔ اچانک ہی اس کی عقابی نگاہوں نے کسی شوقین امیرزادہ کا پھینکا ہوا آدھا سگریٹ نیلگوں بل کھاتے دھوئیں کی لکیر میں تبدیل ہوتے دیکھا۔ مَیل کی مروڑی ملتی انگلیاں ایک دم رُک گئیں وہ کھڑا ہو گیا پاس سے ایک راہ گیر گزرا، اس نے اس کی طرف بھی توجہ نہ کی اور دوسرے لمحہ وہ آتی جاتی بسوں، ٹیکسیوں، رکشوں اور سائیکلوں کے سیلاب میں تیرتا اس ٹکڑے پر جھپٹ پڑا۔

چیں ــــ میں ــــ ییں ــــ ں

عین اس کے جھکے سر کے قریب ہی بریکوں کی آواز سنائی دی، اس نے نگاہیں اُٹھا کر دیکھا۔ بجلی ایسی سُرخ رنگ کی کار میں سیاہ چشمہ لگائے ایک پھلجھڑی بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک موٹا سا پھولے پھولے گالوں اور لٹکتی ٹھوڑی والا آدمی تھا۔ دونوں ہی اُسے قہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے ایک لمحہ کو انگلیوں میں سلگتے سگریٹ کو دیکھا اور پھر عورت کی طرف جواب دوبارہ کار چلانے والی تھی۔

"اللہ کے نام پر!"

اس نے اپنے مخصوص انداز میں حلق سے آواز نکالی۔

"چل اوئے دفا ہو!"

مرد کا لہجہ گو جبروں ایسا تھا جبکہ عورت بریک پر سے نازک تلے کی سینڈل کا دباؤ کم کرتی ہوئی بولی "ڈرٹی سوائین"!

کار پھر سے اس کے پاس سے نکل گئی، اس نے دل میں دونوں کی ماں اور بہن سے نہایت ہی متبرک رشتہ قائم کرتے ہوئے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور احتیاط سے سڑک پار کرنے لگا یہ کوئی بڑھیا سگریٹ تھا کیونکہ دو کش لینے پر ہی اس نے اپنے اعصاب کو پُرسکون محسوس کیا۔ دھوئیں نے پھیپھڑوں کو گویا لوری سنائی۔ معدہ خوشی سے پھڑ پھڑایا اور آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے اس اَن دیکھے امیرزادہ کو دل سے دعا دی!

ویسے دعا دینا اس کا پیشہ تھا مانگنے کی طرح ــــ "دے اس کا بھی بھلا اور جو نہ دے اس کا بھی بھلا!" اس کے لئے ایک طرح سے تکیہ کلام کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ ایسے ہی جیسے بعض پڑھے لکھے اور امیر آدمیوں کے لئے ماں بہن کی گالی تکیہ کلام ہوتی ہے۔

اُس نے دو تین اور کش لینے کے بعد سگریٹ کا ٹکڑا بجھا کر کسی اچھے وقت کی عیاشی کے لئے سنبھال رکھا۔ اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ تو ذرا فاصلے پر بس اسٹاپ پر لوگوں کو جمع ہوتے دیکھا وہ پھرتی سے ان کی طرف بڑھا۔ سب سے پہلے اس نے کالج کی کچھ لڑکیوں کے سامنے جا کر آنکھیں جھکا کر اور ہونٹوں کے بائیں کونے کو ٹیڑھا کر کے حلق سے اپنی مخصوص آواز نکالی۔

"اللہ کے نام پر۔ بی بی جی!"

اس کا تجربہ یہی تھا کہ کالج کے لڑکے لڑکیاں بالعموم خیرات نہیں دیتے۔ لیکن اس کے باوجود ہر ایک سے مانگنا ضروری تھا۔ یہ بھی اس کے پیشہ کا ایک اصول تھا جو اس کی استاد ماں نے بچپن ہی سے اس کے کان میں پھونک رکھا تھا۔ ہر ایک سے مانگو اور جب تک اس کے منہ سے گالی نہ سن لو یا جیب سے خیرات نہ نکلوا لو مسلسل مانگتے جاؤ۔

چنانچہ اس نے بھی یہ جانتے ہوئے کہ ان لڑکیوں کے خوبصورت پرسوں سے کچھ نہ نکلے گا۔ فرداً فرداً سب سے مانگا۔ کچھ نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ لئے بعض نے اپنی باتوں میں رکاوٹ ڈالے بغیر ہی اسے ہاتھ کے اشارے سے برخواست کر دیا ایک نے منہ ہی منہ میں کہا۔

"معاف کرو بابا!"

اس کی ساتھی بولی، "صبح صبح ہی سر پر سوار ہو جاتے ہیں!"

اس تمام ٹولی میں سے ایک سخی داتا نکلی جس نے پانچ ٹیڈی پیسوں کا سکہ اُسے دیا۔ اس نے دل کھول کر دعائیں دیں۔

بس اسٹاپ کے کونے پر ایک جوڑا ایک دوسرے میں مست کھڑا تھا۔ اس کی چشمِ مردم شناس اُنہیں اور ان کے مقاصد کو بھانپ گئی وہ فوراً ان کی طرف لپکا اور

کچھ کہے بغیر منہ ٹیڑھا کر کے میمنے ایسی مسمسی صورت بنا کر ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر تک انہوں نے اس کی طرف توجہ ہی نہ کی اپنی باتوں میں مصروف رہے۔ دونوں کے ہاتھوں میں کاپیاں اور کتابیں تھیں اتنے میں بس بھی آگئی اور لڑکی چونک کر بولی۔

"تین نمبر؟"

نوجوان نے بھی بس میں سوار ہوتی صرف دو تین سواریوں کو دیکھا اور کہنے لگا۔

"اوہ! اس میں تو بڑا رش ہے۔ اگلی سے چلی جانا"

لڑکی نے سانولی کلائی پر چوڑی ایسے باریک فیتے سے بندھی گھڑی دیکھی اور کہنے لگی۔

"اچھا پھر میں دوسرا پیریڈ مس کر دیتی ہوں"

اب ان کی نگاہ اس پر پڑی تو نوجوان چڑ کر بولا "کیا ہے"؟

اس کی صورت پر پوری یتیمی برس رہی تھی۔

نوجوان نے اس سے جلدی پیچھا چھڑانے کو جیب میں ہاتھ ڈالا تو چونی نکلی۔ وہی اس کی طرف اچھال دی۔ اس نے خوشی سے کہا۔

"اللہ بھلا کرے جوڑی سلامت رہے" لڑکی کے چہرے پر شرم کی سرخی چھا گئی وہ مڑا ہی تھا کہ وہ بولی "ٹھہرو" اور مٹھی میں دبائے ننھے سے پرس سے روپے کا نوٹ نکال کر اسے تھما دیا۔ اس نے اسے انگلیوں میں الٹ پلٹ کر دیکھا اور کہنے لگا۔

"بی بی جی باقی پیسے نہیں"

"کوئی بات نہیں" لڑکی کی آنکھیں چمک رہی تھیں "یہ رکھ لو"

وہ اتنا متاثر ہوا کہ زبان سے دعا دینی بھی بھول گیا۔

آج کا دن تو بہت بھاگوان ثابت ہوا، ذرا سی دیر میں آدھا سگریٹ اور ایک روپیہ تیس پیسے! اس کا دل چاہا کہ اب سارا دن آرام کرے مگر جیسے قبر سے اس کی ماں نے پکار کر وہی نصیحت دہرائی جو بچپن سے وہ سنتا آرہا تھا "زیادہ خیرات لے کر

بھی مانگنے میں سستی نہ کرو کیا پتہ اگلے دنوں کچھ بھی نہ ملے۔"

"مگر کیوں ؟" اس نے پہلی مرتبہ سوال کیا تھا۔

" اس لئے کہ سخی داتا کم ہیں اور شوم زیادہ۔"

اس کی ماں پکی فقیرنی تھی اور اس لحاظ سے وہ بھی خاندانی فقیر تھا۔ وہ بعض اوقات مانگنے والوں کی ٹولی میں بیٹھ کر فخر یہ کہا کرتا "میں کوئی مہاجر فقیر نہیں ـــــ نہ ہی کاروبار یا گھر بار تباہ کر کے مانگنا سیکھا۔ ہم تو خاندانی ہیں خاندانی۔" اس نے جب سے آنکھیں کھولیں خود کو مانگتے ہی پایا۔ اسے اپنے باپ کا علم نہ تھا شاید وہ مر چکا تھا یا ہو سکتا ہے کہ وہ بن باپ ہی کا ہو۔ ویسے اس نے کبھی اس مسئلہ میں زیادہ دلچسپی بھی نہ لی۔ آنکھیں کھولنے کے بعد اس نے ڈیرے میں صرف اپنی ماں ہی کو دیکھا، اُلجھے اور خشک بال، میل لگے گال اور بدبو دار کپڑے اور اب وہ اپنی ماں کو صرف ان ہی کے حوالہ سے یاد کر سکتا تھا اس کی ماں نے گو اسے کھلانے پلانے میں کبھی کمی نہ کی لیکن مانگنے کے معاملہ میں وہ سستی برداشت نہ کر سکتی تھی۔ اسے ایک ایک ٹانگہ کے پیچھے دوڑاتی۔ سائیکل سواروں کے ساتھ ساتھ بھگاتی اور ذرا سی کوتاہی پر اس کی کھال ادھیڑ دیتی۔ اس پیشہ ورانہ تربیت کے علاوہ باقی ہر معاملہ میں وہ بہت اچھی تھی رات کو اسے اپنے ساتھ لپٹا کر سوتی بعض راتوں کو اس کی نیند کھل جاتی تو وہ اُسے غائب پاتا لیکن صبح کو وہ پھر اسی طرح موجود ہوتی۔ ایک دو مرتبہ اس نے پوچھا تو وہ بولی "میں نے کہاں جانا تھا۔ سپنا دیکھا ہوگا تو نے۔"

بچپن کے جن حادثات نے اس کے ذہن پر گہرے نقوش چھوڑے ان میں سے ایک تو اس کی ماں کی موت تھی۔ وہ دونوں حسبِ معمول سڑک کے کنارے بیٹھے تھے کہ اچانک اس کی ماں ایک چمکیلی کار کی طرف لپکی۔ عین اسی وقت ایک ٹرک نے چوک سے موڑ کاٹا اور اس کی ماں کو کچل ڈالا۔

وہ کئی راتوں تک ماں کی کچلی لاش خواب میں دیکھ کر چیخ اٹھتا چند دنوں بعد ڈیرہ دار

نے اُسے وہاں سے نکال دیا وہ بہت رویا پیٹا منت سماجت کی مگر کسی نے نہ سُنی پہلی رات وہ ایک مسجد کے دروازہ آ بیٹھا جب عشاء کے نمازی اسے کچھ دیئے بغیر چلے گئے اور مسجد خالی ہو گئی تو اس نے ان کی جوتیوں کی جگہ پڑ کر سو جانے کا سوچا اتنے میں مسجد کا موذن آ گیا۔

"او ئے"! وہ چیخ کر بولا۔

وہ ابھی تک سو نہ سکا تھا۔ ایک دم ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ "میں۔ میں"

"ایتھے کی کرنا ایں" وہ غصہ سے بولا۔

جی میں سوتا ہوں"

"سوتا ہوں" وہ کسی لگے زین کی طرح ہاتھ نچا کر بولا "اوئے تیرے پیو دا گھر وے"

وہ خاموش رہا تو وہ پھر دھاڑا "نکل ایتھوں"

وہ خاموشی سے اُٹھا تو موذن پھر بولا "جوتی چور"

(۲)

ان دنوں وہ راتیں ایک زیرِ تعمیر کوٹھی میں بسر کر رہا تھا وہ عام طور سے کھلے آسمان تلے سونے کا عادی تھا لیکن اب برسات میں رات کو نیند خراب ہوتی رہتی۔ کوٹھی میں سامان کی رکھوالی کرنے والے سے اس کی دوستی ہو گئی یوں وہ رات کو کوٹھی اس کے حوالہ کر کے اپنے گھر چلا جاتا اور یہ سیمنٹ کی بوریوں، اینٹوں، لکڑی اور لوہے کی سلاخوں سے اَٹی پڑی کوٹھی کو اپنی ملکیت سمجھتے ہوئے ساری رات خراٹوں میں گزار دیتا۔ کوٹھی پر چھت پڑ چکی تھی لینٹر ابھی نہ اُترا تھا۔ فرش بھی نہ بنا تھا۔ بس یہ ٹھاٹھ سے وہیں سوتا۔

گو ابھی بارش نہ شروع ہوئی تھی لیکن بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک نے رات کو خوفناک بنا دیا تھا اسے ابھی تک نیند نہ آئی تھی اور وہ آدھے چھتے ہوئے برآمدہ میں اینٹوں کی چوکی بنا کر اس پر بیٹھا تھا۔ نم ہوا بہت خوشگوار تھی اور تمام دن کے حبس اور گھٹن کے بعد یہ ہوا تھپکیاں دیتی محسوس ہوئی تمام دن پھرنے کے بعد وہ تھکن سے چور تھا آج بس اسٹاپ

سے ایک روپیہ تیس پیسوں کے علاوہ اور کچھ ملا بھی نہ۔

ابھی نیند نہیں آ رہی تھی اس نے جیب ٹٹولی تو سگریٹوں کے کئی ٹکڑے نکلے اس نے مسلسل دو تین ٹوٹے پیئے۔ طرح طرح کے ذائقوں والے ٹوٹوں نے اس کے اعصاب پر رنگ برنگ اثر کیا اور اس نے ماندگی کے احساس سے ٹانگیں پھیلا دیں۔

بجلی کی چمک سے جب ایک لمحہ کو آنکھیں چندھیا دینے والی نیلگوں روشنی ہوتی تو اُسے عجیب سا احساس ہوتا اور پھر ایک چمک میں اس نے اینٹوں کے پاس دو سائے دیکھے۔ کہیں مالک لوگ نہ آ گئے ہوں اُس نے پریشانی سے سوچا۔ اب جوتے کھا کر نکلنا پڑے گا۔ مگر نہیں یقیناً ایک آواز لڑکی کی بھی تھی وہ اندھیرے میں راستہ ٹٹولتے ادھر ہی آ رہے تھے اس نے ماچس جلائی اور اُونچی آواز سے بولا۔

"کون ہے؟"

"اللہ کے نام پر بابا؟" آواز بوڑھی تھی۔

"اوہ!" اس نے اطمینان سے سوچا یہ تو اپنی ہی قوم ہے...."کیوں؟" اُس نے پوچھا۔ بوڑھا کچھ بولنے کو تھا کہ لڑکی فوراً بولی۔

"بارش آنے والی ہے اگر ہم رات گزار سکیں یہاں؟"

"اچھا! اچھا!" اس نے لاپرواہی سے کہا مگر ایسے ٹھکانہ میں ان کی شرکت اسے ناگوار گزری۔ وہ ابھی تک وہیں کھڑے تھے اور اس نے انہیں آنے کو نہ کہا تھا کہ بجلی کی چمک میں لڑکی نے لشکارا مارا وہ فوراً بولا آؤ! آؤ!" وہ دونوں جھجکتے برآمدہ میں اس کے پاس آ کھڑے ہوئے۔

"بیٹھو بھئی! یہاں رات گزارنا ٹھیک تو نہیں مگر اب آ گئے ہو تو پھر ـــــ"

لڑکی نے بڈھے کو دیوار کے سہارے بٹھا کر آٹے اور روٹیوں سے بھرا ہوا تھیلا بھی اس کے ساتھ رکھ دیا۔ بڈھا اطمینان کی طویل سانس چھوڑتے ہوئے بولا۔

"اللہ بھلا کرے بابا"!

لڑکی بولی " ہم رات گزار کر چلے جائیں گے "

"کوئی بات نہیں" وہ فیاضانہ لہجہ میں بولا۔

بڈھا بولا "تم یہاں چوکیدار ہو"

بجلی کی روشنی میں اس نے لڑکی کا چہرہ جب قریب سے دیکھا تو پتہ چلا کہ پوری جوان ہے۔

لڑکی نے تھیلا اپنے آگے کر لیا اور اس میں سے طرح طرح کے چاول اور روٹیاں نکالنی شروع کیں ایک بڑے سے سلور کے کٹورے میں رنگ برنگ سالن تھے وہ دونوں کھانے لگے۔ تھوڑا سا کھا کر لڑکی بولی۔

"تم بھی کھالو خان"

وہ دل میں خوش ہوا کہ اُسے پٹھان سمجھا جا رہا ہے۔

"نہیں! نہیں!" وہ بولا" میں نے روٹی کھالی ہے"

"آجاؤ بابا" بڈھے نے بھی نوالہ چباتے وقت چپڑ چپڑ کی آوازوں کے درمیان اسے دعوت دی۔

لڑکی کہنے لگی" ہم فقیروں کا کھانا ہے یہ"

"نہیں یہ بات تو نہیں"

لڑکی نے بجلی کی چمک میں مٹھی بھر چاول اسے دیئے" لو یہ پلاؤ ہے"

اس نے خاموشی سے لے لئے اور کھانے لگا یہ ختم کر کے لڑکی نے اسے گڑ کے چاول دیئے وہ بھی اس نے کھالئے۔ اس دوران میں اِدھر اُدھر کی باتیں بھی ہوتی رہیں اور باتوں میں اسے پتہ چلا کہ بڈھا اندھا ہے اور یہ اس کی بیٹی ہے۔

کھانا کھا کر بڈھے نے لمبے لمبے دو چار زوردار ڈکار لئے اور پھر بولا" پانی مل جاتا

تو اچھا تھا۔"

پانی یہاں کہاں ہوگا۔ لڑکی نے کہا۔

"پانی"؟ وہ بولا۔" دیکھتا ہوں ——" وہ اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا گیا۔ چوکیدار کی صراحی اُٹھا لایا وہ خالی تھی پھر اسے تعمیر کے لئے لگائے گئے ہینڈ پمپ کا خیال آیا۔ چنانچہ وہاں سے صراحی بھری اور لے آیا سب نے صراحی سے منہ لگا کر پانی پیا۔ بڈھے نے ایک دو اور ڈکار لئے اور پھر وہیں لیٹ گیا۔

اس نے سگریٹ کا ایک اور ٹوٹا نکالا اور سلگا لیا اس نے خاموشی سے دو تین اور کش لئے اتنے میں اچانک شور کے ساتھ بارش شروع ہوگئی۔ بوچھاڑ دوسری طرف کی تھی اس لئے یہ وہیں بیٹھے رہ سکتے تھے۔ بڈھے کے خراٹے گونج رہے تھے انہیں خراٹوں میں ناک اور حلق سے سیٹی ایسی آواز بھی نکلتی۔

"تمہارا باپ سو گیا۔" وہ بارش کے شور کی وجہ سے بلند آواز سے بولا۔

"ہاں بے چارا سارا دن کا تھکا ہوتا ہے۔"

اتنے میں زور سے بادل گرجا تو وہ اس کے قریب سرک آئی۔

"ڈر لگتا ہے"؟ اس نے پوچھا۔

"ہوں" اب وہ دونوں پاس پاس بیٹھے تھے، کش سے جب سگریٹ چمکتا تو لڑکی کے گال پر سرخی لرز جاتی۔

"تمہارے پاس اور سگریٹ ہے؟" وہ بولی۔

تم سگریٹ بھی پیتی ہو؟"

"کبھی کبھی!"

اس نے ہاتھ والا ٹوٹا اسے تھما دیا۔ لڑکی نے دو تین کش لئے اور سر دیوار سے ٹکا دیا۔

سگریٹ کی چمک میں وہ اس کی آنکھیں ناک اور ہونٹوں کو دیکھ سکتا تھا۔ لڑکی نے آخری کش لے کر باقی سگریٹ پھینک دیا۔

اس نے پوچھا "اور لوگی؟"

"ہاں مزا آگیا۔"

اب بجلی کڑکی تو لڑکی بدک کر اس کے ساتھ آ لگی۔ اس نے کندھوں سے پکڑ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور سرگوشی میں بولا۔

"اب ڈر لگتا ہے؟"

وہ ہنسی مگر منہ سے کچھ نہ بولی اس نے دوسرے ہاتھ سے اسے اپنی طرف کھینچا وہ کھینچتی چلی گئی دونوں ایک دوسرے سے اسی طرح لپٹے بیٹھے رہے اس نے لڑکی کے گالوں سے اپنے ہونٹ لگا دیئے تو گرد کا ذائقہ محسوس ہوا اس کے جسم سے پسینہ اور گندے کپڑوں کی بُو آرہی تھی۔ اُس نے اُسے زور سے دبایا تو وہ نرم گیند کی طرح دبتی چلی گئی۔

وہ سرگوشی میں بولا "اندر آجاؤ"

"کیوں؟" وہ پھولی ہوئی سانسوں سے بولی۔

"تمہارا باپ نہ جاگ جائے"

"ہاں؟" اس کے جسم میں کپکپی تھی۔ "وہ تو مجھے یاد ہی نہ رہا"

شرابی کی طرح لڑکھڑاتی لڑکی کو سہارا دیئے وہ اسے اندر کمرے میں لے گیا۔ جہاں فرش ابھی نہ بنا تھا اور چھت کا لینٹر نہ اترا تھا۔ باہر طوفانی ہواؤں میں جھاجوں مینہ برس رہا تھا۔

(۳)

اَب وہ تینوں مل کر رہنے لگے وہ اندھے کو کسی مصروف چوک پر چھوڑ دیتے اور خود دونوں اکٹھے نکل جاتے۔ لڑکی بڑی چلبلی ثابت ہوئی آنکھوں کی مانند جسم کی بوٹی

بوٹی مٹکتی رہتی۔ وہ چلتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے کرچیوں پر چل رہی ہو یہ چال کا وہ انداز تھا جو بڑے نصیبے والی بیگمات کو چھ انچ لمبی ہیل کی جوتی پہن کر بھی نصیب نہ ہو سکتا تھا اگرچہ...... اس کے جسم میں سے پسینہ اور گلیوں کی گرد کی بو نہ چھٹی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اب اس کی آسودہ جوانی کی مہک بھی شامل ہو گئی تھی اور ان سب کے امتزاج نے اسے نشیلی بنا دیا تھا اس کی معیت میں بھیک مانگنا در بدر کی خاک چھاننا نہ رہا تھا۔ چنانچہ دونوں یوں چلتے گویا ٹورسٹ ہوں۔

ادھر زیر تعمیر کوٹھیوں کی کمی نہ تھی اور یوں وہ تینوں بڑی بڑی کوٹھیوں میں بسیرا کرتے یہ پچیس تیس لاکھ آبادی کے شہر کے ان خوش قسمت لوگوں میں سے تھے جن کیلئے کسی طرح کے رہائشی مسائل نہ تھے۔

وہ بہت خوش تھا ان تینوں کی مجموعی کمائی کافی سے زیادہ تھی اندھا ان سے کچھ طلب نہ کرتا جہاں بٹھا دیا بیٹھ گیا جو کھانے کو دے دیا کھا لیا بلکہ یوں بیٹی کے ٹھکانے لگ جانے سے وہ مطمئن تھا اگرچہ اس نے اپنے اس "داماد" کو نہ دیکھا تھا لیکن وہ آواز سے اچھا انسان لگتا تھا اور اس کے سخت ہاتھوں کو چھُونے سے اس کی مردانگی کا احساس ہوتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کبھی کبھی راتوں کو اس کی بیٹی کیوں غائب ہو جاتی ہے لیکن یہ تو ہوتا ہی ہے۔

اس مثلث کے دو زاویئے اس صورت حال سے بے حد مطمئن تھے البتہ تیسرا زاویہ یعنی برکتے عرف کلی عرف نشیلی اب بے زار بے زار سی تھی اُسے جو شہزادہ نظر آیا تھا اب وہ محض ایک فقیر بن چکا تھا جو اسے مٹھائی کھلاتا اور آنکھوں میں کتے ایسی وفاداری لئے اس کے سامنے بیٹھا گویا دم ہلاتا رہتا پھر اُسے یہ بھی احساس تھا کہ وہ زیادہ کما کر لاتی ہے اگرچہ مردوں کی گرم نگاہیں اس کے چہرے کو جھلساتی رہتیں اور بعض منچلے پیسے دیتے وقت ہاتھوں کو دبا دیتے یا کہنی کو سہلا دیتے تھے اسے یہ سب بہت اچھا

لگتا تھا۔ شروع شروع میں زیرِ تعمیر کوٹھیوں کے لینٹروں تلے سونے میں مہم جوئی کا جو احساس تھا وہ بھی اب ختم ہو چکا تھا الغرض! اس پر ان دنوں عجیب بے زاری مسلط تھی۔

اور پھر ایک دن اسے ایک اور شہزادہ مل گیا اگرچہ پہلے شہزادہ کی مانند یہ بھی فقیر ہی تھا۔ لیکن یہ زیادہ مضبوط اور خوبصورت تھا۔ دونوں ایک ہی اڈے پر کھڑے تھے۔ اس لئے باتوں کا سلسلہ چل نکلا اس نے اسے بتایا کہ وہ ریلوے پُل کے نیچے اپنی جھگی میں رہتا ہے۔

"اور اوپر سے گاڑیاں گزرتی ہیں؟" اس نے آنکھیں جھپکا کر پوچھا۔

"ہاں"، وہ کسی بچے ایسی خوشی سے بولا "اوپر سے گاڑیاں گزرنے کا بڑا مزہ آتا ہے۔ دھڑ دھڑ سارا پل ہلتا محسوس ہوتا ہے اور اس کے نیچے جھگی بھی ہلتی لگتی ہے۔"

"جھگی بھی ہلتی لگتی ہے" اس نے ان الفاظ کو یوں زیرِ لب دہرایا گویا ان کا ذائقہ محسوس کر رہی ہو اور پھر پیشتر اس کے کہ اسے احساس ہوتا اس کے منہ سے نکلا۔

"میں بھی دیکھوں گی۔"

"کیا؟" حیرت سے بولا۔

"ہلتے پل کے نیچے ہلتی جھگی۔"

اس رات وہ مارے خوشی کے سو نہ سکی تمام رات ریل گاڑیوں کے بھاری بوجھ کے نیچے پل ہلتا رہا اور اس پل کے نیچے جھگی۔ وہ بچوں ایسی خوشی سے گزرتی ہوئی ریل گاڑیوں کو گنتی رہی حتیٰ کہ پینتیس کے بعد جب اُسے نیند آنے لگی تو وہ دوبارہ جاگ گیا۔ عجیب رات تھی اور وہ بار بار یہی سوچتی رہی کہ وہ پل ہے یا جھگی۔

صبح سویرے جب وہ نئے شہزادہ کے ساتھ اڈے پر پہنچی تو باپ اور وہ دونوں کھڑے تھے اس نے اُنہیں دیکھ کر بھاگنا چاہا مگر ایک ہی جست میں وہ اس کے سر پر تھا اس نے چٹیا پکڑ لی، اور چیخ کر بولا۔

"کہاں تھی تو حرام زادی؟"

اور پیشتر اس کے کہ وہ کچھ جواب دیتی ایک کرارے تھپڑ نے آنکھوں میں تارے گھما دیئے۔ جھگی کا شہزادہ اس کی طرف بڑھا مگر ایک ہی گھونسہ کھا کر ٹوٹے دانت کے خون سے ایسا خوفزدہ ہوا کہ پھر اس نے پلٹ کر نہ دیکھا باپ اسے گالیاں دے رہا تھا اور لوگوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی مگر کوئی اس کا ہاتھ روکنے والا تھا۔

(۴)

وہ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں اور پھر وہ ہزاروں مرتبہ دُھرایا گیا سوال کرتا تھا۔

"تم نے مجھے معاف کر دیا ہے نا؟"

وہ اس کی دیکھتی ہے مگر خاموش رہتی ہے۔

"اس دن نہ جانے مجھے کیا ہو گیا۔ بس پاگل ہو گیا تھا میں" اس نے خاموشی سے اس کے جسم کو دیکھا۔ "میں دراصل یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ تم مجھے چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ چلی جاؤ۔"

وہ سر جھکائے بیٹھی رہتی ہے وہ اس کے پاؤں پکڑ لیتا ہے۔ "مگر میری یہ نیت نہ تھی۔ میں تمہارے پاؤں توڑنا نہ چاہتا تھا میں تمہیں ڈرا رہا تھا۔"

"غلطی میری بھی تھی۔ مجھے تمہیں گندی گندی گالیاں نہ دینی چاہیے تھیں۔"

"پھر بھی ——— پھر بھی ——— یہ سب نہ ہونا چاہیئے تھا" وہ دوبارہ اس کے پاؤں پکڑ لیتا ہے۔ وہ پاؤں جو علاج کے بغیر زخمی تھے وہ پنڈلیاں جن کے زخموں میں پیپ پڑ رہی تھی اور وہ رانیں جو سوچ رہی تھیں۔

چوک کے ایک کونے میں وہ چھوٹی سی ریڑھی میں ٹانگیں سُکیڑ کر بیٹھی ہے، لوگ اس کی جوانی دیکھتے ہیں پھر اس کی زخمی ٹانگیں اور اُن پر بھنبھناتی مکھیاں تو رحم اور

کراہت کے ملے جُلے احساس سے ان کی جیبیں خود بخود پیسے اُگل دیتی ہیں۔ اب اس کے باپ کو بھی اس کے پاس ٹھہرنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی اس کے مالک کو ۔ کیونکہ اُسے بھی اور انہیں بھی علم ہے کہ وہ اب بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتی !

سفر سے واپسی

کوٹھی کا دروازہ لوہے کا ہے اور اس پر بہت نفیس جالی کا کام کیا گیا ہے۔ لوہے ہی کی ایک پھولدار بیل دونوں دروازوں میں پھیلتی چلی گئی ہے اس بیل کے بڑے بڑے پتے اور چوڑے چوڑے پھول زمانۂ قبل تاریخ کے لگتے ہیں۔ ایک دروازے پر آدھا آدھا پان ہے یوں دروازہ بند ہونے پر یہ پان مکمل ہو جاتا ہے اس پان کے درمیان ایک بڑی کنڈی لگی ہے۔ دروازے کے پٹ جن ستونوں میں پیوست ہیں ان کی چوٹی پر شیشے کا ایک مربع خانہ ہے جو روشنی کے مینار کی طرح رات بھر روشن رہتا ہے۔ ایک طرف "IN" لکھا ہے تو دوسری طرف نام ـــ شیخ غلام علی۔

دروازے کا رنگ اسی گارڈینیا جیسا ہے جس نے اس چار کنال کی کوٹھی کو اپنے بازوؤں میں لے رکھا ہے۔ سامنے کم از کم دو کنال کا لان ہے۔ درمیان میں۔ دل کی شکل کا ایک چھوٹا سا حوض، حوض میں رنگین مچھلیاں، حوض کے وسط میں کنول کا ادھ کھلا پھول جس کے مرکز سے نکل کر چاروں طرف پھیلتی پانی کی دھاریں ـــ حوض اور کنول کا پھول ٹرانسپیرنٹ ماربل سے بنے ہیں۔ کنول کے اندر جلنے والے رنگین موتی اور نگینے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے حوض میں گم ہو رہے ہیں۔ لان کی روش پر دو رویہ سرو گویا بغلوں میں ہاتھ دیئے بچوں کی طرح خاموش کسی سوچ میں ڈوبے تھے۔ لان کے ایک کونے میں بیچ امبریلا کسی بڑے پھول کی طرح تھی۔

کوٹھی کی خوبصورتی کا کیا کہنا۔ خوبصورت رنگوں کے فنکارانہ امتزاج سے یہ کوٹھی کسی فلمی سیٹ ایسی خوبصورت لگتی تھی۔ برآمدوں کے ستون ہلکے سبز رنگ کے ٹرانسپیرنٹ ماربل کے تھے۔ فرش پر چپس میں پھولدار ڈیزائن بنایا گیا تھا۔ دروازہ کھلنے پر ڈرائنگ روم میں دبیز قالین سے لے کر ریکارڈ پلیئر، ٹیپ، ریڈیو گرام سبھی کچھ موجود تھا۔ سنہرے صوفے جھالر کے پردے، امپورٹڈ ڈیکوریشن پیسز، ائیرکنڈیشنر، کسی چیز کی کمی نہ تھی ڈرائنگ روم

یں فارمیکا ٹاپ کی ڈائننگ ٹیبل پر ایک خوبصورت باؤل میں پھل رکھے تھے۔ بارہ کیوبک فیٹ کا فرج کھانوں، پھلوں
انڈوں، ڈبل روٹی، چیز، جام اور بیئر کی بوتلوں سے اٹا پڑا تھا۔ الماری انگلش اور جاپانی کراکری کے بوجھ سے
گویا ٹوٹنے کو تھی۔

بیڈ روم کے کھلے دروازے سے اندر جھانکنے پر بیک وقت دو چیزوں کا احساس ہوتا ہے۔ کمرہ کی
موت ایسی خاموشی اور کھلی کھڑکی سے آتی ویسٹرن آرکسٹرا کی تیز جھنکار۔ کمرہ میں موت کی خاموشی اس لیے ہے کہ ڈبل بیڈ
پر شیخ غلام علی کی نعش پڑی ہے اور کھلی کھڑکی سے مغربی موسیقی کا شیخ صاحب کو بھی جگا دینے والا شور اس لیے آرہا
ہے کہ آج بے بی کی برتھ ڈے پارٹی بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ برتھ نائٹ پارٹی ہے۔

فضلو کمرہ میں شیخ صاحب کے ڈبل بیڈ کے قریب ایک پٹی پر ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھا تھا۔ کمرہ میں ابھی
تک رخصت ہو جانے والی لڑکی کے سینٹ کی خوشبو موسیقی کی جھنکار میں گھل مل رہی ہے۔ فضلو سر جھکائے ساکت
بیٹھا رہا۔ پھر اُسے یوں محسوس ہوا گویا اسے کوئی آواز دے رہا ہے۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا مگر یہ تو اس کا
وہم تھا۔ شیخ صاحب کی نعش چادر سے ڈھکی اسی طرح پڑی تھی، البتہ چادر جیسے موسیقی کے شور سے ہل رہی ہو خشک
آنکھوں اور چکرائے ہوئے دماغ کے ساتھ وہ کچھ دیر تک ڈبل بیڈ کو گھورتا رہا۔ پھر سر جھٹک کر کمرہ سے باہر نکل آیا۔
ڈرائنگ روم آکر فون اٹھا کر نمبر ڈائل کیے۔ اسے ہمیشہ فون سے گھن آتی رہی تھی۔ یہ کالی چیز ہاتھ میں پکڑنا اسے
کبھی بھی اچھا نہ لگا تھا۔ اب تو یہ فون اور بھی مکروہ لگ رہا تھا۔ اسے شیخ صاحب کے چند خاص دوستوں
کے نمبر یاد تھے۔ سو وہ ایک ایک کر کے انہیں فون کر چکا تھا۔ اب شیخ صاحب کے دوست بھی، تو شیخ
صاحب ایسے ہی تھے۔ بعض گھر پر نہ ملے۔ آدھی رات کو یوں نیند سے اٹھائے جانے پر ایک کی بیوی
نے جھلا کر کہا۔

" کون شیخ صاحب "

" جی۔ وہ شیخ غلام علی ٹھیکیدار۔"

" مر گیا؟ "

" جی "

" بہت خوشی ہوئی ۔ کم بخت کی وجہ سے وہ بھی دیر سے گھر آتے تھے "

جو ایک دو ملے سب نے بڑے خضوع و خشوع سے إنا اللہ پڑھ کر جنازے میں شرکت کا وعدہ کر لیا ۔

وہ ہر مرتبہ ایک فون کرتا اور عجیب و غریب لہجوں میں اس وقت آنے سے انکار سن کر واپس نعش کے پاس جا

بیٹھتا ۔ گویا شیخ صاحب سے ان کے دوستوں کی شکایت کر رہا ہو ۔

" فضلو! آخر تمہیں میرے دوست اچھے کیوں نہیں لگتے "

" شیخ صاحب! یہ سب مطلبی سے لگتے ہیں "

وہ ہنس دیئے " مطلبی سے نہیں ۔ بلکہ مطلبی ہیں "

" پھر بھی آپ ...."

" میں ایک ٹھیکیدار ہوں ۔ کاروباری انسان ہوں ۔ چیزوں کے ساتھ ساتھ لوگوں کو بھی خریدنا اور بیچنا

پڑتا ہے ۔ یہ سب بڑے بڑے افسر ہیں ۔ اونچے گھرانوں کے ہیں ۔ ڈگریوں والے ہیں ۔ میں ان کے سامنے

کچھ بھی نہیں "

" پھر یہ کیوں پیچھے پیچھے پھرتے ہیں "

" اس لیے کہ ترپ کا پتہ میرے ہاتھ میں ہے "

" کیا مطلب؟"

" دولت ، پیسہ ـــــ اور کیا؟ ۔ میں ان پر خرچ کرتا ہوں ۔ انہیں رشوت دیتا ہوں ۔ یہ میرے

بگڑے کام بناتے ہیں ۔ یوں سمجھو یہ کھیت ہیں جن میں میں پیسے کی فصل بوتا ہوں اور پھر پیسے کی فصل

کاٹتا ہوں "

" دوستی تو نہ ہوئی "

" گدھے ہو تم ۔ دوستی کا ہے کی ، پیسہ ہم دونوں کا مشترک دوست ہے ۔ باقی رہی دوستی تو اس کے

لیے تم جو گھر میں ہو ۔ مجھے سی ایس ۔ پی افسروں سے دوستی کر کے کیا لینا "

اور اب ان سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ جس ہاتھ میں ترپ کا پتہ تھا ، وہ اب ٹھنڈا ہو چکا ہے ۔

اور بغیر کھاد کے کھیت سونا نہیں اگلتے۔

فون پر نیند میں ڈوبی آواز کو فضلو نے شیخ صاحب کی موت کی خبر سنائی تو اس کے کانوں میں جھلاتی ہوئی آواز آئی۔

"اور میرے پیسے؟"

"جی؟"

"کچھ نہیں۔ یہ تو بتاؤ کیسے انتقال ہوا؟"

اور فضلو نے ساری تفصیل بتائی"میں کوٹھی میں اکیلا ہوں۔ اگر۔ اگر آپ۔ آپ اس وقت آجائیں۔۔۔"

"میں؟ نہ بھئی، مجھے لاشوں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ کل جنازہ کے وقت پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ ویسے مجھے کل ایک بہت ضروری کام ہے۔ ہوسکتا ہے لاہور سے باہر جانا پڑے۔"

"جی اچھا جی۔" فضلو نے یوں ٹیلی فون بند کیا گویا ضروری کام کے لیے لاہور سے باہر جانا بالکل فطری امر ہے۔

فون رکھ کر واپس بیڈ روم میں آگیا۔ گھر کی خاموشی سے سخت وحشت ہو رہی تھی۔ پڑوسی کی کوٹھی سے آنے والے شور کے بند ہو جانے کی وجہ سے اس کی وحشت میں اور بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ کسی طرح سے اپنی کوٹھی کو شور سے بھرلے۔ باتوں کا شور، قہقہوں کا شور، لوہاری کی گلی کے بچوں کا شور۔ دروازہ میں کھڑی ہوئی عورتوں کا شور۔ خاموشی جیسے کمرہ میں منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ اس نے کھڑکی سے بار پڑوس والی کوٹھی کو دیکھا جو اب اندھیرے میں ڈوبی تھی۔ اسے ساتھ والی کوٹھی کے لوگ کبھی بھی اچھے نہ لگے بلکہ اسے کوٹھیوں والے سرے سے ہی ناپسند تھے۔

شیخ صاحب ہنس کر بولے" فضلو! تو زمانے سے پیچھے رہ گیا ہے۔ اب زندگی وہ لوہاری کی گندی والی گلی نہیں جسے تو پیچھے چھوڑ آیا ہے۔"

"آپ چھوڑ آئے ہیں۔ میں تو اب بھی رحمت سے، جمال سے، سلام سے سب سے ملنے جاتا ہوں۔"

"تجھے گلبرگ راس نہیں آیا۔"

"یہاں کیا رکھا ہے بھلا۔ بڑی بڑی کوٹھیاں جن میں چھوٹے چھوٹے لوگ لوہاری ایسی گندی گلیوں سے اٹھ کر آئے اور اب بڑا بننے کی کوشش میں ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ سب پودنے ہیں جو محلوں اور قلعوں میں رہنے کو آگئے ہیں۔"

شیخ صاحب کچھ لمحے اسے غور سے دیکھتے رہے لیکن جب یہ اندازہ ہوگیا کہ وہ صرف ان ہی پر چوٹ نہیں کر رہا تو ہنس کر بولے:

"فضلو! تجھے زندگی کا اندازہ نہیں ہے۔" انہوں نے دونوں بازو پھیلا کر سارے گلبرگ کو جیسے اپنے بازوؤں میں لے لیا ہو۔ "فضلو! زندگی یہی ہے۔ یہ کوٹھی، یہ مرسڈیز، یہ فرج، یہ ....."

"نہیں شیخ صاحب۔" فضلو سر ہلا کر بولا "میں گاؤں سے آیا ہوں اور مجھے کھلی فضا اچھی لگتی ہے۔"

"یہ چار کنال کی کوٹھی تیرے چوکڑیاں بھرنے کے لیے تھوڑی ہے کیا؟"

"نہیں! میرا یہ مطلب نہیں۔"

"تو پھر؟"

"میں جب گاؤں سے آیا تھا تو مجھے لوہاری کی تنگ گلیوں میں کبھی تنگی کا احساس نہ ہوا تھا۔ گلی میں اوپر گردن اٹھا کر دیکھتا تو مکان ایک دوسرے پر یوں جھکے نظر آتے گویا دوستی کا اظہار کر رہے ہوں ہر گھر والا ایک دوسرے سے اتنا قریب تھا کہ اپنا سمجھ کر پرنالوں کے گندے پانی سے کپڑے بھی گندے کر دیتے ہم لوگ ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے بھی تھے، جھگڑتے بھی تھے، ایک دوسرے کی برائیاں بھی کرتے تھے لیکن اس کے باوجود یوں محسوس ہوتا جیسے ہم سب ایک بہت بڑی برادری والے ہیں۔ جیسے ایک رشتہ میں بندھے ہیں۔ لیکن یہاں وہ بات نہیں۔ کسی کی بھی کوٹھی میں چلے جاؤ یوں لگتا ہے جیسے ایک بہت بڑی سجی ہوئی دوکان میں آگئے ہیں۔ بیچنے والے ہنس ہنس کر سودا بیچ رہے ہیں اور خریدنے والے ہنس ہنس کر سودا خرید رہے ہیں۔"

شیخ صاحب کا قہقہہ گونجا "فضلو تو بڑا مردود ہے۔"

"کیوں شیخ جی۔"

"بھلا ہم بے بی کی کوٹھی پہ کیا خریدنے جاتے ہیں۔"

فضلو ہنس کر بولا "ہم کیوں جاتے ہیں۔ پھیری والے خود ہی آ جاتے ہیں" —— اور دونوں ہنسنے لگے۔

فضلو اور شیخ صاحب کی عمروں میں زیادہ فرق نہ تھا۔ اس پہ عمر بھر کا ساتھ۔ سو فضلو راز دار دوست بن چکا تھا۔ شیخ صاحب اس کے ساتھ ہر طرح کی اچھی بُری بات کر لیتے تھے۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو فضلو شیخ صاحب کا ماضی تھا۔ لوہاری کی ایک تنگ اور بدبودار گلی کی دو اندھیری کوٹھڑیوں والے گندے اور میلے مکان سے لے کر گلبرگ کی چار کنال کی کوٹھی تک کے سفر کا ہمدم اور رفیق! یہ دوسری بات ہے کہ اس سفر میں گامو شیخ غلام علی بن گیا۔ مگر فضلو شیخ فضل دین نہ بن سکا۔

گامو کا باپ ماجا گھروں میں سفیدی کرتا تھا۔ وہ سیدھا سادا اور حسبِ دستور غریب مسلمان تھا۔ پانچ وقت کا نمازی، اب یہ دوسری بات ہے کہ سفیدی کے دوران میں ظہر کی نماز ذرا ضرورت سے زیادہ ہی لمبی ہو جاتی۔ وہ وقت ہی ایسا ہوتا ہے کہ رکعتیں زیادہ پانی ملی سفیدی کی طرح پھیل جاتی ہیں۔ فضلو خالہ کا بیٹا تھا باپ مرا تو بیوہ ماں نے اسے شہران کے گھر بھیج دیا جہاں ماجے نے ایک سہانی صبح دونوں کے ہاتھ میں سفیدی کی کوچی تھما دی۔ گامے نے سفیدی سے بھر کر پہلی کوچی یوں اٹھائی کہ چہرہ سفیدی سے بھر گیا تو آنکھیں مرچوں سے۔ گو وہ باپ کے ساتھ لگا کام کرتا رہا۔ لیکن سفیدی سے اس کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ جب اپنی کوٹھیاں بنانے کا سلسلہ شروع کیا تو کسی میں سفیدی نہ کرائی بلکہ سب میں ڈسٹمپر کرایا۔

گامو کو باپ کے کام سے نفرت ہی تھی کہ باپ کے مرتے ہی اس نے یہ تمام کام چھوڑ کر سفیدی اور رنگ وغیرہ بیچنے کی ایک چھوٹی سی دکان کھول لی۔ دکان کوئی خاص نہ چلی لیکن سفیدی کرنے سے سفیدی بیچنے میں اسے زیادہ فائدہ نظر آ رہا تھا۔

فسادات اور پھر تقسیم ملک کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی میں بھی بہار آئی۔ گامے نے فضلو کی مدد سے سب سے پہلے تو نسبت روڈ کے ایک اچھے سے مکان پر قبضہ کیا اور پھر اردگرد کے مکانات کا صفایا، رشوت دے کر مال پہ ایک بہت بڑی دکان الاٹ کرائی اور ڈھائی سو روپے

دے کر ۱۰ × ۱۵ افٹ کے بورڈ پر شوخ رنگوں میں انگریزی کے بڑے اور اُردو کے چھوٹے الفاظ میں اپنا اور دوکان کا نام لکھوایا۔

شیخ صاحب بھی ان بہت سے پاکستانیوں ایسے تھے جنہیں زندگی میں پہلی مرتبہ دولت کو رشوت، شراب اور عورت کی صورت میں خرچ کر کے، مزید دولت کمانے کی طاقت اور اس طاقت کی لذت کا نشہ ہو چکا تھا۔ وہ یوں محسوس کرتے گویا یہ مملکتِ خداداد ایک وسیع مرغزار ہے جس میں انہیں ایک آزاد ہرن کی مانند چھوڑ دیا گیا ہے جس جھاڑی پر چاہے منہ مارے، جس کنج میں چاہے آرام کرے، جس درخت سے چاہے سینگ بھڑا دے۔ وہ دل کھول کر لوگوں پر خرچ کرتا اور دل کھول کر وصول کرتا۔ کسی امیر کی بیٹی کی شادی میں زیورات کا سیٹ تحفہ میں دیا تو شاپنگ کرا کر کسی ایکس ای این کی بیوی کو کار دلادی۔ کسی کے پاس فلیش میں دو چار ہزار روپے ہارا تو کسی کیلئے کمرہ، عورت اور شراب کا بندوبست کیا۔ کسی کے بیٹے کو کالج میں داخلہ دلوا رہا ہے تو کسی کے سلسلے کی ضمانت کروا رہا ہے۔ اس محنت کا پھل یہ ملا کہ چند سال کے اندر اندر اس کی فرم کو بڑے بڑے سرکاری ٹھیکے ملنے لگے۔ چھوٹے موٹے نہیں لاکھوں کے ٹھیکے، اب اگر پہلی بارش میں چھت کا لینٹر ٹوٹ جائے تو اس میں شیخ صاحب کا کیا قصور، یا سیلاب کے ایک ہی ریلے میں پل بہہ جائے تو شیخ صاحب کیا کریں۔ آج کل سیمنٹ ہی ریت ملا ملتا ہے۔

سمن آباد سکیم شروع ہوئی تو شیخ صاحب نے مختلف ذریعوں سے کئی پلاٹ لے کر ان میں کوٹھیاں کھڑی کر دیں۔ ایک میں خود آباد ہوئے اور باقی کرایہ پر اٹھادیں۔ سمن آباد سے گلبرگ کی کوٹھی تو محض ایک اور قدم اٹھانے والی بات تھی۔ اس کوٹھی پر جو اچھلے وقتوں میں لاکھ ڈیڑھ لاکھ میں پڑی تھی۔ شیخ صاحب کو ناز تھا یہ کوٹھی تمام عمر کی بھاگ دوڑ، محنت، ترقی اور کاروباری صلاحیتوں کی آئینہ دار اور اس پاکستان کی علامت تھی جس نے فسادات میں جنم لیا اور جہاں خوشحالی کی پہلی لہر لوٹ مار سے آئی تھی۔

شیخ صاحب خود تعلیم سے محروم تھے اور اب ان کی فرم میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ملازمین تھے۔ اپنی تعلیم کی کمی کو شیخ صاحب نے اولاد کی تعلیم سے پورا کرنے کی کوشش کی، چنانچہ دونوں بیٹوں اور بیٹی

کو انگریزی سکولوں میں داخلہ دلوایا۔ گھر میں کیونکہ انگریزی بولنے کا ماحول نہ تھا اس لیے انہیں ہوسٹلوں میں رکھا تاکہ یورپین مشنریوں کے ساتھ رہ کر وہ انگریزی کو انگریزی کے لہجہ میں بول سکیں، لیکن بیٹے نکلے دونوں نالائق انگریزی تو وہ یقیناً فرفر بولتے تھے لیکن شیخ صاحب جیسی عقل اور سوجھ بوجھ نام کو نہ تھی۔ بڑے کو تو جونیئر کیمبرج ہی کے دوران کسی مس کو چھیڑنے کے سلسلہ میں ایکسپل کر دیا گیا تھا۔ اب اس نے موٹر سائیکل لے رکھی تھی، سر پر سرخ رنگ کی کرشن ہیلمٹ رکھے اور بڑی بڑی گاگل لگائے ہوم اکنامکس کالج کے سامنے کھڑا رہتا۔ لڑکیوں پر آوازے کستا اور سڑک پر چلتی لڑکیوں کو موٹر سائیکل سے ڈراتا۔ اسی دھن میں تھا کہ ایک بڑا خوفناک ایکسیڈنٹ ہوگیا اور اگر بروقت اسے یو سی ایچ میں داخلہ نہ مل جاتا تو وہ ختم تھا۔ اس کے علاج پر لوئے ۵ ہزار روپے اٹھے تھے۔

چھوٹا بھی ایکسپل ہو جاتا تو بہتر تھا۔ کیونکہ ہر مضمون میں ٹیوشن کے باوجود بھی اسے کچھ نہ آتا تھا۔ اس نے تنگ آکر خود ہی پڑھنا چھوڑ دیا۔ شیخ صاحب نے دونوں کو اپنے ساتھ کام پر لگانا چاہا لیکن دونوں نااہل اور کام چور ہونے کے ساتھ ساتھ بدتمیز اور مغرور بھی تھے۔ سو سب ملازم ان سے نالاں تھے اور یہ ان سب سے تنگ۔ چھوٹے نے ایک دن جُوا کھیلنے پر کسی کے چاقو مار دیا۔ وہ تو شکر ہے کہ وہ مرا نہ، ورنہ ۳۰۲ کا کیس بن جاتا۔ بہرحال شیخ صاحب نے ہزاروں روپے رشوت کے چڑھا کر صرف تین سال کی سزا دلوائی۔ بڑا کسی اینگلو انڈین لڑکی کے چکر میں ایسا پڑا کہ اس کے ساتھ خفیہ شادی کر کے اسے کراچی لے گیا۔

لڑکی ان سب سے بڑھ کر نکلی۔ سارے گھر میں بیڈنگ ٹاول میں لپٹی گھومتی رہتی۔ کسی لوفر کے ساتھ پھنس گئی اور بہت کچھ دے دلا کر اس کا حمل ضائع کرا دیا گیا۔ آخر ایک بہت امیر لیکن کاٹھ کے الّو کے ساتھ اس کی شادی ہوگئی، تو شیخ صاحب نے سکھ کا سانس لیا۔

کچھ عرصہ بعد اس کا خاوند اسے امریکہ لے گیا۔ جہاں سے کبھی کبھی اس کا کوئی انگریزی میں لکھا پکچر پوسٹ کارڈ آجاتا ہے۔

اس دوران میں شیخ صاحب کی بیوی کا ذکر نہیں آیا تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اس جاہل عورت کو تو شیخ صاحب نے بہت پہلے چھوڑ دیا تھا۔ ویسے بھی وہ اب مر چکی ہے،

" اکیلی کوٹھی کیسی بُری لگتی ہے۔"

" کیوں ؟"

" اتنی بڑی کوٹھی اور اس میں کوئی بھی نہ رہے۔ شیخ صاحب یہ بد قسمتی نہیں تو اور کیا ہے۔"

" ہاں! فضلو انسان محنت کرتا ہے، بال بچے کے لیے۔ خدا نے سب کچھ دیا لیکن اولاد کا سکھ نہ دیا۔ ان کے لیے کس چیز کی کمی تھی۔ انہیں شہزادوں کی طرح رکھا لیکن ایک بھی تو اچھا نہ نکلا۔ ایک ہی اس قابل ہوتا کہ یہ کاروبار سنبھال سکتا۔"

" سب مقدر کا کھیل ہے۔ شیخ صاحب، مقدروں کا۔"

چار کنال کی اس آٹھ بیڈ روم والی کوٹھی میں اب شیخ صاحب اور فضلو رہ رہے تھے اور شیخ صاحب بھی کیا ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو فضلو ہی رہ رہا تھا نوکروں کی فوج کے ساتھ۔ شیخ صاحب صبح کو نکلتے تو کوئی پتہ نہ تھا رات کو کتنے بجے واپسی ہوگی۔ ان کا سارا دن اور رات کا بیشتر حصہ بارسوخ اور اہم لوگوں کے کام کرنے اور ان سے کام لینے میں گزر جاتا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ شہر کے بعض ایسے گھرانوں نے بھی شیخ صاحب کو تاڑ لیا تھا جو ایسے لوگوں کی تاک میں رہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گرمیوں میں کھل کر پیشاب لانے کے لیے بیئر سے شروع ہو کر خوابیدہ جنسی غدودوں کو بیدار کرنے کے لیے نیٹ وہسکی تک آ پہنچے کچھ بڑے افسروں کو کیبرے سے گئے تو اس کا ایسا شوق ہوا کہ کیبرے دیکھے بغیر نیند نہ آتی۔ ویسے بھی شیخ صاحب کی نیند اُڑی رہتی تھی محاورۃً نہیں حقیقتاً۔ عمر بھر کی شدید محنت اور اولاد کے فکروں نے اعصاب میں ایسا تناؤ پیدا کر دیا تھا کہ رات کو اکیلے نہ سو سکتے۔ سوتے تو یوں سمٹ کے اور گھٹنے چھاتی سے لگا کر پاؤں یوں سکیڑ لیتے گویا پرائے آنگن میں ہیں۔ اس خوف کے نتیجہ میں ڈبل بیڈ پر کسی کی موجودگی لازم ہو چکی تھی۔ اب بیوی تو تھی نہیں کہ وہ ہر رات ساتھ سوتی۔ سو ہر مرتبہ کسی نہ کسی کو ساتھ سلانے کے لیے لانا پڑتا جی چاہے یا نہ چاہے۔ چنانچہ شراب اور زیادہ پینی پڑتی۔ بعض اوقات سوچتے بیوی زندہ ہوتی تو اسے لے آتا۔ اس بڑھاپے میں خدمت تو کرتی۔ سو بیوی کی کمی ان عورتوں سے پوری کی جاتی جو لاکھ چونچلوں کے باوجود بھی بیوی جیسی نہیں بن سکتیں۔ یوں شیخ صاحب آسودہ ہو کر بھی ناآسودہ رہتے۔

شیخ صاحب کی موت اچانک بھی تھی اور بے موقع بھی، رات گیارہ کے قریب بیڈ روم سے لڑکی کے چیخنے کی آوازیں سن کر فضلو آنکھیں ملتا ہوا بھاگا، تو کمرے کی سبز روشنی میں صرف شمیض پہنے لڑکی نظر آئی۔ اس کے بال بکھرے تھے اور خوف سے آنکھوں کی پتلیاں پھیل رہی تھیں۔

"یہ..... یہ..... یہ....." وہ ہسٹریائی انداز میں بستر کی طرف کانپتی ہوئی انگلی کیے چیخ رہی تھی۔

شیخ صاحب مردہ تھے۔ فضلو نے جھک کر دل دیکھا، نبض دیکھی اور پھر چادر سے انہیں ڈھک دیا۔ لڑکی کس وقت بھاگی فضلو کو علم نہ ہو سکا۔ بیٹے، بیٹی، بیوی، داشتہ، نوکر فضلو — سبھی کے بغیر شیخ صاحب نے نیند میں دم دے دیا تھا۔ نوکر سب جا چکے تھے۔ فضلو کو اور تو کچھ نہ سوجھا وہ بھاگا بھاگا ساتھ والی کوٹھی میں جا گھسا۔ شیخ صاحب کے ان لوگوں پر بہت سے احسانات تھے اور بے بی تو خاص طور پر زیر بار تھی۔

"کیا ہے فضلو" بے بی کی ماں نے جو مٹاپے میں بے بی سے کم نہ تھی۔ فضلو کو دروازہ پر کھڑے دیکھ کر آئی اور اس کی اڑی رنگت دیکھ کر پوچھا۔

"خیریت تو ہے؟"

"جی۔ جی ....."

"کیا بات ہے؟"

"جی ..... شیخ صاحب ....." اس کی آواز رندھ رہی تھی۔

"کیا ہوا شیخ صاحب کو؟"

"جی چل بسے"

"کیا بکتے ہو"

وہ اسے بازو سے پکڑ کر روشنی، قہقہوں اور موسیقی سے بھرپور کمرہ سے دور تاریک گوشہ میں لے گئی "اب بتاؤ کیا ہوا؟"

"وہ نیند میں مر گئے" فضلو نے لڑکی والی بات نہ کی۔ شیخ صاحب حاجی نہ سہی لیکن شیخ صاحب تو تھے۔

"پھر؟"

"آپ لوگ وہاں چلیں۔"

"پاگل ہوگئے ہو کیا۔"

"کیوں جی۔"

"میرا گھر مہمانوں سے بھرا ہے۔ بے بی کی برتھ ڈے پارٹی ہے بلکہ شیخ صاحب نے بھی آنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں بھلا کیسے جا سکتی ہوں۔" نیم تاریکی میں اس کا میک اپ سے بھرا چہرہ چمک رہا تھا۔ فضلو اس کے سینٹ کی خوشبو سونگھ رہا تھا۔

"بابو جی کو بھیج دیں۔"

"وہ بھی نہیں آ سکتے۔" لہجہ اتنا دو ٹوک تھا کہ فضلو کو اور کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ دروازہ سے گزرتے وقت اس نے بی بی کی آواز سنی۔

"ممی کون تھا۔"

"کوئی نہیں بے بی۔"

نصف سے زائد رات بیت چکی تھی۔ خاموش کوٹھی میں اب اسے شیخ صاحب سے خوف آ رہا تھا۔ اس نے ایک جھرجھری لی اور کوٹھی بند کر باہر آگیا۔ سینما کے پاس سے ایک رکشہ پکڑا اور سیدھا لوہاری پہنچا۔ سب سے پہلے رحمت کو جگایا اور اسے شیخ صاحب کی موت کا بتایا۔ یہاں شیخ کا کوئی رشتہ دار یا عزیز نہ تھا لیکن انہیں جاننے والوں کی کمی نہ تھی۔ چنانچہ آدھ پون گھنٹہ میں سب کو شیخ صاحب کی موت کا علم ہو گیا۔ سبھی گامے کی موت کا افسوس کر رہے تھے۔ رحمت نے اپنے ایک ٹرک ڈرائیور دوست کو جگایا اور سب لوگ واپس کوٹھی آئے۔ ٹرک پر شیخ صاحب کی نعش رکھی۔ جب واپس لوہاری پہنچے تو تمام گھروں کی بتیاں روشن تھیں اور فجر کی اذانوں سے فضا گونج رہی تھی۔

رزقِ حلال

ماسٹر صاحب نہایت آسودگی سے کرسی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے تو سکون کے احساس سے ان کے منہ سے کراہ سے ملتی جلتی آواز نکلی۔ میں نے سگریٹ پیش کیا تو ایک لمبی سانس لے کر اسے سونگھا اور میری طرف دیکھ کر بولے: "بڑھیا تمباکو ہے۔" میں نے اپنا اور ان کا سگریٹ سلگایا۔ ماسٹر صاحب نے ایک طویل کش لیا اور دھواں ناک سے چھوڑتے ہوئے چائے لاتے بیرے کو پُر شوق نظروں سے دیکھا۔ میں نے چائے بناتے ہوئے پوچھا "چینی کتنی؟"

"تین چمچ — اور ہاں، دودھ بھی زیادہ ہی ڈالنا۔"

ماسٹر صاحب نے کپ ہٹا کر پرچ میں چائے انڈیلی اور شڑپ کی آواز سے ایک لمبا گھونٹ لیا، اس مرتبہ بھی طمانیت کے احساس سے اُن کے منہ سے آواز نکلی۔ چٹکی بجا کر سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے بولے

"اور سناؤ بھئی کیا حال ہیں تمہارے؟"

"جی بس مزے ہیں۔"

"سنا ہے کالج میں پروفیسر ہو گئے ہو؟"

"جی آپ کی دعا سے۔"

ماسٹر کرم داد دینیات کے استاد تھے اور اپنی سخت گیری کے لیے خاص شہرت رکھتے تھے۔ جب مَیں ان سے پڑھتا تھا تو ان کی ڈاڑھی کھچڑی تھی، گھٹا ہوا سر، ٹخنوں سے اونچی میلی شلوار، سر پر رومی ٹوپی۔ جب وہ غصّہ میں آتے تو دانتوں میں ڈاڑھی لے لیتے اور ہاتھوں میں لڑکے کے بال، ان کا جثہ اور ہاتھ دونوں ہی بھاری تھے۔ اس لیے ان بھاری ہاتھوں سے لڑکے کو پکڑ کر اُٹھا لیا کرتے۔

ایک ہاتھ کے ناخن بڑھا کر رکھتے تھے اور جس بدقسمت پر زیادہ غصہ آتا کان کی لو میں دونوں ناخن یوں چبھوتے کہ گوشت چیر کر ناخن مل جاتے۔ یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ ان کی مار سے کم از کم دو لڑکوں کے پیشاب نکلتے تو میں نے بھی دیکھے ہیں۔ ان کے بارے میں سکول میں بڑی خوفناک اور عجیب و غریب اور پُراسرار روایات بھی مشہور تھیں۔ جنہیں ہم ایسے کچی عمر کے طالب علم سپاروں میں منہ دے کر سنتا اور سنایا کرتے۔

ماسٹر کرم داد کھانے پینے کے بہت شوقین تھے۔ سردیوں میں ان کی جیب مونگ پھلی، ریوڑیوں اور چلغوزوں سے بھری رہتی۔ سکول کے سامنے حلوائی کی دکان تھی۔ جہاں وہ دودھ میں جلیبیاں ڈال کر پیتے۔ پھر سارا دن پیٹ پر ہاتھ پھیرتے اور ڈکار لیتے، حقے کے بھی شوقین تھے۔ سنا ہے کسی زمانے میں تو وہ جماعت میں بھی حقہ ساتھ رکھتے تھے۔ مگر اب وہ حقہ سکول کی کنٹین میں دھرا رہتا۔ جہاں خالی پیریڈ میں وہ میز پہ ٹانگیں پھیلائے حقے کی نے منہ میں لیے اخبار پڑھتے رہتے۔ پھر خبروں پہ تبصرہ کرتے جس میں تبصرہ کم اور گالیاں زیادہ ہوتیں ویسے بھی ان کی گفتگو کی چاشنی گالیوں سے تھی۔ قسم قسم کی، بڑی بڑی اور گندی گندی گالیاں — لڑکے سے تلاوت سن رہے ہیں، جہاں ذرا غلطی ہوئی، انہوں نے گرج کر گالی نکالی۔ ہم طالب علموں نے ان سے آیات کے مقابلہ میں گالیاں زیادہ سیکھی ہوں گی۔

ماسٹر کرم داد نے سگریٹ کا آخری کش لگا کر پوچھا "سنا ہے، تم ادیب ہو گئے ہو؟"

میں نے انکساری سے کہا "بس جی! ادیب کیا، کچھ لکھ لیتا ہوں۔"

"کیا لکھتے ہو؟"

"بس جی یہی افسانے، تنقیدی اور نفسیاتی مضمون۔"

"اچھا اچھا" وہ سر ہلا کر بولے۔ میں نے چائے کا دوسرا کپ بنا کر دیا: "پھر تو خاصے مشہور ہو گئے۔"

"نہیں جی مشہور کیا بس دل کا شوق ہے۔"

"کوئی کہہ رہا تھا تم نے جنس پر کتابیں لکھی ہیں۔"

"جنس تو نہیں نفسیات پر کچھ کام کیا ہے۔"

" وہ ایک ہی بات ہے - یہ سب گندی باتیں ہوتی ہیں اور افسانے بھی تو تم نے گندے گندے ہی لکھے ہوں گے ۔"

" جی نہیں - گندے کیا ہونے ، بس افسانے ہیں جیسے ہوا کرتے ہیں ۔"

" مَیں اِس بات کو نہیں مانتا - تم ایم اے ہو ، کالج میں پروفیسر ہو اور تم قوم کی بھلائی کے لیے کچھ نہیں کرتے - اوّل تو مجھے تمہارا یہ مضمون ہی ناپسند ہے - اللہ کے بندے تم اسلامیات کے پروفیسر بنتے تو میں بھی خوش ہوتا کہ میرے شاگردوں میں سے بھی کوئی کالج میں اسلامیات پڑھا کر میرا نام روشن کر رہا ہے ۔"

اب میں ماسٹر کرم داد کو یہ کیسے بتاتا کہ ان کی خشونت ، ان کے بھاری ہاتھوں اور ان کی گالیوں نے مجھے دینیات ہی سے نہیں ، بلکہ مذہب سے بھی بیزار کر دیا - میں باقی مضامین کی جماعتوں میں مانیٹر تھا لیکن دینیات کی کلاس میں چوہا بن کر پیچھے دبکا رہتا ۔ میرے والد تبدیل ہو کر آئے تو انجمن کے اس سکول میں مجھے داخل ہونا پڑا - پہلے دن کلاس میں داخل ہوتے ہی اگلے بنچ پہ مجھے دیکھا تو آنکھیں ، خون کبوتر ہو گئیں ۔ تم " — انہوں نے انگلی سے میری طرف اشارہ کیا تو یوں لگا گویا انگلی سے بجلی کا کرنٹ نکل کر مجھے جھٹکے دے رہا ہو " تم ! "

" جی ماسٹر جی ۔" میں ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا ۔

" کیا تم کرسٹان ہو ؟"

" جی نہیں ۔"

" ہندو ہو ؟"

" جی نہیں ۔"

" سکھ ہو ؟"

" جی نہیں ۔"

" تو پھر یہ نیکر کیوں پہن رکھی ہے ۔"

اب وہ میرے سامنے کھڑے تھے اور میرا سر نہ اُٹھ رہا تھا انہوں نے موٹی موٹی کھردری انگلیوں سے میری ٹھوڑی اٹھا کر کہا "اور یہ جو مانگ نکال رکھی ہے اس پر کیا تیرے باپ کی موٹر چلے گی ؟" مجھے خاموش دیکھ کر گرجے "ہیں ؟ موٹر چلے گی کیا ؟" ۔

اب مجھے یہ بات سمجھ میں آئی کہ کیوں سب نے ٹخنگے پائجامے پہن رکھے تھے اور کیوں سب کے سر پر ٹوپیاں تھیں ۔ کچھ لڑکے مجھے رحم کی نظروں سے دیکھ رہے تھے تو کچھ ہونٹ دبائے ہنس رہے تھے ۔

"بول بے مخنچو"

مگر مخنچو کیا بولتا "کہاں سے آئے ہو ؟"

میں نے بتایا ۔ وہ استہزا سے بولے "آہ ! کانونٹ کے پنچھی ہو ۔ جبھی کرسٹان بنے بیٹھے ہو ۔ لیکن سن لو ۔ اگر اس سکول میں پڑھنا ہے اور اس جماعت میں آنا ہے تو مسلمان بن کر آنا ۔ آج تو پہلا دن ہے میں نے تمہیں چھوڑ دیا ہے ورنہ وہ جوتے ماروں گا کہ یاد کرو گے ۔"

گھر جا کر ماں کے گلے لگ کر رو رو کر میں نے سب سنایا حتیٰ کہ وہ سب گالیاں بھی دہرا دیں اور سکول جانے سے انکار کر دیا ۔ شام کو اباجی گھر آئے تو ماں نے انہیں سب کہہ سنایا ۔ وہ اسی وقت اپنے دوست سکول انسپکٹر کے گھر گئے ۔ جس نے ہیڈ ماسٹر اور ماسٹر کرم داد دونوں کو بلا کر خوب جھاڑا نتیجہ یہ نکلا کہ اس دن کے بعد سے دینیات کے پیریڈ میں مجھے کبھی کچھ نہ کہا گیا ویسے میں بھی مسلمان بن کر سکول جاتا لیکن پھر بھی مسلمان نہ بن سکا ۔

ماسٹر کرم داد نے بیڑی کھاتے ہوئے کہا :

"ہمارے ملک کا تو ستیاناس ہو گیا ہے ۔ اس قدر بے حیائی ہو گئی ہے کہ خدا کی پناہ ۔ لڑکیاں دوپٹوں کے بغیر چھاتیاں مٹکاتی چلتی ہیں ۔ لباس ہیں تو ان میں بھی بے حیائی آ گئی ہے ۔ پردہ رہا نہیں نہ آنکھ کا اور نہ جسم کا ۔ ہر طرف سینما ہیں جن میں گندی گندی انگریزی فلمیں چلتی ہیں اور کوئی روکنے والا نہیں ظلم خدا کا منہ چومتے مرد عورت کے اشتہار کھلے بندوں لگتے ہیں اور کوئی روکنے والا نہیں ۔ گندا ادب گھر گھر غلاظت بکھیر رہا ہے جسے دیکھو گندی خواہشات کے پیچھے دیوانہ وار پھر رہا ہے ۔ کیا پاکستان اس

ناپاکی کے لیے بنا تھا کہ عورتیں بے حیا، ہوں اور مرد بے غیرت ۔ ارے ! ان سب کو تو سرِ عام گولی سے اڑا دینا چاہیئے ان کی سزا تو رجم ہے ، سب کو سنگسار کردو ۔ یہ سب ہماری گندی فلموں کا قصور ہے اور اس سے بھی بڑھ کر مغرب سے آنے والی گندی گندی کتابوں کا ہے ۔ حد ہوگئی ! شرافت اور اخلاق ہی ختم ہوگیا نہ چھوٹے کا لحاظ نہ بڑے کا ادب ، نہ بزرگوں کا احترام ۔ نماز ، روزہ ، قرآن سب کو بھلا بیٹھے ۔ سب شیطان کے چیلے ہیں ، سب خبیث ہیں ، سب مردود ہیں ، سب ....." اور اب گالیوں کی گردان شروع ہو چکی تھی ۔

⁂

داتا صاحب کا عرس تھا اور میں اپنے جانے کی جلدی میں ہجوم میں سے راستہ بناتا گزر رہا تھا کہ ماسٹر کرم داد پر نگاہ پڑ گئی ۔ ڈاڑھی سفید تھی اور سر کی رومی ٹوپی میل سے چیکٹ ہو رہی تھی ۔ اس کا پھندنا ندارد تھا اور ڈھیلی ہو کر کانوں کو ڈھانپ رہی تھی ۔ چہرے کا سانولا پن اب باورچی خانہ کی دھواں کھائی دیوار کی رنگت میں تبدیل ہو چکا تھا ۔ آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک تھی ۔ البتہ آواز کا کڑاکا ویسا ہی تھا ۔

"لے لو پنج سورے ، دعائے گنج العرش ، لے لو ! آیۃ الکرسی ۔ داتا دے پیاریو ! لے لو !"

دراصل اسی مانوس آواز نے مجھے ان کی طرف متوجہ کیا تھا ۔ ہاں ! یہ ماسٹر کرم داد ہی تھے ۔ چہرہ پہ زمانے کی لکیریں لیے بھنبھوڑے اور سیپاروں کی چھوٹی سی پوٹلی اٹھائے وہ لوگوں کے بھنور میں بار بار آواز بلند کر رہے تھے : "داتا دے پیاریو ! لے لو ! لے لو !" میں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا ۔ گو جلدی میں تھا لیکن ماسٹر کرم داد کے اس کھنڈر کو دیکھ کر آگے نہ بڑھا گیا ۔

" ماسٹر صاحب !" بے یقینی سے میں نے پکارا ۔

انہوں نے پلٹ کر دیکھا ۔ چند لمحوں تک اُن کی نگاہیں میرے چہرے کو ٹٹولتی رہیں ۔ میں نے نام بتایا تو انہیں یاد آگیا ۔ گلے لگا لیا ۔

" یہ دھندا کب سے شروع کیا ؟ "

" دھندا کیا کرنا کمیشن پر کام کرتا ہوں ۔ ریٹائرمنٹ کے بعد گزر ہونی مشکل تھی ادھر مہنگائی

ہر روز بڑھتی جاتی ہے۔ گھر میں کئی جی کھانے والے۔ کمانے والا کوئی نہیں۔"

"اور جو آپ کا بیٹا تھا کیا نام تھا اس کا؟"

"کفایت اللہ۔"

"جی ہاں! وہ تو اب ملازم ہوگا۔"

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولے" اللہ کو پیارا ہوگیا۔ بس کے حادثے میں مارا گیا۔ اس کی بیوہ اور بچے بھی میرے ساتھ ہیں۔ کیا کرتا! ناچار کمانے کے لیے یہ سلسلہ چلایا ہے۔ چار پیسے بھی بچ جاتے ہیں اور ثواب بھی ہو جاتا ہے۔"

"کیا ملتا ہے آپ کو؟"

"بیس فیصد کمیشن۔"

"بس؟"

"تو اور کیا ملتا۔ پیسے کی بات نہیں۔ اصل بات تو ثواب کی ہے۔"

"تو آپ کتنا کما لیتے ہیں؟"

"کبھی تین کبھی پانچ، عرس کے دن ہیں آج شاید دس بیس بن جائیں۔"

"ماسٹر صاحب! اتنے کا تو آپ ڈرائی فروٹ کھا جاتے تھے۔"

"بیٹا! وقت کی بات ہے" ٹھنڈی سانس بھر کر بولے" میرے یہ دن گھر آرام سے بیٹھ کر حقہ پینے اور پوتے کھلانے کے ہیں۔ سڑکوں پر دھکے کھانے کے نہیں۔"

"مگر آپ کہیں ٹیوشن وغیرہ کر لیتے۔"

بجھی بجھی ہنسی سے بولے" کیا بچوں جیسی بات کرتے ہو۔ دینیات کی ٹیوشن، قرآن مجید کی ٹیوشن، ارے میاں! یہ کوئی انگریزی یا فزکس کیمسٹری تو نہیں کہ لوگ ان کی ٹیوشن رکھیں۔ ویسے ایک دو کوٹھیوں میں جا کر قرآن مجید پڑھانا شروع کیا تھا لیکن میں اپنی عادت اور زبان سے مجبور ہوں۔ چنانچہ جلد ہی چھٹی ہوگئی۔"

یہ باتیں سُن کر مجھے دلی افسوس ہو رہا تھا۔ میں نے کہا "ماسٹر صاحب واقعی آپ کی یہ عمر ایسے کام کی نہیں۔ اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کے لیے کسی سے بات کردوں "

" ہاں بیٹا! ضرور کرو۔ مجھے کام میں شرم نہیں، مَیں تو بس ایک جگہ ٹِک کر بیٹھنا چاہتا ہوں۔ لیکن ہو رزقِ حلال "

" ماسٹر صاحب! آپ بزرگ ہیں۔ اس عمر میں بھلا آپ سے کوئی ناجائز کام کیا لے سکتا ہے "

میں نے اپنے ایک دوست کے نام رقعہ لکھ کر دے دیا " ماسٹر صاحب یہ شخص بڑا چلتا پرزا ہے۔ خود سینما کا مالک ہے اور دنیا بھر سے تعلقات ہیں۔ یہ آپ کا ضرور کہیں نہ کہیں بندوبست کرا دے گا "

ماسٹر صاحب نے اظہارِ تشکر میں میرا ہاتھ دبا دیا۔

اس بات کو دو تین برس گزر گئے کہ ایک دن بازار میں ایک لڑکا میرے پیچھے پیچھے آوازیں دیتا آیا " پروفیسر صاحب! پروفیسر صاحب!"

" میں رُکا تو وہ بولا " آپ کو مولانا بلاتے ہیں "

" کون مولانا ؟

" مولانا کرم داد صاحب " میں نے ذہن پہ زور دیا اور پھر اچانک ذہن میں گھنٹی بجی " تم ماسٹر کرم داد کی بات تو نہیں کر رہے ؟

" جی ہاں۔ جی ہاں۔ وہی ہیں "

مَیں پلٹ کر دکان پر آیا تو واقعی یہ ماسٹر کرم داد ہی تھے۔ مجھے گلے لگایا تو عطرِ حنا کی مہک آئی، سفید بے داغ لباس، روشن چہرہ، آنکھوں میں سُرمے کی لکیر، سفید نورانی داڑھی اور مہندی میں رنگے بال، سر پہ کُلّہ باندھ رکھا تھا۔ یہ کتابوں کی دکان تھی۔ فارمیکا کی میز اور فارمیکا ہی کا کاؤنٹر۔ دیواروں پر مقاماتِ مقدسہ کی تصاویر اور آیات کے طغرے سج رہے تھے۔

" آپ یہاں ملازم ہیں ؟

وہ ہنس کر بولے " نہیں بیٹا! یہ میری اپنی دکان ہے "

"ابھی؟"۔

"ہاں! میں نے کیا جھوٹ بولنا ہے۔ سات ہزار پگڑی کے دے کر دکان لی ہے۔ دراصل یہ اڈا بہت اچھا ہے"۔

"مگر۔ مگر یہ سب کچھ ہوا کیسے؟

"بیٹا خدا بڑا مسبب الاسباب ہے۔ ویسے وسیلہ تم ہی بنے تھے"۔

"وہ کیسے؟"۔

"تمہیں یاد ہے ناتم نے مجھے سینما والے دوست کے پاس بھیجا تھا"۔

"جی ہاں"۔

"میں جب اُن کے پاس گیا تو انہوں نے کہا: کسی اور کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے سینما میں فلمی گانے کی کتابیں اور فلمی رسالوں کے سٹال پہ بیٹھ جاؤ"۔

"آپ نے انکار کر دیا ہوگا"۔

"ہاں کیا تو تھا لیکن بعد میں سوچا کہ فلمی رسالے اور گانے بیچنے کے باوجود میرا کردار داغ دار نہیں ہو سکتا۔ بلکہ میں ان سینما والوں کو بھی دکھا دوں گا کہ گندے ماحول میں خود کو کیسے پاک صاف رکھا جا سکتا ہے اور میں نے یہ کر دکھایا۔ گانے بھی بیچے اور نماز بھی نہ قضا کی۔ اس کام سے میں نے خاصا کمایا۔ پھر ایک اور سینما میں بھی سٹال کا ٹھیکہ لے لیا اور اللہ کے فضل سے بہت اچھی گزر ہونے لگی"۔

"مگر سینما سے اس دکان تک کیسے پہنچے؟"۔

"بھئی کاروبار کی ایک خصوصیت ہے کہ اُسے جتنا پھیلاؤ اتنا ہی پھیلتا جاتا ہے۔ پہلے میں نے ایک کے مشورے پر خود گانوں کی کتابیں چھپوائیں۔ اتفاق سے وہ فلمیں بھی خوب چلیں۔ چنانچہ مجھے اس میں خاصا نفع رہا۔ پھر آہستہ آہستہ میں کتابیں چھاپنے کی طرف آگیا۔ اور چھوٹی سی دکان بھی لے لی"۔

"اچھا تو آپ اب ناشر ہو گئے ہیں"۔

"ہاں!"

میں نے مذاق میں کہا "پھر تو آپ میری بھی ایک کتاب چھاپ دیں۔"

"کیوں نہیں! کیوں نہیں! تمہیں بلوانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا، کہ تمہاری کتاب بلکہ کتابیں چھاپی جائیں۔"

"اچھا؟"

"ہاں! مگر یہ کتابیں تمہاری ادبی کتابیں نہ ہوں گی۔ ادب کار بیکار ہے۔ تم لکھو وہ کتابیں...." اور اب ان کی آواز سرگوشیوں میں تبدیل ہو چکی تھی "جو آن لائبریری میں خفیہ طور سے چلتی ہیں" الائچی میں بسی ہوئی ان کی سانس میرے چہرے کے قریب تھی "اس میں بڑی پیدا ہے ایک کتاب پانچ سات ہزار سے کم نہیں بکتی۔ کوڑیوں میں چھاپو اور ہیروں کے مول بیچو۔ میں تمہیں اس کا معقول معاوضہ دوں گا۔ مہینہ میں کم از کم ایک کتاب لکھ دیا کرنا۔ کم بخت کتنی کیوں نہ چھاپ لو، طلب ہی نہیں ختم ہوتی ان کتابوں کی — اور ہاں! یہ یاد رہے....."

ماں بیٹا

"کیا کہا؟ پندرہ پیسے فی حرف؟"

"ہاں" اس لڑکے نے بے زاری سے جواب دیا، لڑکے نے ایک میلی بنیان اور گندی نیکر پہن رکھی تھی۔ اگست کا حبس اس کے میلے جسم پر لکیریں بناتا بہہ رہا تھا۔ لڑکا ہاتھ میں چھینی پکڑے منتظر تھا کہ یہ جائے تو وہ کام میں لگے۔ سامنے نقلی سنگِ مرمر کی سِل دھری تھی۔

"میرے خیال میں تمہیں غلطی لگی ہے" اس نے پراُمید لہجہ میں کہا" پندرہ پیسے فی لفظ ہوگا۔"

لڑکا سمجھ گیا تھا کہ یہ کام اور اس کا خرچ اس گاہک کی اوقات سے زیادہ ہے۔ لہٰذا اس نے جواب دینے کی ضرورت بھی نہ محسوس کی اور سِل کو سیدھی کر کے بیٹھ گیا۔

حبس سے بوجھل ہوا اس کے بدن میں جیسے بے زاری کی چنگاریاں بھر رہی ہو، وہ بڑی مشکل سے ایک گھنٹہ کی چھٹی لے کر آیا تھا اس کا خیال تھا کہ فٹا فٹ بات طے ہو جائے گی مگر یہ بدبودار لڑکا نہایت نامعقول تھا اور اس کا رویہ ریٹ سے بھی زیادہ۔

"دکان کا مالک کہاں ہے؟" اب اسے لڑکے پر غصّہ آرہا تھا جو اس کے وجود سے یوں لاتعلق تھا گویا وہ ایک معززِ گاہک کے برعکس مسجد کی تعمیر کے لیے چندہ مانگنے آیا تھا۔

"مالک گیا ہے" وہ اسی غصّہ دلانے والی لاپرواہی سے بولا۔

"پندرہ پیسے لفظ نہیں لگانے؟"

لڑکے نے جواب دینے کی ضرورت بھی نہ محسوس کی تو دل ہی دل میں اسے گالیاں نکالتا چلا یوں محسوس ہوتا گویا سب نے اسے لوٹنے کا ایکا کر رکھا ہے۔ پندرہ پیسے فی حرف سے کم تو کسی نے کیا بتانا

تھا ، سترہ ، بیس بلکہ پچیس پیسے تک جانے والے بھی تھے - البتہ سب اس لڑکے ایسے بدتمیز نہ تھے۔ آٹھ دس دوکانیں گھوم جانے کے بعد اسے احساس ہوا کہ آج بات نہ بنے گی ، اس کی جیب میں پیسے تھوڑے تھے اور مبس بہت زیادہ ! سرکاری عمارت کے سنگِ بنیاد ، بن کھلے مرجھا گئے غنچے ۔ باعصمت بیویاں، مکانوں کی منزل کے نشان ، مسجد کا نام ، شہید ۔ سب پتھر کی سل بنے ان دکانوں میں موجود تھے ۔ ملگجے سنگ مرمر پر سیاہ چمکیلے حروف - آیات اور کلمات ۔ حسرت ناک اشعار ، دل کا درد ، غم کی پکار، محبت کا اظہار سب کچھ پندرہ پیسے فی حرف کے حساب سے پتھر بن چکا تھا - اسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا پتھروں کے یہ سوداگر اسے لوٹنے کو مل بیٹھے ہیں - دس انچ چوڑے بارہ انچ لمبے نقلی سنگِ مرمر کی سلیٹ پندرہ بیس اور بعض صورتوں میں پچیس روپوں تک گئی تھی اور ان پر مستزاد پندرہ پیسے فی حرف ، یہ تو گورکنوں اور لٹھا بیچنے والوں سے بھی بڑھ گئے تھے ۔ دفتر واپس آکر اس نے بسم اللہ الرحمن الرحیم - لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ - مرقد - نفیسہ خاتون زوجہ کرم الدین - تاریخ انتقال ۱۵ جولائی ۱۹۷۱ء عمر ۵۴ برس ، آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے - سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے ۔ غمگسار بیٹا عبداللہ خان عفی عنہ ۔ یہ سب لکھ کر جب ان کے حروف کا ٹوٹل کیا اور انہیں پندرہ پیسوں سے ضرب دے کر سو پر تقسیم کر کے نتیجہ روپوں کے خرچ کی صورت میں نکالا تو سینہ سے بے اختیار ٹھنڈی سانس نکل گئی ۔

عبداللہ خاں کے لیے ۱۵ جولائی ۱۹۷۱ء تک اس دنیا میں صرف دو ہی پیارے تھے - ایک ماں اور دوسری بیوی ۔ مگر ۱۵ جولائی کے بعد صرف بیوی رہ گئی - بیوی واقعی اسے بے حد پیاری تھی - ماں کے انتقال سے پہلے تو خیر وہ تھی ہی لیکن ماں کے انتقال کے بعد بیوی نے جس طرح اس کی دلجوئی کی اس نے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کا وفادار شوہر بنا دیا تھا ۔ عبداللہ کا باپ بچپن میں مر گیا تھا - دو بیٹیاں ، ایک بیٹا اور دو کمروں کا ایک چھوٹا سا مکان - یہ اثاثہ مرحوم نے چھوڑا تھا - نفیسہ خاتون چاہتی تو خاندان کے کسی رنڈوے کے ساتھ گھر بسا سکتی تھی ۔ مگر اس نے اولاد پر کسی کو ترجیح نہ دی تھی - تشم پشتم جیسے بھی گزری بیٹوں کو پڑھایا لکھایا - دونوں پڑھ کر استانیاں بن گئیں - انہوں نے گھر بھی سنبھالا - عبداللہ کو بھی پڑھایا اور اپنے لیے جہیز بھی بنایا - دونوں سسرال سدھاریں تو ماں بیٹا

اکیلے رہ گیے۔ عبداللہ اپنی ماں کا بڑا فرمانبردار بیٹا تھا۔ اس کی زندگی کا سیارہ صرف ایک محور پر گردش کرتا تھا اور وہ تھا ماں! دفتر سے گھر آتا تو ماں کے ساتھ کام میں ہاتھ بٹاتا۔ اتوار کو فرش دھوتا۔ کپڑے دھوتا۔ الغرض! سلائی کڑھائی کے علاوہ وہ گھر کے ہر کام میں طاق تھا۔ ماں کو اچھے اچھے کپڑے لا کر دیتا۔

"ارے پگلے! یہ اتنے بڑے بڑے سُرخ پھولوں والا سوٹ پہن کر میں کیا کروں گی۔"

"ماں دیکھنا تو سہی یہ کتنا اچھا لگے گا۔"

وہ ہنس کر کہتی "یہ میری عمر ہے ایسے رنگ پہننے کی بھلا؟"

"ارے ماں آج کل تو لڑکے یہ رنگ پہن رہے ہیں۔ اب تو وہ بات ہی ختم ہوگئی کہ کون کون سا رنگ پہنے اور کون سا رنگ نہ پہنے۔ اب تو سب مرد عورت لال نیلے پیلے گہرے رنگوں میں پھرتے ہیں۔"

"پھر بھی۔ میری عمر میں یہ اچھا نہیں لگتا۔"

"عمر کی کیا بات ہے ماں، تمہاری چھب تو لڑکیوں سے بڑھ کر ہے۔"

بیٹے کی یہ تعریف بیوہ میں بیوی بیدار کر دیتی۔ اسے مرحوم خاوند یاد آجاتا جو اسی طرح اس کے لیے شوخ رنگوں کے کپڑے لاتا تھا۔ وہ غریب بھی مگر محبت کرنے میں بڑا دریا دل تھا۔ بیٹا عادتوں اور صورت میں باپ بنتا جا رہا تھا اور کبھی کبھی تو وہ اسے دیکھ کر اچانک چونک سی جاتی۔ خاص طور سے اس وقت جب اسے بیٹے کی نظریں اپنے تعاقب میں محسوس ہوتیں۔ "تم یوں گھور گھور کے کیا دیکھ رہے ہو؟"

"ماں تم اچھی جو لگتی ہو۔"

یہ اچانک تعریف چہرے پر سرخی لے آتی "ہشت شیطان!"

"سچ ماں!" وہ اٹھلا کر بولتا "یہ نیلا سوٹ تو بہت ہی بج رہا ہے۔"

وہ اس تعریف سے خوش بھی ہوتی اور چڑتی بھی "یہ تو ہر وقت کپڑوں کو کیوں دیکھتا رہتا ہے تو نے تو کپڑے بدلنے محال کر دیئے ہیں۔"

"واہ بھئی اچھی رہی، ایک تو کپڑوں کی تعریف کرو اور دوسرے باتیں سنو۔ اچھا اس نیلے سوٹ میں تو بہت بُری لگ رہی ہو۔ اسے اتار کر دوسرا بدل لو۔"

"کون سا؟" وہ جیسے بے خیالی میں پوچھتی۔

"وہی جس کی پیلی زمین پر لال اور سبز پھول ہیں۔" وہ آنکھیں سجاکر جواب دیتا۔ وہ ہنس کر کہتی "تجھ سے نپٹنا بہت مشکل ہے۔"

وہ ماں کی محبت میں یوں ملفوف تھا کہ اسے کبھی یہ بھی دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ محلے کی کتنی لڑکیاں جوان ہیں یا برادری میں کیسی کیسی شستہ دار موجود ہیں۔ اس جیسا شریف کماؤ اور تابعدار نوجوان کئی ماؤں کی آنکھوں کا تارا بن جاتا ہے۔ چنانچہ محلے کی بوڑھیاں اس کی مثالیں دیتی اور بزرگ رشتہ دار واری صدقے جاتے۔ مگر عبداللہ خاں ان باتوں سے بے نیاز تھا۔ نظریں جھکائے گلی میں سے گزرتا اور صدقِ دل سے سب کو ماں بہن سمجھتا۔ اس نے کبھی شادی کی ضرورت محسوس نہ کی کہ اس نے کبھی خود کو جوان محسوس نہ کیا۔

"چھوڑو ماں یہ کیا ہر وقت شادی شادی کرتی رہتی ہو۔"

"شادی نہ کرو گے تو پھر کیا کرو گے۔"

"کیا مطلب پھر کیا کرو گے۔ ماں! آخر اب میں کیا کر رہا ہوں۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"تو پھر"

"اب جوان ہو اور اچھے رشتے مل رہے ہیں۔ کل کلاں یہ سب بیاہی گئیں تو میں کہاں سے لڑکیاں لاؤں گی۔"

وہ ہنسا "ماں لڑکیاں جب چاہو لے لو۔ اس ملک میں لڑکیوں کی بڑی اکثریت ہے اور اچھے لڑکوں کا کال ہے۔"

وہ اس کے ایک دھپ لگاتی۔ "اس اچھے لڑکے کی بوتھی تو دیکھو۔"

"ایسی خاص بُری بھی نہیں۔"

کبھی تو بات یوں مذاق میں ٹلتی اور کبھی یوں رُخ مڑتا:

"آخر تمہیں اعتراض کیا ہے؟" وہ سنجیدگی سے پوچھتی۔

وہ کسی شاگرد کو سمجھانے کے انداز میں جواب دیتا "ماں! اب گھر میں کتنا امن اور سکون ہے کیوں اپنے ہاتھوں سے سیہہ کا کانٹا بوتی ہو۔"

"کیا مطلب تیرا؟"

"مطلب صاف ہے! کبھی ساس بہو کی بنی ہے کیا؟ پھر بے کار میں چخ چخ پالنے کا کیا فائدہ"

"بہو سے وہ ساسیں تنگ ہوتی ہیں جو اسے اپنا دشمن سمجھتی ہیں، لیکن اگر میں اسے محبت اور پیار دوں گی تو وہ کیوں مجھ سے نفرت کرے گی؟"

"اس لیے کہ یہ رشتہ ہی نفرت کا ہے۔"

"کیسے؟"

"بہو یہ سمجھتی ہے کہ گھر میں دو ٹیمیں ہیں۔ ایک اس کی اور دوسری ساس کی۔ ان دونوں میں مڑائی یعنی خاوند جیتنے کے لیے میچ ہو رہا ہے۔"

"کیا بے تکی بات کی تو نے؟"

"ماں یہ بے تکی بات نہیں بہت بڑی حقیقت ہے۔"

حقیقت تو واقعی یہی تھی لیکن اس وقت تک جب تک اس نے شگفتہ کو نہ دیکھا۔ شگفتہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو صرف پیار کرنے اور پھر بچے پیدا کرنے کے لیے بنی ہیں۔ چوڑے شانے۔ بھرے بھرے کولہے اور بھری بھری چھاتیاں جن سے دودھ چھلکنے کا احساس ہو، چنانچہ عبداللہ خان کو بھی اور کچھ نہ سوجھی اور یوں اس کے سہرے کی صورت میں بالآخر ماں کی آرزوں کے پھول کھل اٹھے۔

بے دھیان کھڑے کسی شخص کو اٹھا کر تالاب میں پھینک دیا جائے تو حیرت زدہ وہ ڈبکیاں کھاتا ہے لیکن جلد ہی سنبھل کر تیرنا شروع کر دیتا ہے اور پھر اس سے لطف اندوز بھی ہوتا ہے۔ کچھ ایسا ہی تجربہ شگفتہ سے شادی بنی۔ شگفتہ کی محبت بھی اس کے لیے ایک ایسا ہی تالاب

ثابت ہوئی - یم گرم پانی کا تالاب جس کی وسعت نامعلوم ، عبداللہ خاں نے جب اپنے خوف اور حیرت پر غلبہ پالیا تو وہ ایسا تیراک ثابت ہوا کہ غوطے لگاتا نہ تھکتا -

ماں ، بیٹا ، بہو کی ازلی تکون کے تینوں زاویے کیسے درست تھے ، محلہ والیاں اس راز کو نہ سمجھ پائیں - بجز اس کے کہ نفیسہ بڑی خوش قسمت تھی - پہلے تابعدار بیٹا ملا اور پھر تابعدار بہو - ساس اور بہو دونوں دن بھر گھر کے کام میں جتی رہتیں - شگفتہ کے جہیز نے خالی گھر کو بھر دیا - یوں محسوس ہوتا گویا ساس بہو میں عبداللہ کی محبت اور توجہ حاصل کرنے کے لیے ایک غیر مرئی مقابلہ جاری تھا - اگر اس مقابلے نے گھر میں کسی قسم کا تناؤ پیدا کیا تو عبداللہ کو بیوی کے سامنے ماں کو شوخ رنگ کے کپڑوں میں دیکھ کر شرم سی محسوس ہوتی ، ادھر ماں تھی کہ روز بروز زیادہ سے زیادہ بننے سنورنے میں لگی رہتی - شگفتہ سالن پکا کر فارغ ہوتی تو وہ اٹھ کر بہت سا گھی ڈال کر حلوہ بنا لیتی - عبداللہ دونوں چیزیں کھاتا اور وفاداری بشرط استواری کے اصول پر دونوں کی تعریف کرتا -

فضا میں دو رنگین غبارے بلند سے بلند تر ہونے کی جستجو میں تھے لیکن ایک کی گیس نے تو بہر حال ختم ہونا ہی تھا -

" ماں یہ تم ہر وقت سرخ جوڑا کیوں پہنے پھرتی ہو " بات منہ سے نکالنے کے بعد عبداللہ کو احساس ہوا کہ اسے یہ نہ کہنا چاہیئے تھا دراصل دونوں میں رنگوں کے اس میچ سے وہ اکتا چکا تھا ماں کا چہرہ سرخ ہوا - پھر زرد اور پھر سیاہ - وہ خاموشی سے کمرہ میں گئی اور بیوگی کے ابتدائی ایام کے میلے کپڑے پہن لیے - یہ اس نے خاوند کی یادیں سنبھال رکھے تھے لیکن وقت انہیں آہستہ آہستہ نئے کپڑوں کی تہوں کے نیچے کرتا گیا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ ان کے وجود کو فراموش کر بیٹھی لیکن زندگی کا سفر آج اسے پھر ان کپڑوں کے پاس لے آیا تھا - اس کی زندگی کی قوس اپنے دائرہ کی تکمیل کر چکی تھی -

شگفتہ کو اس نے قبر پختہ کرانے اور کتبہ کے خرچ کا تخمینہ بتایا تو وہ اسے دیکھتی رہ گئی - ماں کے کفن دفن ، قلوں ، ہر جمعرات کے ختم اور ایسے ہی دیگر مذہبی اخراجات پر خاصہ خرچ آ

چکا تھا - ادھر کئی رشتہ دار دسویں تک گھر میں رہے ۔ ماں تو عبداللہ کی مری تھی ۔ رشتہ داروں کو تو اچھا کھانا چاہیئے ۔ جب نقدی ختم ہو کر پرائز بونڈ بیچنے کی نوبت آئی تو شگفتہ نے بولنا شروع کیا اور ابھی چالیسویں کا سب سے بڑا خرچ باقی تھا برادری کے لیے دیگیں، مولوی صاحب کے لیے جوڑا ۔ قبر پر بیٹھ کر تلاوت کرنے والے کے لیے پیسے اور اسی طرح کے چھوٹے موٹے اخراجات ۔

ماں کو علاقہ کے چھوٹے قبرستان میں دفن کیا گیا تھا ۔ یہ شاملات کی زمین تھی جو پہلے جوہڑ ہوتی تھی ۔ پھر گوجر اپنی زمینیں بیچ کر زیادہ بہتر علاقوں میں چلے گئے تو یہ جوہڑ خشک ہو گیا اور پھر کسی نے وہاں پہلی قبر بنا دی اور یوں چالیس پچاس قبروں کا چھوٹا سا قبرستان بن گیا ۔ لیکن قبریں بنانے والوں نے جوہڑ کا نشیب پُر کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی ۔ چنانچہ ہر بارش میں پانی جمع ہو جاتا ۔ اس لیے وہاں صرف پختہ قبر ہی بچ سکتی تھی اور اسی لیے عبداللہ اب تین چار سو کا اور خرچ کرنے کو تیار تھا ۔

" دیکھیں یوں کرتے ہیں " شگفتہ نے صلاح دی " چالیسواں ہو لے پھر دو تین ماہ میں پیسے بچا کر قبر پکی بنوالیں گے " ۔

لیکن یہ معاملہ ٹلتا گیا ۔ تین ماہ بعد اس کی سالی کی شادی آ گئی ۔ وہاں خاصہ خرچ ہو گیا ، پھر اس کے سالے کو قرض کی ضرورت پڑ گئی ۔ اُسے پیسے دینے پڑے ، پھر شگفتہ بیمار ہو گئی ۔ پھر سال بعد اسے دوبئی جانے کا موقع مل گیا ۔ اس سلسلہ میں خاصہ قرضہ لیا جسے اس کی بھیجی ہوئی رقم سے شگفتہ نے اُتارا ۔ پھر شگفتہ نے پیسے جمع کر کے اور پہلا مکان بیچ کر ایک نیا مکان خرید لیا اور جب وہ کئی سال بعد بہت کچھ کما کر لوٹا تو اسے نشیب میں ماں کی کچی قبر کا خیال آیا ۔ جب وہ اپنے پہلے محلّہ میں واپس آیا تو وہ جگہ پہچانی نہ جاتی تھی ۔ کسی وزیر کے رشتہ دار نے قبرستان پر دوکانیں تعمیر کر دی تھیں ۔ جہاں سودا لینے والوں کی خوب بھیڑ تھی ۔ ماں کی قبر کا نام و نشان تک باقی نہ تھا ۔

آئینہ

..... اس نے آئینہ فرش پر دے مارا

اس کے لبوں سے ایک ایسی آواز نکلی جس میں بیک وقت دہشت اور کراہت پوشیدہ تھی۔" یہ...... یہ ...... یہ...... یہ میں ہوں ؟" اس نے شکستہ آئینے کے ٹکڑوں میں جیسے دوبارہ جھانک کر تعجب کے ساتھ خود سے سوال کیا ۔" میں ؟" پھر وہ اوندھی لیٹی تکیے میں منہ دبائے رو رہی تھی ۔ وہ کافی دیر تک سوتی رہی اور جب روتے روتے نڈھال سی ہو گئی اور سسکیاں لیتے لیتے گلے میں بھی درد ہونے لگا تو وہ بے دم سی آنکھیں موندے پڑی رہی اور اسی حالت میں سو گئی ۔ اس نے بڑا سندر سپنا دیکھا ۔ وہ خود کو ہلکی پھلکی سی محسوس کر رہی تھی ایسے ہی جیسے وہ کوئی سبک خیال ہو اور ایک گیت کی دھن کی مانند وہ ہوا کے دوش پہ رقصاں رقصاں جا رہی تھی ۔ پھر اس نے سامنے ایک مرمریں قصر دیکھا ۔ وہ عالمِ تحیّر میں کسی پرندکی طرح اس کی طرف محوِ پرواز رہی جب قریب پہنچی تو اسے معلوم ہوا کہ یہ دودھیا بادلوں سے بنا ہوا تھا جیسے ہی وہ اس کے قریب آئی اس کے دریچے وا ہو گئے۔

اس نے دریچہ میں سے اندر جھانک کر دیکھا اور کسی پردہ کی طرح وہیں لہرا کر رہ گئی ۔ سامنے ایک خوبصورت کمرے میں ایک لڑکی تھی ۔ بے حد خوبصورت ، خیال سے بھی زیادہ حسین اور خواب سے زیادہ دل کش ۔ ہاں ! وہ واقعی حسین تھی ۔ چمپئی رنگ ، لمبے بال بھرے بھرے لب ، سبھی کچھ اس جیسا تھا بلکہ اس کے بالائی لب پہ ننھا سا تل بھی تھا ۔ وہ حیران سی اسے کھڑی دیکھ رہی تھی ۔ سرِ مو فرق بھی تو نہ تھا ۔ بالکل ایسے جیسے وہ خود اپنے عکس کو مختلف لباس میں دیکھ رہی تھی ۔ پاؤں کی مدور ایڑیوں سے لے کر مدھ ماتی آنکھوں کی چمک تک وہ اسی کا تو عکس تھی ۔ اس کے بال تیز ہوا

کے جھونکوں سے لہرا رہے تھے۔ اس کا سفید لبادہ بھی اڑ رہا تھا اور کھلے بازوؤں میں سے اس کی کلائیاں موٹی شمعوں کی طرح دمک رہی تھیں..... اتنے میں ایک خوبصورت نوجوان آیا۔ بالکل شہزادہ سا۔ لڑکی کو شاید اس کا انتظار تھا۔ وہ دونوں بغل گیر ہو گئے ___ اور وہ ___ اور وہ ___

آنکھ کھلی تو کافی دیر تک تو اُسے سمجھ ہی نہ آیا کہ وہ کہاں ہے، وہ پُراسرار قصر ___ کمرے کے اجنبی ماحول میں اس کی ہم شکل لڑکی۔ وہ کافی دیر تک چھت پر نظریں جمائے ایک چھپکلی کو دیکھتی رہی۔ آج سے پہلے اسے چھپکلیوں سے سخت گھن آتی تھی۔ ان کی گول گول آنکھیں، زردی مائل جسم اور باریک نوکیلی زبان ___ یہ سب کچھ دیکھ کر اس کے جسم میں کراہت سے جھرجھری سی آ جاتی۔ مگر اب وہ خود کو ایک چھپکلی سی محسوس کرتے ہوئے اسے دلچسپی سے دیکھ رہی تھی جیسے وہ مدتوں کی بچھڑی سہیلی ہو مگر اس کی شکل نہ پہچانی جا رہی ہو۔

رونے اور اس کے بعد سو جانے سے اس کی طبیعت قدرے ہلکی سی ہو گئی تھی۔ اب جو بستر سے اٹھی تو سامنے فرش پر اسے آئینے کے ٹکڑے نظر آئے۔ ایک دم ٹھٹھک سی گئی "یہ ٹکڑے ___؟" اور پھر اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ وہ ایک دم بھاگ کر دوسرے کمرے میں گئی اور ڈریسنگ ٹیبل پر بیٹھ گئی۔ اس کا عکس اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ ہاں وہی چمپئی رنگت تھی مگر وہ لانبے بال کہاں تھے۔ اس نے بے بسی سے ان پر ہاتھ پھیرا اور اسے اب ان میں وہ ملائمت نہ محسوس ہو سکی جس سے کنگھی کرتے وقت وہ لطف اندوز ہونے کی عادی تھی۔ یہ بال عجیب طرح روکھے پھیکے تھے۔ جیسے کسی مردہ عورت کے بے جان بال ہوں۔ چہرہ پر گھاؤ کا ایک گہرا نشان تھا جو آدھے سر سے شروع ہو کر گال تک چلا گیا تھا۔ اس نے بے بسی سے اس نشان پر انگلی پھیری۔ ایسا ہی نشان کسی فلم میں اس نے ویلن کے گال پر دیکھا تھا۔ اس کا رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ مگر آنسوؤں کی لکیریں بتا رہی تھیں کہ اب مزید رونے سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ دوسری آنکھ عجیب بے تکے انداز سے ٹیڑھی ہو گئی تھی۔ بے خیالی میں اس نے انگلی سے گال کے اس حصے کو چھوا جہاں ہنستے وقت ایک ننھا سا گڑھا پڑتا تھا اور اب انگلی زخم کے نشان میں دھنس گئی "اف" وہ جیسے کراہ اٹھی "میرے خدا!" اس کا دل

چاہ رہا تھا کہ اس آئینے کو بھی توڑ دے ۔۔ لیکن وہ کتنے آئینے توڑے گی ۔ ایک، دو، تین ۔۔ وہ کب تک آئینہ توڑ سکے گی ۔ اس کے ذہن نے اسے سمجھایا ۔ آئینے توڑے جا سکتے ہیں، لیکن تمسخر اڑانے والی آنکھوں کو اندھا نہیں کیا جا سکتا ۔ وہ اپنے حسن کے مرقد پر ویرانے میں جلتے چراغوں ایسی آنکھوں سے اشک کب تک بہائے گی ؟ ۔۔ کب تک ۔۔ ؟؟ آخر کب تک ؟؟؟ ۔

وہ بڑی دلچسپ پکنک تھی، سبھی سہیلیاں جمع تھیں ۔ خوب ادھم مچایا، خوب شور مچایا ۔ پکنک منانے والے اور لوگ بھی انہیں بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے ۔ نوجوانوں کی کچھ ٹولیاں ادھر ادھر منڈلاتی رہیں مگر یہ سب سے بے پروا اپنے ہی میں مگن رہیں ۔ دوپٹے کمروں میں کس کر باندھ لیے شلواروں کے پائنچے پنڈلیوں تک اڑس لئے اور اس کے بعد جو یہ سب کی سب موڈ میں آئی ہیں تو نظارہ کرنے والوں کے لیے اچھی خاصی سینما سکوپ فلم ہو گئی ۔

واپسی پر جب دو کاروں میں بھری ہوئی لڑکیاں شور مچاتی گزر رہی تھیں تو راہ گیر اڑتی ہوئی گرد سے بے پروا انہیں دیکھتے ہی رہ جاتے ۔

سب سے زیادہ وہ خوش تھی، اور کیوں نہ ہوتی، یہ اسی کی سالگرہ کی تو پکنک تھی ۔ دونوں کاریں آگے پیچھے ریس لگاتے ہوئے اڑی جا رہی تھیں ۔ وہ پچھلی کار میں تھی اور ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر دو اور سہیلیوں کے ساتھ ٹھنسی ہوئی وہ ہاتھ نچا نچا کر اسے اور تیز چلانے کے لیے کہہ رہی تھی ۔ سامنے ایک بیل گاڑی جا رہی تھی ۔ ڈرائیور نے بڑی تیزی سے موڑ کاٹا اور سامنے آتی ہوئی لاری سے کار ٹکرا دی ۔۔

جب تک وہ ہسپتال میں پٹیوں سے جکڑی پڑی رہی اسے سب باتوں کے بارے میں لاعلم رکھا گیا ۔ البتہ اس کے گھر والے اور سہیلیاں اسے دیکھ کر بعض اوقات مغموم سی سرگوشیاں کرتیں تو وہ ایک الجھن میں مبتلا ہو جاتی ۔

اسے کافی مدت کے بعد پتہ چلا کہ ڈرائیور اور انجم حادثہ کا شکار ہو گئیں ۔ شملا بھی اس کی طرح سخت زخمی ہوئی لیکن اس کا چہرہ بچ گیا تھا ۔

گھر آکر بھی اسے آئینہ کے پاس نہ پھٹکنے دیا گیا۔ لیکن کب تک۔ جلد ہی اس نے موقع پاکر آئینہ دیکھ لیا۔ جنگلی گھاس کی طرح بے ترتیب بال، زخم کا گہرا نشان اور ٹیڑھی آنکھ اُسے وحشت زدہ سی گھور رہی تھی۔

—— اور اس نے آئینہ فرش پر دے مارا!

اس واقعے کے بعد سے اس کی زندگی بالکل بدل کر رہ گئی۔ سب گھر والوں سے علیحدہ وہ تمام دن اپنے کمرے میں پلنگ پر اوندھی لیٹی رہتی۔ اس کے کمرے میں کوئی آئینہ نہ تھا۔ اس کی طبیعت میں چڑچڑاہٹ پیدا ہو چکی تھی۔ وہ نگار جو ہر وقت پھول کی طرح کھلی رہتی تھی اب اس کے ہونٹ سختی سے بھینچے رہتے۔ وہ نگار جو چڑیا کی طرح ہر وقت پھدکتی رہتی تھی اب وہ کرسی پر ٹانگیں رکھ کر بہروں اسی طرح سوچ میں ڈوبی رہتی جیسے اس کی آنکھیں دیوار میں کسی انجان چہرے کے نقوش کو دیکھ رہی ہوں۔

نگار کی آواز بڑی اچھی تھی لیکن وہ آخری گیت اپنی سالگرہ کی پکنک پر گا چکی تھی۔ اسے پیانو خریدنے کی بڑی تمنا تھی اور اس کے ڈیڈی نے وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ اگلی سالگرہ پر اُسے پیانو لے دیں گے۔ اب اس کی بگڑی حالت دیکھ کر انہوں نے ایک دن جب کہ وہ حسبِ معمول اپنے کمرہ میں گم سم بیٹھی تھی اس سے کہا ——

"نگار بیٹی!"

"جی!"

"تمہیں پیانو کی بڑی خواہش تھی!"

"جی!"

"کہو تو تمہیں پیانو لے دوں۔"

"کیا فائدہ؟"

"کیوں! کیا اب پیانو نہیں لو گی؟"

"اب لے کر کیا کروں گی؟"

آواز میں عجیب طرح کی بے زاری اور رکھائی تھی۔ اس کے ڈیڈی نے بھی اسے محسوس کیا لیکن وہ خاموش رہے۔ وہ اب بھی اسی طرح ایک ہی سمت میں نگاہیں جمائے، دیوار کو گھورے جا رہی تھی۔

" تھوڑی دیر کے لیے کمرے میں خاموشی رہی پھر ایک دو مرتبہ گلا صاف کرنے کے بعد بولے ـــ

" شاید آ رہا ہے۔"

" تو پھر ـــ ؟"

یہ غیر متوقع جواب سن کر اس کے ڈیڈی ٹھٹھک کر رہ گئے۔ شاہد اس کے بچپن کا منگیتر تھا اور دونوں میں دیوانگی کی حد تک محبت تھی۔ شاہد کراچی میں تھا۔ وہ اس کی آمد کا بڑی بے صبری سے انتظار کر رہی تھی۔ ویسے تو اسے اس کی سالگرہ پر بھی آنا تھا لیکن بعض مجبوریوں کی بنا پر وہ نہ آسکا اور اب جو اس کے آنے کی اطلاع ملی تو سب گھر والے خوش ہوئے کہ شاید اسی کی آمد سے بجھی ہوئی راکھ میں زندگی کی چنگاریاں نئے سرے سے سلگ پڑیں۔

اس کے ڈیڈی کہہ رہے تھے " تمہارے ایکسیڈنٹ کی اطلاع سے وہ بہت پریشان ہوا تھا وہ تو جلد آنا چاہتا تھا لیکن فرم کے کام میں کچھ ایسا الجھا کہ جلد آ نہ سکا۔" وہ یہ سب کہہ رہے تھے اور بدلتے ہوئے تاثرات کے لیے اس کے چہرہ پر بے سود نگاہیں گاڑ رکھی تھیں۔ مگر وہ ایسے ہی لاتعلق بیٹھی تھی جیسے وہ کوئی اہم ترین خبر نہیں بلکہ منڈیوں کے بھاؤ بتا رہے ہوں۔ لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ وہ اپنی دھن میں کہتے گئے ـــ

" آج ہی اس کا خط آیا ہے۔ وہ تمہیں بھی ایک خط لکھ رہا ہے اور اس نے لکھا ہے کہ وہ......"

" ڈیڈی! وہ ایک دم جیسے کسی گہری نیند سے بیدار ہو کر بولی " میں اس سے شادی نہیں کروں گی۔"

ان کا منہ کھلا ، اور پھر شاید وہ اسے بند کرنا ہی بھول گئے ۔

وہ کمرے سے جا چکی تھی !

اس کے بعد گھر بھر نے زور لگا لیا لیکن وہ اپنے کہے ہوئے الفاظ سے نہ پھری ۔

جب شاہد آیا تو وہ اپنے کمرے میں تھی ۔اس نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا ، وہ ویسا ہی خوش شکل تھا ۔کراچی کی آب و ہوا نے اس کی سفید رنگت کو سنولا دیا تھا ۔ بازوؤں پر سیاہ بالوں کی دبیز تہہ تھی اور قمیض کے کھلے گریبان میں بنیان پر سے سینہ کے بال جھانک رہے تھے ۔ اس کی کتنی تمنا تھی کہ وہ اس کے بازو پر سر رکھ کر اس کے سینہ کے بالوں سے کھیلے مگر اب ۔ مگر اب ۔۔۔!

اس نے کھڑکی بند کر دی ۔

کوئی کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا

" نگار !" یہ اس کی ماں تھی ۔" بیٹی نگار ۔۔ شاہد آیا ہے ۔"

" میں اس سے نہیں ملوں گی ۔" وہ رندھے ہوئے گلے میں سے بمشکل یہ الفاظ نکال سکی ۔

" ہائیں ! یہ کیا کہہ رہی ہو ؟"

مگر وہ اب جواب میں خاموش تھی ۔ وہ سب دروازہ پیٹتے رہے ۔ شاہد ۔۔ اس کا شاہد ۔۔ اسے آوازیں دیتا رہا ۔ وہ روتی رہی ۔ دروازے نے نہ کھلنا تھا اور نہ ہی کھلا ۔

اس نے تلخی سے سوچا ۔۔۔ اب وہ کسی فلمی ہیرو کی طرح اکڑ کر لمبے چوڑے مکالمے بولے گا اور کہے گا کہ میں اس چہرے کے باوجود بھی تم سے شادی کروں گا ۔۔۔ ہنھ ! شادی ۔۔۔ مجھے یہ بھیک نہیں چاہیے ۔ مجھے ہمدردی کی اس زکوٰۃ کی تمنا نہیں ۔ بے خیالی میں اس کا ہاتھ چہرے پر زخم کے نشان کو سہلانے لگا ۔

— دروازہ اب بھی پیٹا جا رہا تھا !

شاہد اس کی شکل دیکھے بغیر اور اس سے ملے بغیر ہی چلا گیا تھا۔

اب وہ تھی ، اس کی تنہائیاں اور مزاج کا چڑچڑا پن ۔ گھر کے دو فرد سرگوشیاں کرتے تو وہ سمجھتی کہ یہ اس کی بدصورتی کا تذکرہ کر رہے ہیں بچے ہنستے تو وہ سمجھتی کہ یہ اسی کی بگڑی صورت پر ہنس رہے ہیں ۔ ملازم اس کے پاس نہ پھٹکتے تھے ۔ کیونکہ ذرا ذرا سی بات پر اس کے ہاتھ میں جو کچھ آتا دے مارتی ۔

اپنی تنہائیوں کو ایک خزانہ سمجھے ہوئے وہ ان پر کسی ناگن کی طرح میٹھی پھنکاریں مارتی رہتی ۔

اور پھر ایک دن !

ملازمہ کا بیٹا فضلو اس کے کمرے میں آیا ۔ یہ ماں کے ساتھ آجایا کرتا تھا اور بہت ہی بدصورت تھا ۔ بگڑے نقوش اور سیاہ رنگ پہ برص کے داغ — وہ مضحکہ خیز انداز سے آنکھیں جھپکا جھپکا کر بات کرنے کا عادی تھا ۔ نگار نے پانی منگوایا تھا اور فضلو پانی لے کر آیا تھا ۔

فضلو اس کے لیے کوئی نیا نہ تھا ، مگر آج اسے ایک نیا فضلو معلوم ہو رہا تھا ۔ وہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی اور دس سالہ فضلو گھبرا گیا ، وہ گلاس میز پر رکھ کر جانے لگا

" فضلو ! " اس کی آواز میں بڑی مٹھاس تھی ۔

وہ جاتے رک گیا اور احمقانہ انداز سے اسے آنکھیں جھپکاتے ہوئے تک رہا تھا

" یہاں آؤ " ۔

وہ گھبرا گیا " بی بی جی ! " وہ تیزی سے آنکھیں جھپکا رہا تھا اور داغوں سے بچا ہوا باقی سیاہ چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا ۔ وہ اس سے بہت ڈرتا تھا کیونکہ وہ اس کا بری طرح سے

مذاق اڑایا کرتی تھی۔ جب اس کی سہیلیاں جمع ہوتیں تو ایسے میں فضلو چائے کے ساتھ گویا پیسٹری کا کام کرتا۔

وہ اس کی پریشانی دیکھ کر بولی "ارے بنگلے میں تمہیں کچھ نہیں کہتی" وہ ڈرتا ڈرتا اس کے قریب آگیا۔ وہ اب بھی اسے گھور رہی تھی۔ اس کے مسخ نقوش جیسے نگار کو تسلی دے رہے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام لیا۔ اس کے جسم سے پسینہ، میلے کپڑوں اور سانس کی ملی جلی بو آ رہی تھی۔ مگر وہ اس بو سے بے نیاز ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھامے اسے گھور رہی تھی۔ اس کا گرم گرم سانس اس کے گالوں پر لرز رہا تھا۔ فضلو نے کچھ بولنا چاہا مگر اس کا نچلا ہونٹ اور بھی لٹک کر رہ گیا اور چوڑے چوڑے دو تین دانتوں کی پیلاہٹ اور بھی نمایاں ہوگئی تھی۔

"تمہیں پتہ ہے کہ تم کتنے بدصورت ہو؟" وہ سرگوشی کے انداز میں بولی۔

"جی!" وہ آنکھیں جھپکا کر بولا۔

"تم کتنے بدصورت ہو"؟

"بدصورت! — وہ کیا ہوتا ہے؟"

"اوہ!" وہ جیسے کسی ٹیس کو دبا کر بولی "تم کتنے خوش قسمت ہو!"

"بی بی جی!" وہ ہمدردی سے بولا "کیا بات ہے"۔

"کچھ نہیں! کچھ نہیں" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

درد کا بندھن

اَب تو رونے کی سکت بھی نہ تھی۔ خشک آنکھیں مستقبل کی علامت تھیں جسطرح ان چمکدار آنکھوں کی جوت بجھی تھی ویسے ہی آنے والا زمانہ بجھا دیپ تھا۔ اس نے پلنگ سے سَر اٹھا کر دیکھا تو کمرہ دل کی طرح ویران پایا۔ بستر زندگی کی طرح اجڑا تھا۔ ان کے بغیر زندگی کیا سے کیا بن گئی۔ کسے پتہ تھا کہ وہ یوں اچانک رخصت ہو جائیں گے۔ خوشی اتنی گریزپا ہو گی۔ یہ تو کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ چوڑیوں سے خالی بازو دیکھے۔ جب خاوند کے چارپائی کے پایہ سے یہ چوڑیاں توڑی تھیں تو کانچ کا ایک ٹکڑا کلائی میں چبھ گیا۔ جس سے نکلا ہوا خون اب تک بازو پہ جما تھا۔

" جمیلہ !"

" جی "

" تمہارا بازو تھکتا نہیں ؟"

" نہیں تو "

" واقعی "

" جی "

" تمام رات سر رکھے جو پڑا رہتا ہوں۔"

وہ خاموشی سے دوسرے ہاتھ سے اس کے بالوں میں کنگھی کرتی رہی۔ وہ کسی آسودہ بچّے کی طرح آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔

"میں ساری زندگی نہ تھکوں گی" اس نے سرگوشی کی۔

"یہ بازو ــ یہ بازو ـــ" وہ جیسے دیوانہ ہو کر بولا۔

میرے اللہ! وہ کیسے ہمک کر گود میں آتا تھا۔ چھوٹا سا تھا مگر کتنا شریر اور کتنا بے چین؟ کیسے تتلا تتلا کر باتیں کرتا اور ننھی منی ٹانگوں سے کیسے سارا سارا دن بھاگا پھرتا۔ جب بھی کپڑے بدلے اسے نظر لگ جاتی۔ ایسی پیاری پیاری صورت تھی جس نے بھی دیکھا پیار کیا اور اب ..... اب وہ مر گیا۔ میرا خاور مر گیا، کل بارش بھی تو ہوئی تھی۔ نہ جانے وہ قبر میں کس حال میں ہوگا۔ قبر کی پہلی رات تھی کل میرا خاور، میرا بچہ، میری جان، کاش اس کی جگہ میں مر سکتی مگر ایسا نہیں ہوتا۔ یہ مرنے والے مر جاتے ہیں اور دوسرے کو اپنے غم سے مارتے ہیں اوہ! خاور! خاور!! میں تمہیں کہاں پاؤں؟

"جمیلہ!"

"جی!"

"تم اتنی پیاری کیوں ہو؟"

"ہائے اللہ! کوئی بے وقوف بنانا تو بس آپ سے سیکھے"!

"نہیں میری جمیلہ! سچ کہتا ہوں۔ تم سے پہلے زندگی عجب، بے تکی اور سپاٹ تھی۔ اتنے بڑے گھر میں بس میں اور اماں ـــ ہم دو سوکھے درختوں کی طرح تھے مگر تم تو بہار بن کر آئی ہو"۔

"سچ"

"یہ گھر بھی بدل کر رہ گیا ہے"۔

اوہ خاور! خاور!! خاور!!! تم نے جوانی میں مرنا تھا تو کیوں پیدا ہوئے۔ میں نے تو خدا سے کبھی بھی اپنے لیے کچھ نہ مانگا۔ پہاڑ ایسی زندگی تمہارے لیے گزاری۔ تمہاری زندگی میں اپنی زندگی دیکھی اور تمہارے وجود میں خود کو بڑھتے دیکھا اور اب تم ـــ تم ـــ خدایا!

کیوں بلا لیا اسے ؟ آخر کیوں ؟ چھوٹا سا تو تھا کہا کرتا تھا۔ میں بڑا ہو کر ریل کا انجن بنوں گا ، اس کے ابا کیسے ہنستے اور وہ سارا دن انجن بنا بھاگتا رہتا ۔ چھک چھک چھک کرتا۔ اور اب ، اب انجن کا شور بھی اسے نہ جگا سکے گا۔

" جمیلہ میری جان !

تم نہیں جانتی کہ یہ جدائی کتنی تکلیف دہ ہے۔ جانتا ہوں کہ صرف ایک دو ہفتہ کی بات ہے۔ لیکن دل نہیں مانتا پل پل یوں گزرتا ہے جیسے پہاڑ کی چڑھائی ہو مجھے احساس ہے کہ تم بھی اداس ہو گی لیکن کیا کریں زندگی کے دھندے ہیں دن تو جوں توں مصروفیات میں کٹ ہی جاتا ہے لیکن رات آتی ہے تو تم جیسے سامنے آ کھڑی ہوتی ہو اور یوں تم سے باتوں میں تمام رات بیت جاتی ہے میں کوشش کر رہا ہوں کہ کام جلد از جلد ختم کر کے یہاں سے بھاگوں۔ میں نے تمہارے لیے سوٹ کا کپڑا خریدا ہے اور خوبصورت سے سینڈل بھی۔ دیکھو گی تو پھڑک اٹھو گی - اپنی صحت کی طرف توجہ رکھنا اور اماں کا دھیان رکھنا - وہ پریشان نہ ہوں "

کتنا دھیان رکھتے تھے میرا وہ ، ذرا طبیعت خراب ہوتی۔ ساری رات گود میں سر رکھ کر بیٹھے رہتے ، انہیں کتنا خیال تھا میرا اور میری پسند کو کیسے سمجھتے اور یاد رکھتے تھے۔ نہ جانے میں نے کب ہلکے گلابی رنگ کے سوٹ کی خواہش ظاہر کی تھی۔ مجھے یاد نہ تھا لیکن وہ کراچی سے ویسا ہی سوٹ لائے ۔ پھر اس سوٹ میں مجھے دیکھ کر کیسے خوش ہوئے تھے۔ خاور ، میری جان ! تم نے مجھے جو خوشی دی تمام عمر کا غم بھی اسے زنگ نہ لگا سکے گا۔

" اماں "

" ہوں "

" مجھے ایک بات کا جواب دو "

"کیا؟"

"جمیلہ کو کس نے پسند کیا؟"

"میں نے"

"شادی کس نے کی؟"

"میں نے"

"تو پھر آپ اس سے ناراض کیوں رہتی ہیں۔"

"میں ناراض تو نہیں رہتی"

"تو پھر یہ جھگڑا کیسا رہتا ہے۔"

"مجھے اس کی یہ عادتیں پسند نہیں"

"کیسی عادتیں؟"

"بس ہر وقت بنی ٹھنی گڑیا بنی رہتی ہے۔"

"اماں اس کی شادی کو چند ماہ ہی تو گزرے ہیں یہی دن تو عورتوں کے کھانے پہننے کے ہوتے ہیں۔"

"چند مہینے؛ سال ہو چلا ہے!"

"چلو سال ہی سہی"

"بس مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔"

"ویسے اسے میں نے کہا تھا کہ گھر میں صاف ستھرے کپڑے پہنا کرے، گندے کپڑوں میں کیا اچھی لگے؟"

دو سال بھی تو ساتھ نہ رہ سکے۔ کتنی جلدی یہ وقت گذرا۔ میں بھی کیسی نادان تھی جو ذرا ذرا سی بات پر ان سے روٹھ جاتی اور پھر وہ کیسے پیار سے مناتے، اللہ انکے منانے کا کیسا پیارا طریقہ تھا کہ بعض اوقات تو اسی لیے روٹھ جاتی کہ وہ اسی پیار بھرے طریقہ سے

منائیں !

" جمیلہ "

" جی "

" تمہیں معلوم ہے کہ اس دنیا میں صرف میں اور اماں ہی ہیں۔ انہوں نے بڑی مصیبتوں سے مجھے پڑھایا لکھایا اور غربت کے باوجود میری ہر خواہش پوری کی۔ وہ میرے لیے ماں سے بڑھ کر ماں بنیں کہ باپ کے فرائض بھی ادا کیے۔ سمجھ رہی ہو نا میری بات ؟"

" جی "

" اماں دل کی بُری نہیں۔ نہ ہی وہ تمہیں بُرا سمجھتی ہیں ہوتا یہ ہے کہ بعض اوقات اِدھر اُدھر کی عورتوں کی بے تکی باتوں سے دل میلا ہو جاتا ہے اس لیے تم اِن کی باتوں کا بُرا نہ منایا کرو۔ اگر ان سے کوئی زیادتی ہو بھی جائے تو مجھ پہ غصّہ اتار لیا کرو۔ لیکن آپس کے جھگڑوں سے گھر کا امن برباد نہ کرو۔ تم میری بیوی ہو اور وہ میری ماں۔ میں تم دونوں ہی کو چھوڑ نہیں سکتا کیونکہ تم دونوں سے ہی میری زندگی مکمّل ہوتی ہے۔ اس لیے کوشش کرو کہ گھر کا ماحول خراب نہ ہو۔ وعدہ کرتی ہو ۔"

" جی "

" یہ کم بخت جمیلہ بہت منحوس ہے جس دن سے آئی گھر کی رونق ہی نہ رہی، بناؤ سنگھار کر لیا اور تم سے مٹر مٹر کر باتیں کر لیں۔ کام کی نہ کاج کی ۔"

" اماں ! یہ کیسی باتیں کر رہی ہو ۔"

ٹھیک ہی تو کہتی ہوں ۔"

" نہیں اماں ! یہ نہیں ہو سکتا "

" کیوں نہیں ہو سکتا ۔"

" میں دوسری شادی نہیں کروں گا ۔"

"اتنا عرصہ ہو گیا اور ابھی تک بچہ نہیں ہوا۔"

"نہ ہو۔ مجھے بچوں سے کوئی دلچسپی نہیں"

"تجھے نہ ہو۔ مجھے تو ہے۔"

"کیوں"

"نسل کیسے چلے گی۔"

"مت چلے نسل مجھے نسل چلا کے کیا لینا"

"ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالتے۔ آج تم جوان ہو۔ ہر کوئی تمہیں بیٹی دے سکتا ہے۔ کل کو چاہنے پر بھی کوئی رشتہ نہ دے گا۔"

"اماں مجھے کسی کی بیٹی کی تمنا نہیں۔ نہ ہی مجھے بچوں کی ایسی خواہش ہے کہ میں اپنا گھر برباد کرلوں۔"

"گھر برباد ہوگا کہ آباد۔"

"میرے لیے تو برباد ہی ہوگا۔"

"وہ ساتھ والی کہہ رہی تھی۔"

"اماں" خدا کے لیے!! کبھی پڑوسنوں کی بجائے اپنے دماغ سے بھی سوچا کرو۔"

ڈس گئی ناگن! ڈس گئی۔ میرے بچے کو ڈس گئی۔ نہ یہ منحوس گھر میں آتی نہ میرا بچہ پریشان ہوتا۔ اس کی کڑیل جوانی کو کھا گئی۔ بچپن میں بھی اسے بہت جلد نظر لگ جاتی تھی۔ ایسے تعویذ گھول کر پلائے کہ بس اسی کی مالا جپتا تھا۔ اس کا نام لے کر جیتا تھا اور میں۔ جس نے اسے پالا پوسا، دودھ پلایا، پڑھایا لکھایا اور آدمی بنایا۔ مجھے کیسے بھلا دیا۔ کھا گئی مردار اسے کھا گئی۔ میرے چاند کا گہن بن گئی کیسے اس کی حمایت کرتا تھا وہ، اچھا ہوا مردار اب رانڈ ہو گئی۔ اُف! اُف خدایا! شاید میں پاگل ہوں۔ شاید میں پاگل ہو چکی ہوں۔

"جمیلہ! خدا کے لیے کیوں مجھے پریشان کرتی ہو۔ میں تو روز روز کی اس بک بک

جھک جھک سے تنگ آچکا ہوں۔ تم اَن پڑھ جاہل نہیں ہو جو ان ذرا ذرا سی باتوں کو اتنا طول دیتی ہو۔"

"مگر وہ ....."

"میں اماں کی ناجائز بات کبھی بھی نہیں مانتا لیکن تم بھی ذرا تحمل سے کام لو تو اتنی بات ہی نہ بڑھے"!

"مگر میں تو ....."

"میں جانتا ہوں کہ تم بہو ہو اور وہ ساس اور تم دونوں کا نباہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں انہیں گھر سے نکال باہر کردوں۔"

"مگر میں نے کب کہا کہ انہیں گھر سے نکال دیں۔"

"ہر بیوی یہی چاہتی ہے کہ وہ گھر میں اکیلی ہو۔ اس کا گھر پہ راج ہو اور خاوند کے اگلوں پچھلوں میں سے کوئی نہ ہو۔"

سسکیاں! سسکیاں!!

اس مردار بڑھیا نے ایسے تعویذ کرائے کہ میرے خاور کا دل ہی نہ بھرا۔ اس کی زندگی ہی ختم کردی منحوس بڑھیا نے — اگر بیٹے سے ایسا ہی پیار تھا تو بیاہ رچانے کیوں بھاگی بھاگی آئی تھی مکار! کیسے مجھے پیار کرتی اور واری صدقے جاتی تھی۔ مکار عورت! بیٹے کے منہ پہ میری تعریفیں اور پیچھے سے بھڑکانا۔ اس کے کان بھرنا۔ اُف ماں ساس بن کر ناگن کیوں بن جاتی ہے کیسے بِس گھولتی ہے۔ انہیں کتنا پیار تھا اس کٹنی سے شاید مجھ سے دوگنا، مگر مجھے پھر بھی شکایت کیوں ہو۔ وہ نامکمل پیار ہی میری بہار تھا۔ اوہ! خاور خاور میری جان۔ خاور! کیوں مرگئے تم ..... اُف خدایا!!

"اماں! خدا کے لیے کوئی اور بات کرو!"

"بڑا اچھا رشتہ ....."

"جہنم میں جائے یہ رشتہ، میں کتنی مرتبہ کہوں کہ مجھے دوسری شادی کی ضرورت نہیں۔ جمیلہ بانجھ ہے تو ہوا کرے۔ ساری عمر اولاد نہ ہو مگر میں دوسری شادی نہ کروں گا۔ ہرگز نہیں۔"

کھا گئی! کھا گئی!! منحوس بڑھیا کھا گئی!!

"اوہ، خدایا! کیا اس گھر میں اب کبھی سکون نہ ملے گا۔"

"ڈس گئی ناگن میرے بیٹے کو ڈس گئی۔"

"میں تو روز روز کے ان جھگڑوں سے تنگ آگیا ہوں۔ جی چاہتا ہے کچھ کھا کر سو رہوں۔"

"اُف خدایا!"

دونوں خالی صحن میں آمنے سامنے تھیں۔ خاور کی موت کے بعد پہلی مرتبہ ان کی آنکھیں چار ہو رہی تھیں۔ دونوں ایک ہی بات سوچ رہی تھیں! وہ اسے کتنا چاہتا تھا! جمیلہ کے لیے ساس کا بڑھاپا خاوند کا ماضی تھا جبکہ ماں کے لیے بہو کی جوانی میں بیٹے کی جوانی تھی۔ دونوں ایک ہی غم سے تصویر بنی کھڑی تھیں۔ ایک کو دوسری کے وجود میں اپنا خاور نظر آ رہا تھا اور پھر اسی خاور نے گویا مقناطیس کا کام کیا..... اور وہ دونوں ایک دوسری سے لپٹی رو رہی تھیں۔

محاورے کے معانی

ہر خاندان میں ایسی ہستیاں مل جاتی ہیں جو اس خاندان میں ایک لیجنڈ کی حیثیت اختیار کر جاتی ہیں۔ ہمارے خاندان میں بھی ایک ایسی ہستی ہو گزری ہے جس نے خاندان میں ایک محاورے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ لمبی عمر کا محاورہ، درازیٔ صحت کا محاورہ، بڑھاپے کی دلربائی کا محاورہ۔

کبھی اس کا کچھ نام بھی ہوگا لیکن اب تو وہ صرف بوڑھی اماں تھی اور یا پھر محاورہ! میں نے جب سے ہوش سنبھالا بوڑھی اماں کو ہمیشہ بوڑھی اماں ہی کے روپ میں دیکھا۔ میرے ابا کا بھی یہی کہنا ہے اور خاندان کے دیگر بوڑھوں اور بزرگوں کا بھی یہی بیان تھا۔ اس کی عمر کتنی تھی؟ اس کے بارے میں کوئی شخص بھی وثوق سے کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ خود بوڑھی اماں کو بھی علم نہ تھا اور پھر یہ کوئی آج کے زمانے کی بات تو نہ تھی کہ لوگ پیدائش کی پرچیاں لکھوانے بھاگے پھریں۔ اس سے اس کی عمر کا پوچھا جاتا تو وہ ماتھے پر شکنوں کا جال ڈال کر ایک لمبا چوڑا حساب لگاتی جس میں کچھ ایسے لوگوں کی شادیوں کا ذکر ہوتا۔ جن کے اب نام ہی نام رہ گئے تھے وہ اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ ایک آدھ سیلاب اور زلزلے کا حوالہ دیا جاتا۔ کچھ جنگیں بھی آتی تھیں لیکن یہ ہماری آپ کی جانی پہچانی انگریزی جنگیں نہ تھیں بلکہ یہ وہ جنگیں تھیں جن میں سکھوں کے نام آتے تھے۔ الغرض اس عجیب و غریب تاریخی حساب کا حاصل جمع نکالو تو کہیں غدر کے آس پاس بوڑھی اماں کا کھیلنا کودنا ثابت ہوتا تھا۔ رہا یہ مسئلہ کہ وہ غدر سے کتنے برس ادھر تھا۔ تو اس کا حال تو عمروں کا حساب کتاب رکھنے والا فرشتہ ہی جانے۔ بوڑھی عمر ہرگز نہ جانتی تھی۔ وہ تو برگد کے اس درخت کی مانند تھی جسے

یہ بھی یاد نہ تھا کہ اس کے سایہ میں کتنی براتیں اتریں، کتنے بچے پروان چڑھے، کتنی جوانیوں نے انگڑائی لی اور کتنے جنازوں پر بین ہوا۔ کیا کیا طوفان نہ آئے، کیسے کیسے جھکڑ نہ چلے لیکن برگد کا یہ درخت اپنی چھاؤں کو بانہوں کی مانند پھیلائے قائم رہا۔

بوڑھی اماں جوانی میں کیسی ہوگی یہ تو اب شاید اسے بھی یاد نہ ہوگا کہ وہ پولرائڈ کیمرہ کے دور کی نہیں بلکہ اس زمانہ کی تھی جب کھٹی جوانیوں کے لیے ندی کا پانی آئینہ کا کام کرتا تھا۔ وہ اب سرکش جوانی نہ تھی۔ لیکن بڑھاپے کے باوجود اس میں ایک بانکپن تھا۔ پتلی دبلی اور چاندی کے تار ایسی کومل بوڑھی اماں کے سر پر چاندی ہی چاندی تھی۔ دانت مصنوعی تھے مگر ہونٹ دنداسے سے رنگے ہوتے اور اس کے شفاف ہاتھوں اور سفید بازوؤں اور پنڈلیوں پر نیلی رگوں کا جال۔ جمعہ کے جمعہ جب وہ نہا دھو کر بالوں کو تیل سے چپڑ کر ڈیڑھ بالشت کی اکڑی چٹیا بنا کر دھوپ میں بیٹھتی تو چہرہ تمتا اٹھتا اور پھر اس پر سرمہ کی تحریر، بوڑھی اماں عمر کے اس دور میں تھی جہاں لباس دلربائی کے لیے نہیں پہنتے لیکن وہ لباس کے معاملے میں بھی اچھی خاصی نفاست کا ثبوت دیتی۔ سفید رنگ اس کا پسندیدہ تھا۔ یوں اس پر ہر رنگ کھل جاتا تھا۔ زیوروں سے اُسے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ صرف ناک میں جوانی کی نشانی کے طور پر ہیرے کی ایک کیل ہوتی تھی۔

خاندان میں سے جس کسی کو بھی فوٹو گرافی کا شوق چرایا اس نے بوڑھی ماں کی تصویر ضرور اتاری۔ چہرہ کی جھریوں نے اسے فوٹو جینک بنا دیا تھا۔ چنانچہ جھریوں میں روشنی اور سیاہی کے امتزاج کی نہایت ہی ڈرامائی تصویر تیار ہوتی۔

تو یہ ہے ہماری بوڑھی اماں کا تعارف جو اگرچہ مافوق الفطرت تو نہ تھی لیکن داستانی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ سو بلاشبہ ہمارے خاندان کی داستان بوڑھی ماں تھی۔ داستان کیا وہ تو اب محاورہ بن چکی تھی۔ ایسا محاورہ جو طویل عمر کے معانی میں جگہ جگہ استعمال میں آتا۔

ساس سے نالاں بہو اپنی رازدار سہیلی سے یوں سرگوشی کرتی۔

"یہ کم بخت مرتی بھی تو نہیں۔ بوڑھی اماں بنی بیٹھی ہے۔"

کوئی بیماری سے مرتے مرتے بچ جاتا تو کہا جاتا۔

"یہ بھی بوڑھی اماں سے شرط باندھے بیٹھا ہے"

کسی کو دعا دینی ہوتی تو کہتے۔

"خدا بوڑھی اماں جتنی عمر دے"

یا پھر جل کر یوں کہا جاتا۔

"اس کی عمر بھی بوڑھی اماں کو لگ جائے"

طویل عمری کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے بھی زیادہ اس کے صندوق کا چرچا تھا یہ صندوق پرانے وقتوں کی یادگار تھا اور اگر بوڑھی اماں کی پیدائش سے وابستہ تمام تاریخی واقعات کو ملحوظ رکھا جائے تو یقیناً اس صندوق کو سکھوں کے وقتوں کا ہونا چاہیئے تھا۔ ساگوان کی لکڑی کے اس صندوق پر پیتل کے کوکے لگے تھے۔ ان کوکوں میں پانچ پنکھڑیوں والے پیتل کے پھول لگے تھے۔ صندوق کے چاروں کونوں پر لوہے کے تکونے ٹکڑے جڑے تھے شاید کسی زمانہ میں اس صندوق کا کوئی رنگ بھی ہوگا۔ اب تو وہ سیاہ تھا۔ البتہ مہینے میں ایک بار بوڑھی اماں پیتل کے ان کوکوں کو رگڑ رگڑ کر خوب چمکاتی۔ صندوق کے دونوں سروں پر لوہے کے موٹے موٹے کڑے لگے تھے۔ ایک بہت بڑی اور کم از کم سیر سوا سیر کی کنڈی میں کوئی ڈھائی سیر کا ایک بڑا سیاہ تالا لگا تھا۔ جس کی چابی ریشمی ڈور سے بندھی بوڑھی اماں کے گلے میں لاکٹ کی طرح جھولتی رہتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ صندوق بوڑھی اماں کو جان سے پیارا تھا تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ وہ صندوق کو کبھی بھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیتی۔ اگر گھر سے باہر کہیں جاتی تو واپس آتے ہی سب سے پہلے صندوق کو جا کر دیکھتی اس پر ہاتھ پھیرتی اور تالا ہلا جلا کر یہ اطمینان کرتی کہ کسی نے تالا کھولنے کی تو کوشش نہیں کی۔ رات کو یہ صندوق چارپائی کے نیچے رہتا اس کا بس نہ چلتا ورنہ وہ تو بستر بھی صندوق پر بچھا کر سوتی۔

اس صندوق میں کیا تھا۔ یہ کوئی نہ جانتا تھا۔

اس صندوق میں کیا تھا؟ اس کے بارے میں قیاسات کا طویل سلسلہ تھا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے جو خیال آسکتا تھا۔ وہ یہ تھا کہ اس میں بوڑھی اماں کے مرحوم شوہر کی کوئی یادگار ہوگی۔ ہر چند کہ بوڑھی اماں کی عمر اتنی زیادہ تھی کہ عام عورتوں کی مانند اس کی جوانی، شادی اور شوہر کا تصور بے معنی سا لگتا تھا اس طرح یہ بھی سوچا جاسکتا تھا کہ اس صندوق میں کسی بہت ہی پیارے بچے کی کچھ چیزیں ہوں گی۔ ایسا بچہ جسے اس نے سب سے زیادہ چاہا ہوگا اور اس کی یاد کا زخم ہرا رکھنے کو اس کی نشانیاں سنبھال کر رکھی ہیں۔ لیکن دونوں قیاسات بے بنیاد تھے کیونکہ بوڑھی اماں کی تو کبھی شادی ہی نہ ہوئی تھی اور کبھی ماضی بعید میں شادی ہوئی بھی تو اس کا کوئی شاہد نہ تھا اور آج تک بوڑھی اماں نے اس ضمن میں لب کشائی نہ کی تھی۔ اس کی شادی کیوں نہ ہوئی۔ کیا اس کے لیے کوئی پیغام ہی نہ آیا۔ یا منگنی ہو کر ٹوٹ گئی۔ یا پھر بارات ڈولی لئے بغیر گھر سے اٹھ گئی۔ طلاق ہوئی یا بیوہ بنی؟ الغرض ہر طرح کے قیاسات اور امکانات پر گفتگو ہوسکتی تھی اور ہوتی بھی تھی مگر نتیجہ کچھ نہ نکلتا۔ کیونکہ سچائی تو پیتل کے کوکوں والے صندوق میں بند تھی اور چابی بوڑھی اماں کے گلے میں۔

نوجوان لڑکیاں اسے گھیر کر بیٹھ جاتیں۔

"اچھا تو اماں وہ کیسا تھا؟"

"کون بیٹی؟"

"وہی تمہارا میاں۔"

"ہا ہا ہا۔" وہ ہنس کر بات ٹال دیتی۔

بعض اوقات باتوں باتوں میں گھما پھرا کر اچانک سوال کیا جاتا۔

"اماں تمہیں کوئی یاد نہیں آتا۔؟"

"کون یاد آئے گا مجھے؟"

"یہی تمہارا گھر والا۔"

مگر بوڑھی اماں ہنسی سے یہ وار بھی خالی کر دیتی۔ اس کے ماضی کے بارے میں اس سے قبولوانے

کے لیے جاسوسی قسم کی عورتوں نے کیا کیا جتن نہ کیے۔ لیکن کبھی کسی کے قابو میں نہ آئی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس عمر میں بھی اس کے حواس ذہانت اور زبان کی تیزی برقرار رہی تھی۔ ان سے بڑھ کر یہ کہ اس میں حسِ مزاح بھی تھی جس کے نتیجے میں وہ سب میں مقبول تھی۔ ہر گھر کی خواہش تھی کہ بوڑھی اماں ان کے ساتھ رہے۔ ویسے بعض دل جلوں کا یہ خیال بھی تھا کہ یہ سب اس لیے کیا جاتا تھا کہ جس گھر میں اس کا دم نکلے گا وہی صندوق کی دولت پر بھی قابض ہوگا۔ کیونکہ اب ہر شخص کا یہ پختہ یقین تھا کہ اس میں ہیرے جواہرات اور زیورات کے علاوہ پرانے زمانے کی اشرفیاں اور سونے کی مہریں بھی ہیں۔

اس کے آبا بہت بڑے زمیندار تھے بلکہ بعض روایات کے مطابق ان کا دربار سے بھی تعلق رہا تھا سو ہر ایک کو یقین تھا کہ یہ صندوق لازوال دولت کا امین ہے۔

بوڑھی اماں کو بصد شوق رکھنے کا یہ بھی ایک باعث ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بوڑھی اماں کے دم سے گھر میں عجیب رونق کا احساس ہوتا تھا۔ وہ کبھی کسی پر بوجھ نہ بنتی۔ اپنا ہر کام خود کرتی۔ کسی کے معاملہ میں ٹانگ نہ اڑاتی۔ بنا مانگے کوئی مشورہ نہ دیتی اور سب سے بڑی خوبی یہ کہ لگائی بجھائی نہ کرتی۔ اگر وہ بھی عام بوڑھوں کی مانند بدمزاج چڑچڑی یا شکی ہوتی تو شاید اسے کوئی ڈیوڑھی میں بھی قدم نہ رکھنے دیتا۔ ہر وقت ہنستی کھیلتی بوڑھی اماں، بچوں، نوجوانوں اور بوڑھوں سب میں یکساں مقبول تھی۔ وہ سب سے مذاق کرتی۔ سب اس سے مذاق کرتے خود مذاق کرنے کے ساتھ ساتھ مذاق برداشت بھی کر لیتی تھی۔ حتیٰ کہ اپنی طویل عمر اور امکانی موت کے مذاق پر بھی برا نہ مناتی۔ لیکن۔ اور یہ لیکن بہت بڑی ہے کیونکہ یہ لیکن صندوق سے وابستہ تھی۔ صندوق کے بارے میں وہ ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہ تھی۔ ادھر کسی نے اس کے بارے میں بات کی ادھر اس نے ستے لیے جس گھر کے بارے میں یہ شک ہوا کہ وہاں صندوق کھولنے کی کوشش کی گئی دوبارہ اس گھر میں قدم نہ رکھا۔ بلکہ اگر یہ شک بھی ہو جاتا کہ صندوق کی وجہ سے ان لوگوں نے گھر میں رکھا ہے تو فوراً وہاں سے رخصت ہو جاتی۔

بوڑھی اماں کا اپنا کوئی گھر نہ تھا۔ اس لیے ہر گھر اس کا اپنا گھر تھا۔ لیکن میرے ابا اور امی کو وہ بہت چاہتی تھی۔ اس لیے وہ زیادہ تر ہمارے گھر میں ہی رہتی۔ سال میں دو چار ماہ کے لیے وہ

اِدھر اُدھر دوسرے گھروں میں بھی ہفتہ عشرہ گذارتی اور بالآخر صندوق لیے پھر ہمارے ہاں جاتی۔

خاندان کے کسی شخص کی یاد داشت میں آج تک یہ صندوق کھلا نہ تھا۔

ایک مرتبہ کالج میں چند دوستوں سے باتوں باتوں میں بوڑھی اماں کی داستانی شخصیت اور اس پُراسرار صندوق کا ذکر کر بیٹھا۔ اس بات پر سب دوستوں نے مجھے خوب بے وقوف بنایا کہ وہ ہمارے گھر میں رہتی ہے اور میں نے آج تک صندوق کھولنے کی کوشش ہی نہ کی۔ کالج کی بات تو خیر آئی گئی ہو گئی۔ لیکن میرے ذہن سے جیسے یہ بات چپک کر رہ گئی۔ اور بالآخر میں نے صندوق کھولنے کا ارادہ کر لیا، چنانچہ ایک شب جب مجھے یقین ہو گیا کہ سارا گھر گہری نیند سو رہا ہے تو میں دھڑکتے دل اور کانپتی ٹانگوں کے ساتھ اس کی چارپائی کے نزدیک پہنچا تو بوڑھی اماں منہ کھولے سو رہی تھیں اور منہ سے خراٹوں کی میٹھی میٹھی آواز نکل رہی تھی۔ ایک لمحہ کو میں جھجکا بھی۔ مجھے یہ بڑی گھٹیا حرکت لگی۔ لیکن پھر سوچا دیکھا جائیگا آج اس صندوق کا معمّہ حل ہو جائے۔ چنانچہ میں نے چابی نکالنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میرا ہاتھ ابھی چابی کی ڈوری کو چھوا بھی نہیں تھا کہ سوکھی انگلیاں میرے بازو میں گڑ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اس زور سے بازو میں کاٹا کہ اس کے نقلی دانت باہر نکل آئے۔ درد سے میری چیخ نکل گئی۔ سارا گھر بیدار ہو گیا اور پھر جو نصف شب سے میری بے عزتی شروع ہوئی تو کہیں فجر کے وقت جان بخشی ہوئی۔ بوڑھی اماں تو اسی وقت گھر چھوڑ رہی تھیں لیکن آبا، امی کی منتوں ، خوشامد اور میری معافیوں کے بعد کہیں جا کر وہ رکی۔ لیکن مہینوں اس نے میرے سلام کا جواب نہ دیا۔ مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیتی اور اگر دیکھتی تو ان نظروں سے گویا کہہ رہی ہو "YOU TOO, BRUTUS?" اور پھر انہونی ہو گئی۔

بوڑھی اماں بیمار ہو گئی۔ وہ بوڑھی اماں جو صدیوں سے بیمار نہ ہوئی تھی جب چارپائی پر پڑی تو چند دنوں میں چھوہارا بن گئی۔ اب اس نے صندوق چارپائی کے نیچے سے نکلوا کر اپنے سامنے رکھوا لیا۔ جہاں ہر وقت یہ اسکی نگاہوں کے سامنے رہتا۔ بوڑھی اماں کی بیماری کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور چند دنوں کے اندر اندر ہمارا گھر بھانت بھانت کے رشتہ داروں

سے بھر گیا۔

جب بوڑھی اماں کا دم نکلا تو اس کی نگاہیں صندوق پر جمی تھیں۔کسی بزرگ خاتون نے اس کی آنکھیں بند کیں اور منہ چادر سے ڈھانپ دیا۔صحن میں عورتیں رو رہی تھیں۔مرد بھی کھوئے کھوئے سے تھے۔صدیوں پرانی بوڑھی اماں نہ رہی تھی۔ یہ تصور ہی عجیب تھا۔ وہ اماں جو داستان تھی۔اب اس کا آخری باب ختم ہو گیا تھا۔ وہ جو محاورہ تھی۔اب حرفِ غلط کی طرح تھی۔

کفن دفن تک سب خاموش رہے لیکن قبرستان سے آتے ہی صندوق کے بارے میں باتیں شروع ہوگئیں۔ زیورات اور اشرفیوں کی ہر شخص کو ضرورت ہے سو ہر ایک صندوق کھلنے کا منتظر تھا۔ تمام رشتے دار مرد عورتیں حتیٰ کہ بچے تک سبھی صندوق کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے تھے۔خاموشی کا عالم تھا یوں محسوس ہوتا گویا بوڑھی اماں کی روح حفاظت کے لئے صندوق کے ارد گرد منڈلا رہی ہے۔خاندان کے سب سے بزرگ اور محترم ہمارے دادا تھے۔ سو انہیں کو چابی دی گئی کہ وہ صندوق کھولنے کی سعادت حاصل کریں۔چابی کو چھوتے ہی جیسے ان کے جسم میں کپکپی کی لہر دوڑ گئی وہ صندوق کی طرف آہستہ آہستہ نپے تلے قدموں سے بڑھ رہے تھے۔کانپتے ہاتھوں سے انہوں نے زور لگا کر اس پرانے اور زنگ آلود تالے میں چابی گھمائی۔ تالہ کھلا تو ہم سب سانس روکے بیٹھے تھے۔چوں چوں کی آواز کے ساتھ صندوق سے ڈھکن اٹھا۔ ہم قریب بیٹھے صندوق کے اور پاس ہو گئے اور بیٹھوں نے گردنیں اونچی کر کے دیکھا۔

دادا نے صندوق میں ہاتھ ڈالا اور پھر فوراً یوں کھینچ لیا گویا اندر چھپے سانپ نے ڈس لیا ہو۔انہوں نے خالی ہاتھ باہر نکالا۔ہم سب سانس روکے بیٹھے جیسے سحر زدہ آنکھوں سے سامنے کا منظر دیکھ رہے تھے۔ دادا کا چہرہ عجیب تاثرات کا حامل تھا۔بے یقینی اور حیرت کے ساتھ ساتھ یوں محسوس ہوتا جیسے انہیں اپنی آنکھوں پر شک ہو اور ہاتھ پر

اعتماد نہ رہا ہو۔ انہوں نے دوبارہ صندق میں ہاتھ ڈال کر ہاتھ کو چاروں طرف گھمایا اور پھر ان کا گھومتا ہاتھ تھم گیا اور اس کے ساتھ ہی ہماری دھڑکنیں بھی اب انہوں نے ہاتھ باہر نکالا تو اس میں مردہ سانپ کی طرح دھاگہ بل رہا تھا۔ جس کے ساتھ ایک آدھ سوکھا پھول بھی اٹکا تھا۔ انہوں نے مٹھی کھولی تو سوکھے پھولوں کی کاغذ ایسی مڑی تڑی پتیاں نکل کر فرش پر بکھر گیئں۔ بوڑھی اماں اب بھی ایک محاورہ ہی ہے البتہ اب اس محاورے کے معانی تبدیل ہو چکے ہیں۔

دھرتی کی زنجیر

گدھ نے پروں کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور اب وہ آسمان کی نیلی وسعتوں میں جلتے سورج اور لو کے تپتے جھونکوں میں کٹی پتنگ کی طرح ڈول رہا تھا اس کے بڑے بڑے اور طاقتور پر پوری طرح سے پھیلے تھے۔ ہوا اس کے سینہ کو لطیف انداز میں گدگدا رہی تھی۔ نیچے زمین مٹیالے رنگ کا ایک لامتناہی سلسلہ تھی۔ یہاں سے وہاں تک اس کی تیز نگاہیں نیچے اس کے پروں تلے سے کھسکتی دھرتی پر مرکوز تھیں۔ کہیں بھی شادابی اور ہریالی نہ تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا گویا کسی انجان ہاتھ نے دھرتی کے سب رنگوں کو نچوڑ کر دھوپ میں سوکھنے کے لیے ڈال دیا ہو۔ بانجھ پڑی دھرتی کے پیاس کی شدت سے ہونٹ پپڑا گئے تھے۔ ادھر آسمان کی وسعتوں میں گدھ منڈلا رہا تھا۔ پیاس سے کھلی چونچ اور بھوک سے پھیلی آنکھوں کی پتلیاں نیچے خشک، بنجر اور ویران دھرتی میں حیات اور بقا کا سامان تلاش کر رہی تھیں اور پھر اچانک اس کے پروں میں جیسے برقی رو دوڑ گئی جسم میں تناؤ پیدا ہو گیا اور آنکھوں میں چمک لہرا گئی اس نے اپنے پر سمیٹے اور نیچے کی طرف غوطہ لگایا۔ اس نے خاکی زمین کو تیزی سے اپنی طرف آتے محسوس کیا۔

وہ خاموش ساکت بت بنی تھی۔ سر کے سفید بال بکھرے بکھرے تھے۔ ان مٹھی بھر بالوں کو کس کر چٹیا کی صورت میں گوندھا گیا تھا مگر اتنے تھوڑے بال تھے کہ چٹیا میں ٹھیک طرح سے نہ سمٹ سکتے تھے سو چہرہ کے اِدھر اُدھر منڈلا رہے تھے۔ سانولے چہرہ پر جھریوں کی لکیریں، جوانی شادابی اور توانائی سے عاری چہرہ پر خشک زمین اور بنجر دھرتی ایسی لکیریں پڑی تھیں۔ گہری سیاہ لکیریں، شادابی اور لہلہاہٹ کو ترستی بنجر لکیریں!

اس نے ٹھنڈی سانس بھری یوں کہ جسم میں کپکپاہٹ کی لہر دوڑ گئی، وہ اپنی ماں کو دیکھ رہا تھا اور ماں نظر نہ آنے والی ہریالی کو دیکھ رہی تھی۔ ہریالی جو نہ جیون میں رہی تھی، نہ آنگن میں اور نہ باہر دھرتی میں!

ماں بیٹا دونوں خاموش تھے پھر اکٹھے ہی دونوں کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھیں اور تانبے کے تھال میں دھرے انگارہ جیسے سورج سے جھلس کر رہ گئیں اور پھر جیسے اس تپتے تھال میں دہکتے سرخ انگارے نے ایک سیاہ دھبہ اگل دیا۔ دونوں حیرت زدہ اسے دیکھتے رہے وہ دھبہ بڑا ہوتا گیا اب وہ پراسرار ہیولی کی بجائے ایک واضح صورت اختیار کر چکا تھا۔ گدھ! کھنڈر کا باسی، اجاڑ کا ساتھی اور مردار خور! گدھ! حملہ آور ہونے والے جہاز کی مانند ان کی بستی پر غوطہ زن تھا۔

دونوں اسے خوف سے دیکھتے رہے پھر دونوں کی نظریں جھکیں اور پھر دونوں کی نظریں ملیں۔ دونوں نے آسمان کو دیکھا، گدھ کہیں بیٹھ چکا تھا اور تانبہ کا تھال اپنے انگارے کو لیے پہلے کی طرح نامہربان تھا۔

بیٹے نے ماں کے چہرے کو دیکھا۔ پیاسی دھرتی جیسے سوکھے چہرے پر یہ دو آنکھیں نہیں بلکہ دہکتے الاؤ تھے اس کے برعکس بیٹے کی آنکھیں اس کے وجود کی مانند راکھ کا ڈھیر بن چکی تھیں دونوں کی نظریں ایک مرتبہ پھر ملیں۔ ماں بیٹے کو دیکھ رہی تھی اور بیٹا دھرتی کو! دونوں میں خاموشی کا یہ وقفہ جیسے لُو کے تھپیڑوں کی طرح آگ بکھیر رہا تھا۔ پھر وہ اٹھی اور پانی پینے کے لیے گھڑے سے کٹورا بھرا، چند لمحوں تک وہ پانی بھرے کٹورے میں اپنا عکس دیکھتی رہی کہ اپنے روپ میں بستی کی شادابی اور ہریالی کو تلاش کر رہی تھی، وہ کٹورے کے پانی کو دیکھ رہی تھی کہ پانی کے حوالے سے اس مستقبل کو جو پانی نہ ہونے کے باعث اب بگولوں کی زد میں تھا۔ وہ خاصی دیر تک اسی طرح پانی کا کٹورا لیے کھڑی رہی اور پھر اس نے پیاس بجھانے کی بجائے پانی واپس گھڑے میں الٹ دیا۔
اب جب وہ بولی تو اس کی آواز میں خالی گھڑے جیسی گونج تھی۔

" تو تم نے فیصلہ کر لیا؟

وہ بے بسی سے بولا "ماں ! اب اور کیا کیا جا سکتا ہے"۔

"خیر کیا تو بہت کچھ جا سکتا ہے۔ یہ نہ کہو اور کیا کیا جا سکتا ہے"۔

"ماں تم بات سمجھنے کی کوشش کرو نا"۔

"بیٹا ! پچھلے کئی ماہ سے میں یہی تو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں"۔

بیٹے نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ وہ جیسے اس کی وجود کو نظر انداز کرتے ہوئے خود سے گویا تھی "کمال ہے ! اتنے نکتے مرد ! حد ہو گئی ! اور میرا بیٹا ! میرا اپنا بیٹا بھی نامرد !"

بیٹے کی آنکھوں میں کرب سمٹ آیا مگر وہ خاموش رہا۔ نظریں زمین پر اور پاؤں کا انگوٹھا دائرے بناتا۔ وہ اچانک دیوانہ وار بڑھتی اور اس کی بالوں بھری چوڑی چھاتی ابھرے ابھرے بازوؤں کی مچھلیوں اور چوڑے چوڑے مضبوط ہاتھوں کو اپنے کمزور ہاتھوں میں لے کر ٹٹول کر دبا کر گویا خود اسے ان کے وجود کا احساس کراتے ہوئے بولی۔

"یہ سب کس دن کام آئے گا"۔

بیٹے نے نیلی رگوں سے بھرے ماں کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا تو ان کمزور انگلیوں سے عجب راحت آمیز ٹھنڈک کو اپنے وجود میں سرایت کرتے محسوس کیا۔

"ماں" وہ اسے سمجھانے کے انداز میں بولا "یہ ہاتھ پاؤں کی بات نہیں"۔

"یہ تو ہمت کی بات ہے" وہ جیسے اسے چڑا رہی تھی۔

"نہیں ماں ! یہ کسی دشمن سے ٹانگ سوٹا ٹھونکنے کا معاملہ تو ہے نہیں جو میں ڈر کر بیٹھ دکھ رہا ہوں"۔

"وہ بھی تو دشمن ہی ہے"۔

"دشمن" اس نے تعجب سے ماں کو دیکھا "ماں ! ہم خدا سے مقابلہ نہیں کر سکتے، ہم بدتمیز بچوں کی طرح بادلوں کو کان سے پکڑ کر نہیں لا سکتے"۔ وہ سانس لینے کو رکا اور پھر پوچھا۔

"ماں کیا ہم خود بارش بن سکتے ہیں ؟"

وہ چیخ کر بولی" ہم سب کچھ کر سکتے ہیں، ہم بادل بھی ہیں اور بارش بھی، ہم کیا نہیں کر سکتے"
یوں چیخنے سے جیسے اس کے تنے ہوئے اعصاب کو سکون مل گیا۔ اب اس کے لہجہ میں چیخ نہ تھی بلکہ اعتماد کا ٹھہراؤ اور سکوت کی گمبھیرتا تھی" بیٹا! ہم کسان ہیں، دھرتی کے بیٹے، تم میرے بیٹے نہیں ہو، تم دھرتی کے بیٹے ہو، تمہیں دھرتی نے میرے روپ میں جنم دیا ہے۔ میں نے تو صرف تمہیں پالا ہے۔ کیا تم بزدل بن کر چوروں کے نرغے میں اپنی ماں کو چھوڑ سکتے ہو" وہ خاموش سر جھکائے بیٹھا رہا وہ پھر سرگوشی میں بولی بولو! کیا تم ماں کو چوروں کے نرغہ میں چھوڑ کر جا سکتے ہو؟ وہ اب بھی خاموش تھا وہ اس کی طرف دیکھتی رہی، پہلے سوالیہ انداز میں، پھر تعجب سے اور پھر تاسف سے۔ اور اب جب وہ بولی تو اس کے لہجہ میں صدیوں کی تھکن تھی" میں سمجھ گئی! تم واقعی ان بیٹوں میں سے ہو جو اپنی ماں کو چوروں کے نرغہ میں چھوڑ کر اپنی گٹھڑی اٹھا کر بھاگ نکلتے ہیں"

اس نے تڑپ کر بے بسی سے ماں کو دیکھا، آنکھوں میں کرب مگر ہونٹ بھینچے ہوئے، وہ منہ موڑ کر چلی گئی اور وہ اسی طرح خاموش سر جھکائے بیٹھا رہ گیا وہ ماں کے دکھ کو سمجھتا تھا مگر ماں حالات کی منطق کو نہ سمجھتی تھی اور اس طرح کی گفتگو اب روزمرہ کا معمول تھی۔

تپتے صحن میں دیوار کے سائے تلے خالی چارپائی پر بازوؤں کا تکیہ بنائے وہ لیٹا آسمان کو گھور رہا تھا خشک گرم اور دشمن آسمان، بلندیوں پر لرزتی کسی چیل تک کے وجود سے بھی خالی نامہربان آسمان جس کی نیلاہٹ گرد کی چادر میں ملگجا گئی تھی۔ پچھلے کئی ماہ سے سورج گویا قہر بھری آنکھ بن گیا تھا۔ کھیت سوکھ گئے، کھلیان خالی ہو گئے اور کٹورے کا پانی نیچے اترتے اترتے گویا آنکھ کی پتلی کا نقطہ بن گیا۔ پانی سے لہلہاتا وہ جوہڑ جہاں مویشی تازہ دم ہوتے اور فارغ اوقات بھینسیں طمانیت سے بیٹھی جگالی کرتیں اب محض بدبودار کیچڑ میں تبدیل ہو کر رہ گیا تھا۔ درختوں کے پتے تپ دق کے مریض کا چہرہ بنے اور پھر ایک ایک کر کے گرتے گئے۔ گرتے گئے اور تپتے بگولوں کا موت ناچ انھیں دور دور اڑا کر لے جاتا رہا۔ کچھ یہی حال گاؤں والوں کا تھا کہ ایک ایک کر کے گھر کی ڈال سے گر رہے تھے اور انجان بگولوں میں گھرے دور شہروں میں جا رہے تھے۔ مزدوری کرنے

بوجھ اٹھانے، پیٹ پالنے!

جس دن اقبال نے جانے کا ارادہ کیا تو وہ برس پڑا۔

"شرم کر یار بالے۔ شرم کر۔"

اقبال واقعی شرمسار تھا "یار کیا کروں۔"

"کرنا کیا ہے حالات کا مقابلہ کر"

"حالات میرے تیرے اختیار میں نہیں۔ میں بتا کیا کر سکتا ہوں۔"

"بالے کرنے کو تو بہت کچھ ہے۔ یہاں رہو تو کوئی نہ کوئی صورت بن ہی سکتی ہے۔"

"مگر کیا صورت؟" اقبال اسے جواب طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"دیکھ یار بالے! ہم سب اکٹھے ہی اس مصیبت میں مبتلا ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم سوائے دعا کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن پھر بھی اتنا تو ہے کہ کم از کم ہم سب مل کر رہیں تو ایک دوسرے کا سہارا تو بن سکتے ہیں۔"

"کیسے؟"

"بھئی! اتفاق میں بڑی برکت ہے۔"

"اتفاق میں برکت؟" اقبال بولا "کیا بے تکی بات کی ہے ہم کوئی لڑ رہے ہیں۔"

"میں نے کب کہا کہ ہم لڑ رہے ہیں۔"

پھر ایک دم رک کر بولا "ویسے یار اگر غور کرو تو ہے یہ بھی ایک طرح کی لڑائی!"

"کس طرح؟" اقبال نے پوچھا۔

"خشک سالی کی آفت ہماری دشمن ہے اور ہم سب اس سے مل کر ہی لڑ سکتے ہیں اور اس طرح اسے شکست دے سکتے ہیں۔"

"میں یہ فلسفہ نہیں سمجھتا۔ میں تو سیدھی سی یہ بات جانتا ہوں کہ گھر میں دس جی کھانے والے ہیں۔ میں ان سب کے لیے کہاں سے لاؤں؟"

" اور تو سمجھتا ہے کہ گاؤں چھوڑ دینے سے حالات ٹھیک ہو جائیں گے "۔

" بھائی میرے ! بات گاؤں چھوڑنے کی نہیں بلکہ شہر جا کر روزی کمانے کی ہے "۔

مگر وہ اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے بولا " سن بابے ! زمین ہماری عزت ہے دھرتی ہماری ماں ہے ۔ کیا تم اپنی ماں کو چوروں کے نرغہ میں چھوڑ کر بھاگ سکتے ہو ؟"

" یہ کیا بک رہے ہو "۔

مگر وہ اپنی ہی دھن میں کہے جا رہا تھا " تم صرف اس لیے اپنی ماں کو چوروں کے نرغہ میں چھوڑے جا رہے ہو کہ اس طرح اپنی گٹھڑی بچا سکتے ہو "۔

" نہ جانے تم کیا اول فول بکے جا رہے ہو " وہ چیخ کر بولا ۔

وہ تھکے لہجہ میں بولا " میں کچھ نہیں کہہ رہا بابے ! میں کچھ نہیں کہہ رہا ۔ میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں "۔

جب اس نے یہ تمام گفتگو اپنی ماں کو سنائی تو وہ نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر صرف ایک لفظ بولی " نامرد "۔

لیکن حالات کسی کے بس میں نہ تھے ۔ ہر روز کسی نہ کسی کے شہر چلے جانے کی خبر ملتی ۔ زمین دار نے گڑ کے چاولوں کی دیگ پکا کر جھنڈے والے پیر کے مزار پر چڑھائی ، مسجد میں نمازیوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا اور مولوی صاحب کی دعاؤں میں کہیں زیادہ رقت آ گئی ۔ نمبردار کی بیٹھک میں ٹرانسسٹر پر فلمی گانے سننے والوں کی بھیڑ کائی کی طرح پھٹ گئی باپ نے بیٹی کی شادی اگلے سال تک کے لیے ملتوی کر دی ۔ پہلوان کے اکھاڑے میں جو کبڈی کی ٹیم تیار ہو رہی تھی وہ لوگ اب اکھاڑے میں زور کرنے کی بجائے بے کار بیٹھے باتیں کرتے رہتے اور شام جو اذانوں کا سلسلہ شروع ہوتا تو رات گئے تک جاری رہتا ۔ اس کے بعد تمام رات بلیاں روتیں اور آسمان کی طرف اپنی تھوتھنیاں اٹھا اٹھا کر کتے یوں بھونکتے کہ دل لرز لرز جاتے ۔

وہ صبح سویرے اٹھا اور ویران گلیوں سے گزرتا کھیتوں کو چل دیا ۔ راستے میں جو دو چار

لوگ ملے وہ یوں دبے لہجے میں بات کر رہے تھے گویا کسی جنازے کے ساتھ جا رہے ہوں۔ کھیتوں پر پہنچا تو دھوپ پھیل رہی تھی اور آنے والے گرم اور خشک دن کے آثار ظاہر تھے۔ اس کی زمینیں زیادہ نہ تھیں۔ اس وقت جہاں ہری بھری فصلوں نے جھوم کر اس کا استقبال کرنا تھا اب وہاں پھٹی ہوئی مٹی تھی۔ اس کے نتھنے بھیگی مٹی کی سوندھی مہک کو ترس رہے تھے۔ اس نے ایسے اپنی زمین کو دیکھا جیسے دولہا سرخ جوڑے اور گہنوں کے بغیر اپنی دلہن کو دیکھے۔ یہ کھیت بھی تو اس کی دلہن تھے۔ سبز جوڑا پہنے دھانی آنچل لیے مسکراتی کھلکھلاتی ہریالی کی دلہن، ماتھے پر شبنم کے موتیوں کا جھومر سجائے اور رنگ رنگ میں مہک اور میٹھاس کے وعدے لیے شادابی کی دلہن! ہر محبوب کی طرح وہ بھی اپنی محبوبہ کو خوش لباس دیکھنا چاہتا تھا مگر بے بس تھا کہ اب زمردیں لباس مہیا کرنا اس کے بس میں نہ تھا۔ وہ دیر تک ویران نظروں سے کھیت کو دیکھتا رہا اور جب گرمی ناقابلِ برداشت ہوگئی تو پسینے میں شرابور واپس لوٹا۔

آج اس نے بھی گاؤں چھوڑنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ وہ اب ناامید ہو چکا تھا۔ مایوس تھا اپنے لیے بھی اور اپنی زمین کے لیے بھی، اقبال کا خط آیا تھا۔ وہ شہر میں لاریوں کے اڈے پر سامان اٹھانے کا کام کر رہا تھا اور خاصے پیسے بنا رہا تھا۔ اس نے اسے بھی بلایا تھا لکھا تھا "پندرہ بیس روپے تو کہیں نہیں گئے۔"

"سنا ماں تم نے" وہ جوش میں بولا۔

"کیا لکھا ہے بالے نے۔"

"کیا ہے" وہ لاتعلقی سے بولی۔

"وہ شہر میں لاریوں کے اڈے پر سامان اتارنے کا کام کر رہا ہے۔"

"کسان ہو کر" وہ طنزاً بولی۔

"اوہو! ماں سنو تو۔"

"کہو۔"

"وہ پندرہ بیس روپے روز کے بنا لیتا ہے۔"

"تو؟"

"اس نے مجھے بھی بلایا ہے۔"

"کیوں؟" وہ جیسے سہم کر بولی۔

"ماں میں نے بہت غور کیا ہے۔"

"پھر؟"

"اب حالات ایسے ہو چکے ہیں کہ مجھے جانا ہی پڑے گا۔"

"مگر کیوں؟"

"بارش کا وقت گزرا جا رہا ہے، فصلیں جل چکی ہیں۔ کنویں سوکھ چکے ہیں اگر یہی حال رہا تو کچھ عرصہ بعد پینے کا پانی بھی نہ ملے گا۔"

"نہیں نہیں" وہ جیسے چیخ کر بولی "ہرگز نہیں۔"

"کیا نہیں؟"

"تم نہیں جا سکتے۔"

"ماں" وہ سمجھانے کے انداز میں بولا "ذرا سوچو تو....."

مگر وہ بات کاٹ کر بولی "میں کچھ سوچنا نہیں چاہتی۔ میں تو صرف یہ جانتی ہوں کہ تم پیٹھ دکھا کر جا رہے ہو۔"

"ماں اس میں پیٹھ دکھانے کی کیا بات ہے حالات کا تقاضا ہی یہی ہے۔"

"حالات" وہ نفرت سے بولی۔ "حالات مردوں کے سامنے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ مرد تو خود حالات ہوتے ہیں۔"

یہ ان کی گفتگو کا آغاز تھا مگر انجام نہ تھا۔ ہر روز یہی جھگڑا رہتا۔ ماں اپنے ارادے پر قائم تھی۔ وہ ابھی تک ڈانوا ڈول تھا مگر کب تک؟ ایک دن اس نے گاؤں چھوڑنے کا ارادہ کر ہی لیا تھا اور اسے تعجب ہوا کہ اب ماں نے اسے روکنے کی کوشش نہ کی۔ چہرہ کی لکیریں کچھ زیادہ

ہی گہری ہوگئی تھیں البتہ بے آب آنکھوں میں الاؤ دہک رہے تھے۔

وہ گھر سے چلا تو ذہن میں بگولے رقصاں تھا۔ایک قدم آگے بڑھتا تو دوسرا جیسے پیچھے رہ جاتا۔اس نے جان بوجھ کر وہ راستہ اختیار کیا جو کھیتوں سے ہوکر نہ جاتا تھا۔یہ البتہ طویل تو تھا مگر وہ پیاسے کھیتوں کے پپڑائے لب نہ دیکھ سکتا تھا۔گھر سے نکلتے وقت اس نے کسی کی طرف نہ دیکھا۔نہ اس نے بیلوں کی جوڑی کو دیکھا نہ بیوی کی جانب اور نہ بیٹے کی طرف ماں نہ جانے کہاں غائب ہوگئی تھی۔وہ ان سب کے لیے جا رہا تھا مگر اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ سبھی اس سے ناخوش ہوں۔دیر تک بیٹے کی ریں ریں کانوں میں گونجتی رہی۔ایک دو مرتبہ مڑ کر یوں دیکھا جیسے سوکھے کھیتوں میں سے ماں نے پکارا ہو، مگر نہیں۔خاموشی تھی۔جلتی دھوپ تھی اور پیاسے کھیت تھے۔

سڑک کے کنارے سنگ میل کے سہارے بیٹھا وہ شہر جانے والی بس کا انتظار کر رہا تھا کئی بسیں آئیں مگر سواریوں سے چھلکتی بسوں نے اس ایک کے لیے رکنا مناسب نہ سمجھا اور اسے تپش میں لرزاں کھیت اور مرجھائے درخت نظر آ رہے تھے وہ بیٹھا رہا۔سوچتا رہا۔ذہن بھی جیسے تپتی ہوئی خشک پیاسی زمین بن چکا تھا۔پھر نہ جانے اچانک کیا ہوا جیسے ذہن میں نرم نرم پھوار شروع ہوگئی اور اعصاب ذہن کی سوندھی مہک کی تال پہ دھمال ڈالنے لگے۔

اس کے سامنے ایک بس رکی اور کلینر اسے متوقع نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"او گرایاں چلنا نئیں"

کسی اور قوت نے جیسے اس کے سر کو انکار میں ہلا دیا۔ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھیر دی اور آنکھوں میں دیپ روشن کر دیئے۔وہ دیوانہ وار زمین کی طرف بھاگا جا رہا تھا اس کے قدموں کی دھمک سے ٹنڈ منڈ درختوں پہ بیٹھے گدھ اڑتے گئے۔جب پھولی سانسوں سے وہ زمین پہ پہنچا تو وہاں ماں بیٹھی تھی۔اس کی واپسی پہ اسے کوئی تعجب نہ تھا۔وہ پُر یقین لہجہ میں بولی۔

"مجھے معلوم تھا کہ تم یہیں آؤ گے۔"

حجرۂ ہفت بلا

پانچویں کھونٹ

گول سے آنکھ کی تپلی سکڑی تو متی رنگ ڈورے نمایاں ہو گئے، یوں کہ پتلی کی سیاہی اور بھی سیاہ ہو گئی۔ آنکھ کے گرد ایک حلقہ سمٹ کر قدرے پھیل گیا۔ پتلی سینکڑوں فٹ نشیب پر مرکوز تھی۔ پتلی مزید سکڑ کر پھیلی — ناقابلِ یقین — نشیب میں حرکت نظر آ رہی تھی — ناممکن! پتلی مزید سکڑ کر پھیلی — واقعی، حرکت تھی وہاں — زندگی کی حرکت ؟ سایوں کا کھیل ؟؟ بھوکی نگاہ کا ناٹک ؟؟؟

پرواز خود کو سمیٹ کر تیر بنا فاصلہ کم کرتا جا رہا تھا!

بھوری بدرنگ زمین پر شور برص کے داغوں کی مانند تھا — تاحد نگاہ جلی دھرتی نے گویا لاوے سے غسل کیا، یوں کہ گھاس بھی اگتی تو بدرنگ بالوں کا رنگ لیے، گھاس کے علاوہ اور کچھ تھا بھی نہیں، یا پھر کانٹے اس بدرنگ بالوں کے رنگ والی گھاس میں دبکے ہوئے، ایسے کانٹے کو چبھ جانے پر خون کی گردش میں شامل ہو جائیں۔ اچانک ہی یہ بے رنگ منظر سیاہ پتھروں، چٹانوں اور ٹیلوں کی قوس پر ختم ہو گیا۔ کوڑھیلی زمین کی یک رنگ بدرنگی کے بعد سیاہ پتھریوں نظر آتے گویا رات نے پتھروں کا جنم لے لیا۔ میلوں پھیلی سیاہ قوس، قوس در قوس سفر کرتی، دائرہ در دائرہ پھیلی تھی۔ میلوں لمبا سیاہ پتھر کا دائرہ دامن میں بستی لیے تھا۔ پرواز کو بلندی سے یہ دائرہ ایسا سیاہ ناگ نظر آ رہا تھا جس نے دم منہ میں لے رکھی ہو اور اس میں وہ بستی آباد تھی جو اب آباد نہ رہی تھی۔

مسافر وحشتناک سفر سے اکتا چکا تھا — تھکن — بے امان تھکن — جسم کا جوڑ جوڑ احتجاج کر رہا تھا۔ پاؤں سو چکے تھے اور اب آنکھیں سونا چاہتی تھیں۔ مگر جانتا تھا کہ اس شور زمین پر نیند آخری نیند ہو گی۔ اگرچہ سارا وجود اب پتھر تھا مگر وہ چلنے پر مجبور تھا کہ عافیت سفر میں تھی۔ تھکن کی

ذہن پر دھند چھا چکی تھی — اعصاب کچے دھاگوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ جبکہ آنکھ صرف قدموں تک دیکھ پاتی۔

اچانک سامنے آگ اگلتی دھوپ کے بخارات میں سیاہ حصار مرتعش نظر آیا۔ یامنظر العجائب!
زندگی آنکھوں میں چمک بن کر لہرا گئی۔ پاؤں بیدار ہو گئے تو بیدار ہوتی ٹانگوں کی چیونٹیوں کو اعصاب کے دھاگوں کی جانب دوڑتے محسوس کیا۔ مسکراہٹ سے تکلیف کا احساس ہوا تو یاد آیا کہ شوکتی ہواؤں اور تپتی پیاس نے ہونٹ خشک کر کے ان میں لکیریں ڈال دی ہیں۔ اس نے کھردرے ہاتھوں سے جلتی آنکھیں ملیں۔ واقعی سامنے سیاہ پتھر تپش کے مرغولوں میں جھول رہے تھے، ڈول رہے تھے اور سر ہلا ہلا کر اپنی طرف بلا رہے تھے۔

پردار اب پتھروں پر سیاہ نقطہ کی مانند تھا۔

یہ سیاہ پتھر اس دنیا کے نہ معلوم ہوتے تھے۔ شاید کبھی آسمان سے پتھر برسے تھے کہ شہاب ثاقب دائرہ در دائرہ پھینکے گئے تھے۔

وہ پتھر، چٹانیں اور ٹیلے جو دور سے سینہ تانے کھڑے پہرہ دے رہے تھے، قریب پہنچنے پر مسافر کو راستہ دے دیتے ہیں۔ آگ میں پتے پتھروں کے درمیان سے گذرتے وقت گرمی کے بخارات مسافر کا دور تک ساتھ دیتے ہیں۔ سینہ تانے سیاہ پتھروں میں سے ٹیڑھے میڑھے راستوں پر چلتے مسافر کی چال میں اب تیزی پیدا ہو چکی تھی کہ ٹھنڈا پانی، خوشگوار ہوا، گرم کھانا اور آرام دہ بستر ساتھ ساتھ چلتے محسوس ہو رہے تھے۔ چنانچہ وہ عمودی چٹانوں کی خشک تپش کو بھول گیا اور یہ بھی کہ پر پیکیا راستہ ہے جو کسی مقام پر بھی خط مستقیم میں نہیں۔ راستہ کیا تھا سانپ کا لہریا تھا۔

پردار اب سب سے اونچے پتھر کی سیاہی پہ دیدبان بنا تھا۔

یامنظر العجائب! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں، میلوں پھیلی بستی، بستی نہ تھی بت کدہ تھی۔ ہر طرف بت — بت ہی بت! اور وہ حیرت زدہ بت بنا ان بتوں کے درمیان کھڑا تھا۔
حیرت نے یوں غلبہ پایا کہ وقت تھم گیا۔ وہ پلک جھپکنے کے دو لمحوں کے درمیان بت بنا رہا تھا کہ

صدیوں کی دو انگڑائیوں کے درمیان! — یہ کہنا مشکل تھا، لیکن جب پلکیں جھپکا، پتلیاں پھیلاکر دیکھا تو منظر نہ بدلا تھا البتہ سورج نے جگہ تبدیل کرلی تھی اور بتوں کے قدموں سے ان کے سائے کھسکتے جارہے تھے۔ اس نے احتیاط سے یوں قدم اٹھایا کہ کہیں ٹوٹ نہ جائے۔ مگر نہیں وہ بت نہ بنا تھا، قدم مکمل کرکے اسے اپنے زندہ ہونے کا یقین آگیا۔

یوں محسوس ہوتا کہ قہر کے کسی لمحہ نے انہیں پتھروں میں تبدیل کردیا تھا کہ جو جس حرکت میں تھا اسی میں منجمد ہوکر رہ گیا۔ دروازہ پر دستک دیتا ہاتھ کنڈی تک نہ پہنچ پایا تھا۔ ہونٹ ہلے مگر مسکراہٹ کی خوشی حاصل نہ کرپائے۔ آنکھوں میں محبت کی چمک پتھر میں تبدیل ہوگئی۔ پتھریلی زلفوں میں کنگھی جامد تھی۔ آئینہ میں حسین صورت منعکس تھی مگر آنکھیں اپنے حسن کے نشہ سے سرشار نہ ہوسکتی تھیں۔ پتھر کے سینے پر پتھر کے ہونٹ تھے۔ بچہ پتھر بن کر بھی روئے جارہا تھا مگر آنسو آنکھوں میں کنکر کی مانند تھے غسل کے لیے پانی بھرا برتن اٹھا رہ گیا۔ چولہے میں پتھر کے شعلے تھے تو ہنڈیا میں بھی پتھر۔ کھلاڑی جست لگانے کو تھا۔ مسکراتی دوشیزہ محبوب کو میٹھی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی اور ہنستا محبوب بازو پھیلائے، قدم اٹھانے کو تھا۔ عورت لڑ رہی تھی مگر پتھریلے ہونٹوں میں غصیلی آواز نہ تھی۔ پتھر کے حوض کی پتھریلی لہروں پر پتھریلے پرندے تھے۔

یا منظر العجائب! حرکت اور جمود کا یہ بت خانہ میلوں پھیلا تھا۔ انسان شجر حجر چرند پرند پانی سب پتھر! سیاہ انگشتری کے دائرہ میں چمکتی سفید پتھریلی مخلوق! سیاہ پتھروں سے شوکتی ہوا میدان میں بگولے بن کر رقص کرتی مگر کوئی بھی اس سے بچنے کی ضرورت محسوس نہ کر رہا تھا۔ اوپر سورج کی بے رحم آنکھ نیچے پھیلا میدان اور سیاہ پتھروں بیچ پتھریلی مخلوق —! یہ دیکھ ' مسافر اگر خوف و استعجاب سے پاگل نہ ہوا تو صرف اس لیے کہ طویل سفر میں وہ بہت کچھ دیکھ چکا تھا، ہرچند کہ یہ نہ دیکھا تھا۔

پردار کی مٹی رنگ آنکھ کی پتلی میں مسافر کی تصویر متحرک تھی!

اسے حرکت نظر آئی، وہ کہ پتھریلی مخلوق کے ڈر کو دل سے نکالنے میں کامیاب ہوچکا تھا۔ متحرک انسان کو دیکھا کہ دہشت زدہ ہوگیا۔ اس نے چھپنا چاہا۔ نہ جانے یہ کون ہے۔ یہاں

کیوں پھر رہا ہے اور کیا کرتا پھر رہا ہے، مگر پھر سوچا، میں یہاں کیوں پھر رہا ہوں اور کیا کرتا پھر رہا ہوں۔ ظاہر ہے میری طرح یہ بھی مسافر ہی ہو سکتا ہے۔

وہ سال خوردہ اندھا تھا مگر دور سے ہی بولا "کون ہے؟" شوکتی ہوائیں اس کی آواز سیاہ پتھروں میں لے گئیں اور پھر پتھر پوچھنے لگے کون ہے؟ کون ہے؟ کون ہے؟

"راہ بھٹکے ہو گے؟" اس نے قریب آ کر پوچھا۔

"ہاں بابا"

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا "یہاں صرف راہ بھول کر ہی آیا جا سکتا ہے"

"کیا مطلب؟"

بوڑھا پتھریلی مخلوق کی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"مطلب؟" وہ کھوکھلی ہنسی ہنسا "مطلب کیا؟" قدرے توقف سے بولا "انسانوں کے پاس انسان ہی آتے ہیں۔ ہیں نا؟"

"ہاں"

"بس تو پھر مطلب صاف ہے"

"بابا! یہ سب کیا ہے؟"

"یہ بت؟"

"ہاں"

"یہ بت نہیں"

"تو"

"یہ تو انسان ہیں"

"کیسے؟"

"بھئی! اگر یہ غصہ میں چیخ نہیں سکتے، گالی نہیں دے سکتے منہ نہیں نوچ سکتے، آنکھیں

نہیں نوچ سکتے، گردن نہیں کاٹ سکتے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ یہ انسان نہیں۔ صرف حرکت ہی تو نہیں کر سکتے" وہ رک کر بولا" اس کا حسن دیکھ رہے ہو نا؟"

"ہاں"

"یہ سب کی معبود تھی اور اب بھی ہے یہ اب بھی مجھے بلا سکتی ہے۔"

اس نے سوچا بڈھا تنہائی میں پاگل ہو چکا ہے اس لیے خاموش رہا۔ ان دونوں کی چاپ سے پتھریلا راستہ گونج رہا تھا، جہاں جھاڑی پھول اور توڑنے والا ہاتھ پتھر ہو چکے تھے۔ بوڑھا ایک گھر کے پاس سے گزرتے ہوئے رکے بغیر بولا "کبھی یہ میرا گھر تھا۔" دروازہ کے باہر پتھریلا بچہ کھیل رہا تھا، پیچھے کھڑی لڑکی نے آواز دینے کو منہ کھول رکھا تھا۔ اندر صحن میں پتھریلی بیوی، پتھر رسی پر پتھریلے کپڑے ڈال رہی تھی۔

وہ ایک اونچی جگہ پر آ گئے! کنگرہ پر بیٹھا پہرہ دار گردن ٹیڑھی کئے انہیں آتے دیکھ رہا تھا۔ بلندی اور تنہائی کا پہرہ دار بنا!

بوڑھا بولا "تم کئی مرتبہ پوچھ چکے ہو کہ یہ سب کیوں اور کیسے ہوا — تو یہ ہے وہ شخص جس کی وجہ سے یہ سب ہوا"

اس نے سوکھی انگلی سے پتھریلے مرد کی طرف اشارہ کیا جس کے ہونٹوں پر عجب پر اسرار مسکراہٹ منجمد تھی۔ وہ عام مردوں جیسا ہی تھا البتہ نقوش میں خاص قسم کی کشش تھی۔ چہرے پر ڈوبتے سورج کی روشنی موجیں مار رہی تھی جس سے مسکراہٹ اور بھی دلکش ہو گئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا پتھر میں مسکراہٹ کا گلاب مہک اٹھا ہے۔ مسافر نے نظریں اٹھائیں تو پتھریلی آنکھوں کو اپنی جانب پایا۔ ان میں ایسی چمک تھی گویا ان میں شمعیں روشن ہوں۔ اس کے دونوں ہاتھ برکت دینے کے انداز میں اٹھے تھے۔ ڈوبتے سورج کی کرنوں نے پوروں میں نور بھر دیا تھا۔ جب کہ ہتھیلی پر زندگی اور مقدر کی لکیریں جگمگا رہی تھیں۔ مرد کے شانت چہرے پر خوشی کی تحریر تھی — ایسی خوشی جس کا تجربہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ وہ خوشی جو صرف امر ہو جانے والوں کو ملتی

ہے اور اسی لیے وہ پتھر کا ہو کر بھی دھڑکتا محسوس ہوتا تھا۔

اندھے اور بت دونوں کی آنکھیں مسافر کو دیکھ رہی تھیں۔

"کیا ہوا تھا"، بالآخر مسافر نے دریافت کیا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کیسے سمجھاؤں؟"

اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ پھر تھراتی آواز میں کہا "ہم روشنی سے بہت خوفزدہ تھے۔"

"روشنی سے؟"

بوڑھا غصے سے بولا "ہاں ہاں روشنی سے! روشنی بہت بری چیز ہے۔ یہ ہم اپنے بزرگوں سے اور وہ اپنے پرکھوں سے سنتے آئے تھے۔"

"تعجب ہے۔"

بوڑھا جھنجھلا کر بولا "تعجب کی کوئی بات نہیں۔ بزرگ ہمیشہ ٹھیک کہا کرتے ہیں اور ہم نے ان کی نافرمانی کی بہت بڑی سزا پائی" وہ خاموش ہو کر جیسے اپنی بے نور آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا "روشنی سے خوف بستی پر تاریک شامیانے کی مانند پھیلا تھا اور یہ اتنا قدیم تھا کہ اس میں مکڑی کے جالوں کی ایک اور چھت بن چکی تھی۔ جالے ہی جالے، مکڑیاں ہی مکڑیاں، ان گنت 'لاتعداد' ہم سب ان مکڑیوں جالوں اور ان پر تنے سیاہ سائبان کے نیچے خوش اور مطمئن زندگی بسر کر رہے تھے۔ نہ صرف ہم بلکہ ہم سے پہلے ہمارے بزرگ، ان سے پہلے ان کے آبا، اور پھر ان سے پہلے ان کے پرکھے۔ ہم ایک پراسرار مگر خوشگوار دھندلکے میں سانس لیتے اور یہ دھندلکا سانس کے ساتھ جسم کے اندر جا کر ایک ایک خلیہ میں شامل ہو چکا تھا،" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا "ہم سب بہت آسودہ تھے اور تب —" وہ رک گیا۔

"تب؟" مسافر نے دہرایا۔

"تب یہ شخص آیا" اس نے ایک مرتبہ پھر بت کو دیکھا جس کے سر پر بیٹھا پردار گردن ٹیڑھی کیے آنکھوں کی پتلیوں میں ان کی تصویریں سمیٹے نہایت غور سے گفتگو سن رہا تھا۔

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا "تب یہ شخص آیا، مسافر تھا یہ، نہ جانے کس بستی اور کس زمانے سے

آیا تھا کہ روشنی اور رنگوں کی باتیں کرتا تھا۔ اس نے ہمیں پاگل کردیا، دیوانہ بنا دیا، ہر شخص روشنی اور رنگوں کی باتیں کرنے لگا۔ مگر اندھیرے کی چھت سر پر سے کون ہٹاتا کہ ہٹانے والے کے لیے ہمارے بزرگوں اور ان کے بزرگوں اور پھر ان کے بزرگوں نے بددعا دے کر لعنت مقرر کر رکھی تھی۔ ہم گومگو میں تھے! مگر مسافر کا جوش سب کا خواب بن گیا اور سوائے چند کے باقی سب روشنی روشنی پکارنے لگے اور پھر عجب بات ہوئی۔ جیسے جیسے ہم خواب دیکھتے گئے اور روشنی روشنی پکارتے گئے، ویسے ویسے ہی سر پر سے تاریکی کی چادر سرکتی گئی، بستی پر سے سایوں کی چھت ہٹتی گئی۔ جیسے جیسے سورج کی روشنی میں اضافہ ہوتا گیا جالے مرجھا کر نیچے گرتے گئے اور مردہ مکڑیوں کے ڈھیر لگ گئے۔"

وہ جیسے تھک کر خاموش ہو گیا۔ مسافر بھی خاموش تھا۔ غروب ہوتے سورج کی شفق نے بت کے چہرے پر گلال مل دیا تھا۔ سر پر بیٹھا پر دار منظر کی نگرانی کر رہا تھا۔

"روشنی پاکر ہم بچوں کی مانند خوش تھے، سوائے ان چند کے جو روشنی کی حقیقت جانتے تھے اور تاریکی کے فوائد سے بھی آگاہ تھے، جب کہ باقی سب روشنی کو کھلونا بنا کر اس سے کھیل رہے تھے اور پھر — پھر وہی ہوا جو پرکھوں نے بتایا تھا۔ روشنی نے ہم سب کو ننگا کر دیا۔ پہلے ہمیں دوسرے ننگے نظر آئے۔ خیر اس میں تو کوئی حرج نہ تھا لیکن پھر یہ ہوا کہ ہم سب اپنے آپ کو بھی ننگا دیکھنے لگے۔ پس زندگی وحشتناک خواب میں تبدیل ہو گئی۔ جیسے جیسے روشنی بڑھتی گئی، وحشت میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور جیسے جیسے وحشت بڑھتی گئی۔ ہمارا ننگ بھی بڑھتا گیا اور جیسے جیسے ہمارا ننگ بڑھتا گیا ہم خونخوار ہوتے گئے، حتیٰ کہ ہم سے ڈر کر جانوروں نے بستی چھوڑ دی۔ کتے تک بھی گھروں سے رخصت ہو گئے۔"

شام کے گہرے سائے سیاہ بادلوں کی طرح پر تول رہے تھے اور رات گھٹا بنی امڈی چلی آ رہی تھی۔ تاریکی کے پھیلتے دائرے میں چاروں اسی طرح کھڑے تھے — دو انسان، ایک بت اور ایک پر دار۔

"تب اچانک ہماری روشنی، ہمارے ننگ اور ہماری وحشت نے اس مسافر کو جا لیا کہ یہی

باعث فساد تھا۔ اس نے روشنی کا خواب دیا تھا۔ اس نے ہمیں روشنی کی بھیانک تعبیر کے عذاب میں گرفتار کیا تھا۔ وہ اس مقام پر تھا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ روشنی میں نہائی تمام بستی اس کی دشمن بن چکی ہے مگر اس نے فرار کی کوشش نہ کی۔ تمام بستی ہاتھوں میں پتھر لیے اس کے سامنے تھی مگر اس کی مسکراہٹ خوف میں تبدیل نہ ہوئی۔ وہ کہنے لگا تم مجھے نہیں مار سکتے کہ میں تم میں سے ہوں اور تم مجھ میں سے۔" اور پیشتر اس کے کہ اس پر پہلا پتھر پڑتا وہ خود ہی پتھر ہو چکا تھا تب خوفزدہ ہو کر سب بھاگے کہ یقیناً یہ روشنی کی بلا تھی۔"

پر دار رات کے پھیلے پروں میں غائب ہو چکا تھا۔

مسافر چیخ رہا تھا مگر بوڑھے کو کچھ علم نہ تھا۔ "جب سب خوفزدہ ہو کر بھاگے تو ایک اور عجیب بات ہوئی کہ تمام بستی پتھر میں تبدیل ہو گئی۔ جو جس حال میں تھا پتھر بن گیا، کوئی پلک جھپکنے میں کوئی دیر میں اور میں؟ میں کہ اندھا تھا، بچ گیا۔"

اب اس نے مسافر کی کراہیں سنیں۔

"کیا ہوا۔"

"وہ ــــ وہ ــــ نہ جانے وہ کیا بلا تھی کہ پرندہ ــــ میری آنکھیں ــــ اف! میری آنکھیں نوچ لے گیا۔"

اندھا خوش ہوا "چلو اب ہم دونوں برابر ہو گئے"

اور پھر تاریکی کی اڑتی گھٹا سچ مچ کی گھٹا میں تبدیل ہو گئی اور ایسی بارش شروع ہوئی گویا آسمان پر سے سمندر پھٹ پڑا ہو۔ جیسے جیسے بارش کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا ویسے ویسے ہی بستی میں پانی کی سطح بلند ہوتی گئی۔ سیاہ پتھروں نے پاؤں جما کر بازو پھیلا لیے، یوں کہ ایک بوند بھی باہر نہ جا سکے، پانی کی سطح نے بتوں کے پاؤں چھوئے، پھر ٹخنے، پھر رانیں، پھر سینہ، پھر ہونٹ، پھر ناک، پھر آنکھیں، پھر پیشانی اور پھر سب کچھ ختم ــــ پانی کی لہروں میں سب نمک بن کر گھل گئے۔

سیاہ پتھروں کے درمیان جھیل کے وسط میں سفید پتھریلا انسان باقی رہ گیا تھا جس کے ہاتھ دعا دینے کے انداز میں اٹھے تھے، جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی جس کی آنکھیں شوکتی ہوا کو دیکھ رہی تھیں۔

سورج تمام منظر کو روشنی کا غسل دے رہا تھا۔

عذاب میں گرفتار بستی

آسمان کو گھورتے گھورتے آنکھیں پتھرا چکی تھیں، بوڑھی آنکھیں، سالوں کا تجربہ جن کے گرد جھریوں کی صورت میں پھیلا تھا۔ جوان آنکھیں ـــ ان دیکھے سپنوں کی باس لئے، بچوں کی آنکھیں معصوم، جنہوں نے نہ ابھی سپنے دیکھنے سیکھے تھے، نہ تجربہ حاصل کیا تھا، برائی دیکھنے کا، اچھائی کا۔

صبح ہوتی تو سورج سے پہلے تمازت نکل آتی۔ یوں محسوس ہوتا جیسے انکی بستی کی طرف منہ کر کے دوزخ شوک رہا ہو۔ بستی کی دیواروں سے گرمی بھاپ کی طرح لہریں لیتی نکلتی، سورج طلوع ہوتا تو یوں محسوس ہوتا گویا کسی غضبناک دیوتا کی تیسری آنکھ ان پر مرکوز ہو گئی ہے۔ شعلے برسانے کو، غضب ڈھانے کو، آگ لگانے کو، یہ دھوپ نہ تھی، گرم تیروں کی موسلا دھار بارش تھی۔ حتیٰ کہ رات کو چاند کی کرنیں نیزوں کی انیوں کیطرح چبھتیں۔

گرمی نے پہلے بچوں کے گالوں سے شادابی چوسی، پھر دوشیزاؤں کے ہونٹوں سے سرخی، پھر بوڑھوں کی آنکھوں سے طمانیت، پھر کھیتوں کا ہرا جوبن، کنویں کا پانی نیچے اترتے اترتے پاتال تک جا پہنچا۔ پہلے اس میں جھانکنے سے اپنا منہ نظر آتا تھا، پھر پانی تارا بن گیا اور پھر خاک رہ گئی۔ جوہڑ کے پہلے کنارے سوکھے پھر وہ خود اور اب وہاں بگولے رقص کرتے تھے۔ فصلوں کے پہلے ہرے پات سوکھے پھر ڈنٹھل اور آخر میں زمین کے سینہ میں اتری جڑیں۔ زمین کانچ کے ٹکڑے کی طرح چٹخ گئی، تڑک گئی!

بستی کے سب سے معمر شخص نے ناامیدی سے سر ہلایا۔ اُس کی لمبی عمر نے ایسا غضبناک موسم کبھی نہ دیکھا تھا۔ کمال ہے! اُس نے تعجب سے سوچا، اُس نے

لمبی عمر پانے والے اپنے باپ سے جو کچھ سُنا تھا اُس میں ایسے کسی موسم کا ذکر نہ تھا۔ یہ سب کچھ ماضی کی سنی سنائی باتوں کے مطابق تھا۔ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی جگہ ان میں سے کسی سے چوک ہوئی ہے کہ گھڑا اور دل دونوں خالی ہوگئے ہیں۔

بستی کے سب لوگ تاروں کی لو میں برتن اٹھاکر پانی کی تلاش میں نکل جاتے۔ کئی میل پرے ایک چھوٹی سی ندی تھی۔ اب وہاں دن رات پانی کا میلا لگا رہتا تھا۔ ہر شخص دوسروں سے پہلے اپنے بہت سے برتنوں کو بھرنا چاہتا تھا۔ جس کے نتیجہ میں عام دستور کے عین مطابق سب سے زیادہ طاقتور سب سے پہلے اور سب سے زیادہ پانی لے جاتا تھا۔ جن لڑکیوں کے ایک پھل مانگنے پر سارا باغ اُن کے حوالے کیا جاسکے۔ اب انہیں دھکیل کر پیچھے کر دیا جاتا اور وہ بھی شرمانے لجانے یا گاگر میں منہ دیکر رونے کے بجائے جنگلی بلیّوں کی طرح غراتیں۔ وہ بوڑھیاں جنہیں دادی اور نانی اماں کا احترام ملنا چاہیئے تھا اس بھیڑ میں پاؤں تلے آجاتیں تو ٹوٹے گھڑوں کے ٹکڑوں کی طرح کوئی انہیں اٹھانے کو نہ جھکتا۔

پانی کے کال سے یہ حال ہوگیا تھا، کہ نہ عورتیں کپڑے دھوتیں نہ بچے پانی میں کھیلتے اور نہ کنواریاں منہ دھوتیں۔ گرد سے اَٹے چہرے، پپڑائے ہوئے ہونٹ، پیشانی پر نقاہت کی سیاہ لکیریں، خشک کھڑکھڑاتے حلقوں سے سُریلی آواز نہ نکلتی مائیں لوریاں بھول گئیں۔ سہیلیاں سرگوشیاں اور گیت محبت کی ماریاں! صرف بچوں نے رونا یاد رکھا۔ دن رات کا رونا۔

جن باکرہ لڑکیوں کے پسینوں سے خواہش کی بو آتی تھی اب اُن کے گندے جسموں اور بالوں سے بساندھ آتی کہ بات کو جی نہ چاہے۔ چوری چھپے ملنے والے جوڑے گرمی میں جھلسے پیڑوں کے نیچے ملتے تو ہاتھوں میں ہاتھ دیکر یا ساتھ چپک کر بیٹھنے کے بجائے پرے پرے بیٹھتے۔ خالی اور ویران آنکھوں سے افق کو دیکھتے رہتے جہاں گرد نے ٹیالی چادر تان رکھی ہوتی۔ جسموں سے پانی کم ہوا تو عورتوں کے ہونٹوں کی تر مٹھاس ختم ہوگئی۔ بیویوں کے

جسموں سے شہوت کا پسینہ سُوکھ گیا۔ اور ماؤں کی دودھ بھری چھاتیوں سے دودھ اُتر گیا۔ مردوں کا مائع حیات نہ رہا۔ چنانچہ اب میاں بیوی الگ الگ چارپائیوں پر لیٹے ان دنوں کو یاد کرتے جب وہ اکٹھے لیٹ سکتے تھے۔ وہ اِن دنوں کو یاد کرتے جب بستی پر عذاب نازل نہ ہوا تھا اور اُن دنوں کو بھی یاد کرتے جب یہ عذاب مزید شدت اختیار کر جائے گا۔ بچوں کا کیا ہوگا۔ مستقبل اب اندیشوں کا نام تھا۔ اَن دیکھے اندیشوں کا نہیں بلکہ دیکھے بھالے اندیشوں کا ــ!

"اچھا! تو سمندر میں بہت پانی ہوتا ہے!" ایک نوجوان اچانک جھرجھری لیتا۔

"پانی!" وہ آہ بھر کر کہتا۔ "اتنا کہ اندازہ نہیں کر سکتے۔"

"کتنا ہوتا ہوگا وہ پانی جس کا اندازہ بھی نہ کیا جا سکے۔"

"میلوں کے حساب سے، سینکڑوں میلوں کے حساب سے۔"

"نہ جانے اتنا پانی دیکھ کر کیا حال ہوتا ہوگا؟"

"ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر؟"

وہ ہنستے، "نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"بھلا پانی سے بھی کوئی ڈر سکتا ہے۔"

"ڈر! اور وہ بھی پانی سے۔"

"ناممکن! ناممکن!!"

"یہ بات نہیں مانی جا سکتی۔ پانی تو زندگی ہے۔" اس نے رُک کر اپنے ہونٹوں پر یوں زبان پھیری گویا پانی کا ذائقہ محسوس کر رہا ہو۔ "پانی سے خوف! نہیں! پانی تو زندگی ہے۔"

"یہاں ہے۔" پھر وہ آہ بھر کر جواب دیتا "وہاں نہیں۔"

"کیوں؟"

"وہاں پانی موت ہے، جہاز نگل لیتا ہے۔ خشکی پر چڑھ دوڑے تو بستی کی بستی ہڑپ کر جاتا ہے۔"

اس پر کچھ دیر خاموشی رہی، پھر ایک بولا: "پیاسی موت سے پانی کی موت کہیں زیادہ بہتر ہوگی۔"

"وہ کیوں بھئی؟"

"آدمی منہ اور پیٹ بھر کر مرتا ہے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔"

"مجرم کو بھی پانی پلا کر ہلاک کرتے ہیں۔"

بھاپ اگلتی رات میں حلقہ میں خاموشی چھا جاتی، بڑے بوڑھے خاموش، سر جھکائے، اُن کے پیچھے جوان گُم صُم! پیچھے گھروں میں عورتیں حواس باختہ سی، چنگلی اور نیبت بھولی ہوئیں۔

تب ایک صبح کھونٹے پر بندھی گائے مردہ ملی۔ اس کی کھال پر سیاہ چمک نہ رہی تھی۔ گردن سے آتی، باہر نکلا پسلیوں کا پنجرا، کھلی گدلی آنکھوں پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اکڑی زبان کھلے منہ سے ٹیڑھی ہو کر لٹک رہی تھی۔ مکھیاں کھلے منہ میں داخل ہوتیں۔ میلے دانتوں پر بیٹھتیں، اندر تالو اور حلق تک جاتیں مگر وہاں بھی نمی نہ پاکر باہر نکل آتیں۔ گائے نے خاموشی سے جان دی تھی۔ رات کو کسی نے اس کے کراہنے تک کی بھی آواز نہ سنی تھی۔ وہ زندگی میں بھی بہت صابر رہی تھی۔ جو دیا کھالیا جب دیا پی لیا۔ اس کی مالکن نے اُسے دیکھا تو حیران حیران سی نظروں سے، گائے نے مرکر یہ احساس کرا دیا تھا کہ وہ کتنا عرصہ نکال گئی تھی۔ اور باقی کتنا عرصہ لگاتے ہیں۔ اس پر افسردگی نے غلبہ پالیا۔ افسردگی غم میں تبدیل ہوگئی تو اُس کی آنکھوں سے بمشکل آنسوؤں کے دو قطرے نکل سکے۔ جس نے انہیں گالوں پر سے نیچے ڈھلکنے نہ دیا۔ بلکہ انگلی پر لے کر دیکھتی رہی۔ حیرت زدہ سی، کھوئی کھوئی سی، گرم آنسوؤں کا قطرہ اس کی پور کو نمی کی عجیب ٹھنڈک دے رہا تھا۔

یہ موت پہلی تھی مگر آخری نہیں۔ اس سے اگلے دن چلتے چلتے ایک بیل گرا نہ اُٹھنے کے لئے اور پھر تو تانتا بندھ گیا۔ خاموشی سے دم دینے والوں کا، آنکھوں میں پیاس لے کر مرنے والوں کا! کھُلی آنکھوں کا، اکڑی زبانوں کا اور جلتے معدوں کا!

بستی میں اب کھانے پینے کا سامان ختم ہوتا جا رہا تھا۔ بلکہ بعض گھروں میں تو ایک وقت کا فاقہ بھی شروع ہو چکا تھا۔ کمزوری کے باعث بہت سے لوگ اب پیدل جاکر پانی لانے کے قابل بھی نہ رہے تھے۔ ویسے وہاں ندی کا پانی بھی دن بدن تہہ کی طرف کھسکتا جا رہا تھا۔ پانی کی سفیدی پر گدلاہٹ غالب آتی جا رہی تھی اور جب گھڑا کر اسے کپڑے میں سے چھانتے تو کپڑا کیچڑ میں رنگ جاتا۔ یہ آثار تھے اس بات کے کہ جلد ہی ندی بھی تھک کر اپنی گذرگاہ میں دم دے گی۔

اور تب ایک صبح بستی والوں نے دیکھا کہ ایک اجنبی بیچ چوک میں ہے۔ سیاہ بال فراخ پیشانی، چمکیلی آنکھیں، توانا جسم، وہ یقیناً پانی پیتے تھا۔ کیونکہ پیاس سے اُس کی جلد پر خشکی کے چٹاخ نہ پڑے تھے۔ یوں بھی پانی پیئے اور پیاسے کے حلیوں میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ وہ سب اس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ بوڑھے، جوان عورتیں، بچے تمام بستی جمع تھی۔ یہ رات کس وقت آیا؟ کہاں سے آیا؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کیوں آیا؟۔ یہ کیوں، سب سے زیادہ اہم اور خطرناک تھی۔ بستی والے خاموش تھے حتیٰ کہ ہمیشہ رونے والے بچے بھی۔۔ ان میں سے کچھ پریشان تھے، کچھ خوفزدہ تھے کچھ کی آنکھوں میں وحشت تھی تو کچھ دلوں میں جنوں، مگر کسی ایک دل میں بھی اس کے لئے کوئی نرم گوشہ نہ تھا۔ حتیٰ کہ اُن جوان لڑکیوں کے دلوں میں بھی نہیں جو ایسے ہی پردیسیوں کے سپنے دیکھتی رہتی تھیں۔

وہ انہیں دیکھ کر مُسکرایا

وہ سب گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے کہ اُن سب کو نہ مُسکرائے اتنا عرصہ بیت گیا تھا کہ اب اُنہیں یہ یاد ہی نہ رہا تھا کہ انسان کی مسکراہٹ اور جانور کے دانت نکوسنے میں کیا

فرق ہوتا ہے۔ یقیناً یہ کوئی پاگل ہے جو ان حالات میں مُسکرانے کی سکت رکھتا ہے۔ بعض نے سوچا کہیں یہ کوئی چھلاوہ نہ ہو یا بھرا گیا بیتاں نے انہیں ڈرانے کو یہ جون اختیار کی ہے۔ سورج میں اس کے سیاہ بال چمک رہے تھے۔ اور مانگ انہیں دو برابر حصوں میں تقسیم کر رہی تھی۔ ہائے! مانگ ایسی ہوتی ہے۔ ایک دُلہن نے اپنے خشک بیلوں جیسے بالوں کو ہاتھوں میں مسل کر دُکھ سے سوچا۔

وہ اُن کی طرف ایک قدم بڑھا۔

وہ سب گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔ وہ اب بھی مُسکرا رہا تھا۔ اس کے سفید چمکیلے دانت نمی بھرے سُرخ لبوں کے عقب میں بہت بھلے لگ رہے تھے۔ کبھی میرا محبوب بھی یوں ہی مسکراتا تھا مجھے دیکھ کر، ایک دل جلی نے سوچا، شاید وہ اب بھی مُسکرا دے اگر پانی دیکھ پائے تو۔

اور تب انہیں ایک اور چیز نظر آئی۔ ایسی چیز جس نے بستی کے ہر شخص کو اپنے طور پر متاثر کیا۔ پانی کی چھاگل، ہاں! ہاں! پانی کی چھاگل! سچ مچ کا پانی، جیتا جاگتا پانی، پھول کی طرح مسکراتا پانی ــ کمال ہے! مگر یہ پانی کہاں سے آیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ کیا یہ پانی حقیقی بھی ہے۔ کہیں یہ کوئی آسیب تو نہیں؟ کہیں یہ پانی جادو کا تو نہیں؟ کہیں اس پانی میں زہر تو نہیں کہ ایک دم میں سب بستی کا کام تمام ہو جائے۔ اور پھر یہ شخص کیسے یوں پانی لے کر کھُلے بندوں دن دہاڑے پھر رہا ہے۔ آج کل تو اس سے کم پانی آدمی کی جان لے لیتا ہے ــ نہیں! نہ یہ پانی سچ ہے اور نہ یہ شخص!

وہ شخص جل ترنگ ایسے لہجے میں کہہ رہا تھا ــ "میں تم لوگوں کے لئے خوشخبری لایا ہوں۔ اب تم میں سے کوئی پیاسا نہ رہے گا۔ اب تمہارے کھیت نہ سُوکھیں گے، اب تمہارے جانور نہ مریں گے......"

وہ بول رہا تھا اور تمام لوگ اسکے ہلتے ہونٹوں اور پانی کی چھاگل کو باری باری دیکھ

رہے تھے. جب وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر محبت کے بولتا تھا تو اس کا لہجہ بھی ایسا ہی ہوتا تھا، ایک مجبوبہ نے سوچا. وہ کہہ رہا تھا: "میں تم لوگو ں کے دکھ درد دور کرنے آیا ہوں خوشخبری! پانی کی خوشخبری!" "خوشخبری، پانی کی خوشخبری، یہ کم بخت پاگل کہاں سے آگیا؟ یقیناً یہ ہمارا دشمن ہے یوں ہی پانی پانی کہہ کر ہمیں بہکار رہا ہے. چھلا وہ نہ ہو تو کہیں کا! وہ اپنے جلترنگ انداز میں بولے جا رہا تھا." ہماری بستی کے کنویں میں دوبارہ پانی آگیا ہے اور تم جتنا چاہو آکر لے جا سکتے ہو اب تمہیں پیاسا رہنے کی ضرورت نہیں." وہ سب اپنی وحشت ناک آنکھوں سے گھورتے سوچ رہے تھے یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ خود بخود کنویں میں کیسے پانی آسکتا ہے؟ ناممکن ہے! اگر ان کے کنویں میں پانی آگیا تو ہمارے میں کیوں پتھر بجتے ہیں.

تب وہ اچانک رُک گیا اور پھر بولا -" میں تم لوگوں کی آنکھوں میں بے اعتباری دیکھ رہا ہوں." اس کی نگاہیں ایک ایک کے چہرے کو ٹٹول رہی تھیں." ہاں! تم مجھے جھوٹا اور دغاباز سمجھ رہے ہو مگر میں تو ایسا نہیں. میں دل میں بھلائی لے کر گھر سے نکلا ہوں، دیکھو یہ ثبوت یہ پانی ہے پانی!" اُس نے چھاگل کی نم سطح پر انگلی پھیر کر اُن کی طرف کی.

وہ اب خاموش تھے. آنکھوں کی وحشت ناک چمک بڑھتی جا رہی تھی. انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سورج اُن کی کھوپڑیوں کے اندر اُتر آیا ہے. انہیں اپنے جسم بخار میں پھنکتے محسوس ہو رہے تھے. سب کے دل میں ایک ہی خیال تھا اور ایک ہی وحشت کی چمک سب کی آنکھوں میں! اُن کا گھیرا اُس کے گرد تنگ ہوتا جا رہا تھا وہ انہیں پانی دکھا رہا تھا، اور موت سے نکال کر زندگی کی طرف لے جانے کی باتیں کرتا رہا. مگر گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا. مردوں کے حلق سے غضیلی آوازیں نکل رہی تھیں. عورتیں غرا رہی تھیں.

تب اُن سب کے ہاتھ پنجے بن گئے اور انہوں نے اپنے لمبے ناخنوں سے اُسے ادھیڑ کر رکھ دیا:

اُن سب کا اب بخار اتر چکا تھا اور کھوپڑی میں سے سورج نکل کر آسمان پر واپس چمک

رہا تھا۔ وہ تھکے تھکے واپس اپنے گھروں کو چل دیئے۔ کسی نے چوراہے میں اجنبی کی لاش کی طرف مڑکر دیکھنے کی ضرورت بھی نہ محسوس کی۔ اجنبی کے کپڑے لیرلیر ہوکر ادھر اُدھر اڑ رہے تھے۔ اس کے کٹے پھٹے اعضا، بکھرے پڑے تھے۔ البتہ اس تمام ہنگامے میں چھاگل کو کچھ نہ ہوا تھا۔ وہ اب بھی تپتی زمین پر، پانی سمیٹے، اُس کی مٹھی میں تھی۔

وہ اچانک رُک گئے۔

"وہ دیکھو!" ایک چلایا۔

"بادل"!

افق پر سیاہ بادل کا ٹکڑا نمودار ہوا تھا۔ وہ خوشی سے چلانے لگے۔ ناچنے لگے اب انہیں یقین ہوگیا تھا کہ اجنبی کے روپ میں واقعی یہ کوئی پلید روح تھی جو انہیں غارت کرنے آئی تھی۔ اور انہوں نے بہت اچھا کیا جو اُسے مار دیا۔ اور پانی قبول نہ کیا۔ ان کے عذاب کے دن اب ختم ہوگئے ہیں۔ یہ بادل برسیں گے اور ہم سب نئی زندگی پالیں گے۔ تمام بستی والے دھڑکتے دل سے بادل کے اس ٹکڑے کو دیکھ رہے تھے جو آہستہ آہستہ اُن کی طرف بڑھتا آرہا تھا۔ سب خوش تھے عذاب ختم ہوگیا۔ کنواریوں نے تو ابھی سے مُسکرانا بھی شروع کر دیا تھا۔ خاوند بیوی کے قریب ہوگیا اور وہ کچھ سوچ کر شرما گئی۔ بادل تیزی سے اُن کی طرف بڑھا آرہا تھا۔ جیسے اسے بھی اُن کی ضرورت کا احساس ہو!

یہ کیا۔؟ بادل کے ساتھ چلنے والی ٹھنڈی ہوائیں کیا ہوئیں۔ لو کے تھپیڑ تو اسی طرح پڑ رہے تھے اور یہ بادل بھی بہت چھوٹا تھا۔ تمام آسمان پر چھا جانے والے یہ مست ہاتھی نہ تھے بلکہ یوں لگتا تھا جیسے صرف ایک ہی ہاتھی ساتھیوں سے الگ ہوکر ادھر آنکلا ہے۔ اور اب وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ بادل نہ تھا یہ تو کچھ اور تھا! ہوا میں عجب شور تھا۔ اور پروں کی سائیں سائیں۔ یہ تو ٹڈیاں تھیں ٹڈی دل!

ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ٹڈیاں! مالِ غنیمت کے متلاشی فتحیاب لشکر کی طرح اُن

پر ٹوٹ پڑیں۔ اُنہوں نے جی بھر کر آدمی کھائے۔ موٹی موٹی خوبصورت سپنے دیکھنے والی آنکھیں، بھری بھری چھاتیاں، سینوں میں دھڑکتے دل، پیار کے گیت گانے والے ہونٹ، زمین کا سینہ چیرنے والے ہاتھ، بالوں میں کنگھی کرنے والی انگلیاں، بچوں کا نرم گوشت۔

جب یہ فتح یاب لشکر دوبارہ اُڑا تو اجنبی کے ساتھ اب تمام بستی والے بھی تھے۔ مردہ بچے ہُوئے۔

آسمان پر گدھ منڈلا رہے تھے۔ اِن کی دوربین آنکھوں نے وافر خوراک دیکھ لی تھی اور اب وہ بڑے بڑے پر پھیلائے نیچے کی جانب آ رہے تھے۔ سب سے پہلے جو گدھ اُترا اس کی تیز نگاہوں نے چھاگل کو دیکھا تو اس پر چونچ ماردی اور جب اس میں سے پانی بہہ نکلا تو جی بھر کر پیاس بجھائی۔

"اور بستی"

بستی ایک پُر فضا مقام پر آباد تھی، بلند پہاڑ، شفاف پانی، گنگناتے چشمے، گیت گاتے آبشار، نظروں کی حد تک زمردیں میدان،

یہ صاف ستھری بستی نیک پاک لوگوں سے آباد تھی۔ نہ کمزور کو طاقتور کا ڈر تھا نہ غریب کو ناقوں کا، مرد رزقِ حلال پر قانع تھے، دن بھر محنت کرتے اور رات کو عبادت۔ اسی لئے مرد ہمیشہ نظریں نیچی رکھتے۔ عورتیں باحیا اور عفت مآب تھیں، عشق میں ثابت قدمی تھی تو حسن میں وفا، سب بزرگوں کا احترام کرتے اور بچوں سے پیار، واعظ میں خستِ قلب نہ تھی، اساتذہ میں علم کی لگن تھی تو طلبہ میں علم کی پیاس، کشادہ پیشانیوں، روشن آنکھوں اور پُر مسکراہٹ ہونٹوں والی اس بستی کی طہارت کا یہ عالم تھا کہ ہوا دامن جھٹک کر ادھر سے گزرتی، وہاں سے نکلتی تو نیک نیتوں کی خوشبو سے لدی ہوتی۔

بستی پر پیار حکمراں تھا، وہ زندگی سے پیار کرتے، زندگی بخش چیزوں سے پیار کرتے، زندگی آموز باتوں سے پیار کرتے اور سب سے بڑھ کر حسن سے پیار کرتے۔ اسی لئے وہاں پھول کو شاخ سے ٹوٹ کر خوشبو کی قیمت ادا نہ کرنی پڑتی۔ نہ ہی تتلی کو رنگ کے جرم میں سزائے موت ملتی نہ کبھی اس بستی کے کسی پنچھی نے پنجرے میں برہا کا گیت گایا اور نہ ہی گھر میں کسی سیاہ چشم حسینہ نے۔ وہاں چاندنی زیادہ نرم تھی، رنگ زیادہ اُجلے تھے۔ دن زیادہ چمکیلے تھے اور دھوپ زیادہ روشن!

بستی والے مرحومین کو بہت عقیدت اور محبت سے یاد کرتے تھے، ان کے قبرستان پر

گلستان کا گمان ہوتا تو شب کو چراغاں، قبروں کے سرہانے ٹمٹماتے دیئے دیکھ کر محسوس ہوتا گویا قبرستان نے ستاروں کا آنچل لے لیا ہو۔ وہاں خوشبوئیں جلائی جاتیں تو خوشبو کے بل کھاتے دھوئیں کے ساتھ محبت سے یاد کرنے والوں کی دعائیں بھی سوئے فلک رواں ہوتیں۔

مطمئن ضمیر بستی والے سوتے تو شیریں خواب دیکھتے!

.... اور پھر ایک دن!

قبرستان کی جانب سے ایک بزرگ صورت یوں وحشت زدہ بھاگا گویا اس نے کسی بھوت کو ننگا دیکھ لیا ہو۔ چوراہے پر پہنچ کر رُکا تو اس کے گرد ہجوم ہو گیا۔ اس نے بمشکل بے ترتیب سانسوں کو مرتب کیا اور کانپتی آواز میں رک رک کر جو بات بتائی وہ ناقابلِ فہم تھی اس لئے ناقابلِ یقین بھی!

یہ قیامت کی نشانی تھی مگر ایسی نشانی کہ بذاتِ خود قیامت۔ کل جس خوبرو نوجوان کو آنسوؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ سپردِ خاک کیا تھا اُس کی قبر منہ پھاڑے اُس کے غم کا مذاق اُڑا رہی تھی۔ اس کا کفن غائب تھا اور یوں محسوس ہوتا گویا نعش نے اپنی برہنگی سے شرما کر ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لی ہوں۔

یہ حادثہ ایسا تھا کہ یادداشت بھی اس کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ مُردے کی بے حُرمتی! یہ بدترین تصورات سے بھی بدتر بات تھی، یہ نوجوان نیک اطوار تھا۔ اس لئے اس کی نعش کی بے حُرمتی باعثِ عبرت بھی نہ تھی۔ تاہم بستی کے نیک بندوں نے اسے اپنے لئے باعث عبرت ہی جانا، کردہ گناہوں کی معافی مانگی اور ناکردہ گناہوں سے بھی استغفار کیا، مگر نہیں! یہ از غیب سامانِ عبرت نہ تھا، کسی پیشہ ور کفن چور کے کاروبار کا آغاز تھا۔ بستی والوں نے اپنی روایت کے برعکس قبرستان میں چوکیدار مقرر کئے، مگر کفن چور تھا کہ چھلاوہ۔ رات کے پچھلے پہر نیند کے بوجھ سے پپوٹے خود بخود بند ہو جاتے اور جب کھلتے تو کفن چور ہاتھ کی صفائی دکھا گیا ہوتا۔

چند سے یہی صورتِ حال رہی تو بستی والوں نے تنگ آ کر قبر کے سرہانے نالتو کفن لٹکانا شروع کر دیا۔

تاکہ وہ آئے، مرنے سے خراج وصول کرے اور چلتا بنے۔ مگر بات نہ بن سکی۔ کفن چور کو کفن سے دلچسپی نہ تھی کیونکہ اس نے قبر کے سرہانے رکھے کفن کو کبھی نہ چھیڑا، اسے تو قبر کھود کر لاش پر سے کفن اتارنے ہی میں مزا ملتا تھا۔ بستی والے عجب مصیبت میں تھے نہ کفن چور کو روک سکتے تھے اور نہ موت کو ــــ تو کیا کریں؟ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو شاکر ہو کر بیٹھ رہے، قبرستان سے چوکیدار ہٹا لئے، مردوں پر ماتم کرنا بند کر دیا، اب وہ قبر کو زیادہ پختہ بھی نہ بناتے تاکہ کفن چور کے کام میں خلل نہ پڑے تاکہ جلد از جلد فارغ ہو کر رخصت ہو، اگلے دن وہ قبرستان جاتے سرہانے رکھے کفن میں نعش لپیٹتے، اُسے دفن کرتے اور پھر دل کھول کر اپنے اور اس کے مقدر پر بین کرتے۔

چندے یہی لیل و نہار رہے رات کو کفن چور آتا، اطمینان سے اپنا کام کر جاتا اور پھر دن کو لواحقین آتے اور بے اطمینانی سے کام کرتے، جس کے نتیجہ میں موت محض موت نہ رہی بلکہ کچھ اور ہی بن گئی، اب مردے کو نہلانا دھلانا کفنانا سب بے معنی لگتا۔ موت پر ماتم میں تسکین نہ رہی تھی۔ یہ معلوم نہ تھا رونا مرنے پر ہے یا کفن چور کے ہاتھوں نعش کی بے حرمتی پر!

اور پھر اچانک یہ سلسلہ جس طرح پراسرار طریقہ پر شروع ہوا تھا اسی طرح اس نے پراسرار طریقہ پر نئی کروٹ لی۔ جو پہلے کے مقابلہ میں اتنی خوفناک تھی کہ لوگوں کو کفن چور فرشتہ معلوم ہونے لگا کہ صرف کفن چراتا تھا، اس نے آج تک نعش کی بے حرمتی نہ کی تھی۔

جب دوشیزہ کے لواحقین اگلی صبح قبرستان پہنچے تو سرہانے دھرا کفن بھی غائب پایا لیکن یہ دیکھ کر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ لاش کی بے حرمتی کی گئی تھی، یہ ناقابلِ فہم بات تھی کہ بستی کے مردنے تو کبھی زندہ عورت کی بے حرمتی نہ کی تھی چہ جائیکہ لاش کی بے حرمتی!

اس انداز کی یہ پہلی مثال تھی مگر آخری نہیں ــــ

پسماندگان ساری ساری رات قبرستان میں جاگ کر گزارتے مگر نہ معلوم کیسے رات کے کسی پہر جیسے آنکھوں پر افسوں ہو جاتا۔ صبح جب آنکھ کھلتی تو بے گور و کفن نعش کو آنکھ بھر کے دیکھنے کی ہمت نہ پاتے۔ چنانچہ جیسے تیسے اسے دوبارہ مٹی میں دباتے اور بوجھل دل کیساتھ

واپس آجاتے۔

تنگ آکر انہوں نے وہاں سے نکل بھاگنے کا بھی سوچا، کچھ تو چلے بھی گئے مگر باپ دادا کی ہڈیاں چھوڑ کر جانا بھی تو آسان نہ تھا۔ اور پھر یہ بھی تھا کہ مردوں کی اس بے حرمتی کے علاوہ زندوں کے معمولات میں کچھ فرق نہ آنے پایا تھا۔ انہیں یوں محسوس ہوتا کہ گزشتہ قوموں کی مانند انہیں بھی نافرمانیوں کی بنا پر مبتلائے عذاب کیا گیا ہے۔ اگرچہ صبر شکر کے علاوہ چارہ نہ تھا۔ لیکن کبھی کبھی سوچتے کیا یہ عذاب گناہوں کے مقابلہ میں زیادہ نہیں؛

ادھر موت کی بے حرمتی نے زندگی سے مزا بھی چھین لیا..... یہ ایک اور طرح کا عذاب تھا۔ لیکن انسانی فطرت کے موجب آہستہ آہستہ وہ اس عذاب کے بھی عادی ہو گئے جس کے نتیجہ میں موت کے برحق ہونے کی مانند انہوں نے نعش کی بے حرمتی کو بھی اٹل تسلیم کر لیا۔۔ بے حرمتی کے بعد مردہ کی بخشش کے لئے دعا مانگنے کو بھی جی نہ چاہتا۔ بس وہاں سے بھاگنے کی کرتے۔

چندسے یہی لیل و نہار رہے تو انہیں یوں محسوس ہونے لگا گویا یہ سب ہمیشہ اسی طرح ہوتا آیا ہے۔ بڑے بوڑھے جب یہ بتاتے کہ کبھی یہ سب نہ تھا۔ اور قبر کے سرہانے جلتے دیئے سے تیل کی بوند تک بھی کم نہ ہوتی تھی تو نوجوانوں کو یقین نہ آتا، گویا کسی اور زمانے یا اور دیس کی کہانی سنائی جا رہی ہو بلکہ بعض اوقات تو خود سنانے والے کو بھی اپنی یادداشت پر یقین نہ آتا اور یوں محسوس ہوتا گویا وہ کسی اور بستی کی کہانی سنا رہا ہو۔

اب تک جو کچھ ہوا وہ رات کی سیاہی میں ہوتا تھا۔ مگر دن محفوظ اور امن و سکون کے تھے۔ وہ جو کوئی بلا تھی اُسے صرف نعشوں سے دلچسپی تھی اس نے زندوں کو کبھی بھی نہ چھیڑا تھا۔

اور پھر ایک دن!

ہاں ہاں چمکیلی دھوپ میں دہشت زدہ آنکھوں نے دیکھا کہ فضا سے دو غیرئی ہاتھوں نے بڑھ کر ایک بزرگ کو دبوچ لیا ـــ وہ ایک بے ضرر بوڑھا تھا۔ دن بھر گھر کی دہلیز پر

بیٹھا خوبصورت ماضی کی کہانیاں سناتا یا پھر پوتے سے کھیلتا رہتا۔ سبھی اس کی عزت کرتے اور وہ سب سے شفقت کا سلوک کرتا، اس روز بھی وہ معمول کے مطابق خوشگوار دھوپ میں بیٹھا تھا کہ اچانک جیسے کسی نے اُسے اُچک لیا، کسی کو کچھ نظر نہ آرہا تھا بس اُسے کشاں کشاں کھینچا جا رہا تھا اور وہ بُری طرح سے چیختا چلاّتا جا رہا تھا۔ یہ عجیب دہشت ناک منظر تھا۔ کوئی نادیدہ قوت اُسے گھسیٹے لئے جا رہی تھی۔ اس کی چیخوں سے سننے والوں کے دل دہلے جاتے تھے، رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے، سانسیں رُک رہی تھیں مگر وہ کچھ نہ کر سکتے تھے، جیسے پتھر کے بن گئے تھے۔ اور وہ اِن سب کے سامنے چیختا فضا میں تحلیل ہو گیا۔

اس رات کوئی بھی نہ سو سکا!

صبح ہر شخص کے سر پر اس کا اثاثہ تھا اور سب کا رُخ بستی سے باہر جانے والے راستہ کی جانب تھا۔ اب بستی میں رہنا ناممکن تھا۔ عافیت فرار میں تھی۔ اور وہ سر جھکائے بوجھل قدموں سے یوں چلے جا رہے تھے جیسے میت کندھے پر رکھی ہو۔ بستی کی حد پر پہنچ کر انہوں نے پیچھے پلٹ کر اپنے گھروں کو دیکھا جن کی چمنیوں سے اَب کبھی دھواں نہ اُٹھے گا۔ مگر بستی کی حد سے باہر نکلنے لگے تو غیر مرئی ہاتھوں نے انہیں پیچھے دھکیلنا شروع کر دیا انہوں نے بہت زور لگایا مگر وہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکے خوف نے زبانیں جکڑ لیں، دہشت نے قدم تھام لئے۔ مساموں نے ٹھنڈا پسینہ نکالنا شروع کر دیا، آنکھوں کی پھیلی پتلیاں نظر نہ آنے والے ہاتھوں کو دیکھنا چاہتی تھیں، مگر دیکھنے کی تاب بھی نہ تھی۔

وہ تھک ہار کر واپس مُڑتے ہیں!

ہوا کے جھکڑ چمنیوں سے دھواں اچھال رہے ہیں۔ تب تیز ہوا سے گھروں کے کھلتے بند ہوتے دروازے اُن کا اس طرح استقبال کرتے ہیں کہ گھر کے کسی دروازے نے کبھی بھی اپنے مکین کا یوں استقبال نہ کیا ہو گا۔

اختتام

وہ عجب وحشت ناک سفر تھا کہ راستہ سائے کی طرح ساتھ ساتھ گز بھرتا چلتا تھا۔
گھنے جنگل میں پگڈنڈی جیسے سانپ کی طرح بل کھا کر ٹانگوں سے لپٹ جاتی۔ تاریکی گھنگھور گھٹاؤں کی طرح اُمڈ اُمڈ کر آتی اور انہیں اپنے بازوؤں میں لے لیتی، بھینچتی یوں کہ نتھنوں سے پھیپھڑوں اور پھر تمام خون میں اُس کے سرایت کر جانے کا احساس ہوتا —— بعض اوقات تاریکی منجمد ہو کر مختلف جانوروں کی شکلیں اختیار کر کے انہیں ڈراتی، ہاتھی، گدھا، بھالو، لنگور اور نہ جانے کون کون سے جانوروں کی شکلیں مرتب ہوتی جاتیں یوں کہ جانور کا پنجہ جانور کے پنجے میں اور دم میں دم پیوست —— وہ اِن کے گرد حصار باندھے وحشیانہ رقص کرتے حلق تک جبڑے کھول کر قہقہے لگاتے جن کی گونج دو گھاٹیوں میں ایستادہ چٹانوں سے ٹکراتی اور پھر واپس پلٹ کر کانوں کے پردوں سے —— وہ خوف سے تھرا اٹھتے اور تب اُن میں سے کسی ایک کے منہ آیۃ الکرسی ادا ہو کر اُن کے گرد حفاظتی حصار تعمیر کر دیتی —— خوف کا احساس زائل ہو جاتا اور وہ خود کو محفوظ و مامون تصور کرتے کہ ہر ایک کو آیۃ الکرسی اپنے وجود کا حصہ محسوس ہوتی۔ تب اُن میں سے کسی ایک کے حلق سے اذان کے الفاظ نکلتے ان میں عجب کڑک ہوتی گویا فتح کی قرنا پھونک رہے ہوں اور یوں وہ دل پر سے خوف کے پنجہ کو نرم پڑتا محسوس کرتے۔

وہ عجب وحشت ناک سفر تھا کہ اعصاب پر نشہ طاری کر دینے والی فردوس بداماں وادیوں کے سپنے لے کر چلے تھے۔ لیکن اب طلسمی ہفت خواں میں سرگردانی کے عذاب میں گرفتار تھے۔ حقیقت کے برعکس نظر آنے والی اشیا، انہیں محبت بھرے اشاروں سے بلاتیں لیکن پاس پہنچنے

پر قہقہہ لگا کر کوئی اور روپ دھار لیتیں —— پانی کی طرف لپکتے تو وہ ریت میں تبدیل ہو جاتا —— پھول چھوتے تو نیچے سے سانپ نکل آتا —— پاؤں پڑتے ہی ملائم گھاس بدبودار کیچڑ میں تبدیل ہو جاتی اور سایہ اپنا درخت چھوڑ کر اچانک اُن کی گردنیں توڑنے کو اوپر آن گرتا —— وہ حقیقت کے برعکس نظر آنے والی اشیاء سے اتنے خوف زدہ ہو چلے تھے کہ پانی کو سراب سمجھ کر پاس سے پیاسے گزر جاتے۔

وہ عجب ہولناک سفر تھا کہ چھل پائیاں، چھلاوے، الگیا بتیاں اور بھوت شریکِ سفر تھے۔ کہیں چھتنار میں دو دھیا چھاتیوں والی عورت بیٹھا تی۔ وہ دیوانہ وار اس کی طرف لپکتے مگر آغوش میں آکر وہ متعفن عفریت بن جاتی —— جھاڑیوں میں پھنسے معصوم چشم زخمی بدن ہرن کو دیکھ کر محبت سے گود میں اٹھاتے تو اُس کی ٹانگیں لمبی ہو ہو کر اُن کی ٹانگوں کو رسی کی طرح باندھنے لگتیں وہ اسے پٹک کر بھاگتے خوف اُن پر چاروں کھونٹ سے حملہ آور ہوتا۔ کبھی یہ پُراسرار سرسراہٹ بن کر پاؤں میں کانٹے کی طرح چبھتا تو کبھی اعصاب گنگ کر دینے والے ہیبت ناک شور کی طرح راہ کی دیوار بنتا اور تب اُن میں سے کسی ایک کے منہ سے آیۃ الکرسی کی آیات ادا ہو کر اُن کے گرد حفاظتی حصار تعمیر کر دیتیں۔ خوف کا احساس زائل ہو جاتا اور وہ خود کو محفوظ و مامون تصور کرتے کہ ہر ایک کو آیۃ الکرسی اپنے وجود کا حصہ محسوس ہوتی۔ تب اُن میں سے کسی ایک کے حلق سے اذان کے الفاظ نکلتے —— اُن میں عجب کڑک ہوتی۔ گویا فتح کی قرنا پھونک رہے ہوں۔ اور یوں وہ دل پر سے خوف کے پنجہ کو نرم پڑتا محسوس کرتے —— آیات اور الفاظ جتنی آگ کی مانند ان کے گرد پناہ کا حصار قائم کر دیتے اور وہ خود کو حفاظت میں محسوس کرتے یوں کہ وہ خود کو حصار کے اندر محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ حصار کا بھی حصہ محسوس کرتے۔

وہ عجب جان لیوا سفر تھا کہ اُن کا ایک ساتھی نگلا گیا —— وہ ابھی تک حقیقت کے برعکس نظر آنے والی اشیاء کے طلسمات میں اسیر تھے کہ انہیں ایک خوبصورت گائے نظر آئی۔ دودھ سفید، بوتر، بھرے بھرے تھن، بڑی بڑی سیاہ انکھڑیوں میں محبت کرنے والی عورت

ایسی مٹھاس، ان آنکھوں کی کشش عنبر مرئی خوشبو کی طرح انہیں اپنے بازوؤں میں لینے کو بڑھی۔ ہر ڈال مرلی بنی تھی تو پھول شہنائی، ان کے مدھر سُر نشہ طاری کر رہے تھے ڈال ڈال جھولے تو پات پات سندر نین، سارا جنگل کنواری کنیا کے بدن ایسا البیلا اور رسیلا کہ سب کا جنگل کی گود میں سر رکھ کر سو جانے کو جی چاہا ـــــ مور بن کر ناچیں ـــــ کوئل بن کر کوک ماریں ـــــ بھنورا بن کر پھول کی سندرتا لوٹیں۔ ڈالیوں کے جھولے جھولیں اور نینوں کی مدھرا سے من کی چھاگل بھرلیں۔ دودھ رنگ پوتر گائے کی معصوم نظروں میں شانتی کا بلاوہ ان کے ہاتھ پکڑے قدم قدم اس کی اُور لئے جائے تھا ـــــ اچانک وہ سب رک گئے، سب کے ذہن میں بیک وقت ایک ہی بات آئی کہ یہ بھی حقیقت کے برعکس نظر آنے والی اشیاء میں سے نہ ہو۔ اس احساس نے جیسے اُن کے پاؤں پکڑ لئے مگر اُس کے نہیں ـــــ وہ بڑھتا گیا۔ انہوں نے اسے بھائی بھائی کہہ کر پکارا۔ گذشتہ تلخ تجربات یاد دلائے، مل کر منزلیں مارنے کا واسطہ دیا مگر وہ ان سب کے لئے بہرہ، گونگا اور اندھا بن چکا تھا۔ انہوں نے خود کو آیۃ الکرسی کے حصار میں مامون کر لیا تھا۔ مگر وہ اس حصار سے باہر رہا کیونکہ باقیوں کی مانند اب اُسے آیۃ الکرسی اپنے وجود کا حصہ نہ محسوس ہوتی تھی۔ انہوں نے بڑھتا فاصلہ کم کرنے کے لئے اذان کی صورت میں اسے آواز دی مگر اُس کے کانوں میں مُرلی اور شہنائی نے یوں رس گھول رکھا تھا کہ کان میں اور کوئی آواز نہ جا سکتی تھی۔ چنانچہ جب "حیّ علی الفلاح" کو بازگشت واپس لائی تو وہ تنہا تھی۔ اس میں بچھڑے بھائی کی آواز شامل نہ تھی۔

وہ سر جھکائے ٹوٹتی چال سے سفر کر رہے تھے۔ اندھیرے کے باوجود، دہشتناک پرچھائیوں کے باوجود، حقیقت کے برعکس نظر آنے والی اشیاء کے باوجود، کہ عافیت سفر میں تھی۔ یہ احساس بھی تھا کہ یہ چلنا ہی ایک دن اندھیرے جنگل سے روشنی میں لائے گا۔ وہ چلتے رہے اسی طرح تھکے ماندے، یوں کہ دھڑکن اور چاپ ایک ہوگئی۔ اور نبض دُکھ کی تال پر دھڑکی۔

تب اچانک انہیں اپنے ساتھ اس کی موجودگی کا بھی احساس ہوا۔

"تم کہاں سے آئے ہو ــــــ ؟" خاموش نظروں نے پوچھا۔

"میں تو سدا تمہارے ساتھ ہوں۔" مسکراہٹ نے جواب دیا۔

"اچھا ــــــ" انہوں نے بے یقینی سے کہا اور دل میں بے اعتباری پھانس کی طرح کھٹکی۔

"یہ ہم میں سے نہیں ہو سکتا ــــــ کہیں یہ بھی چھلاوہ نہ ہو۔"

وہ حقیقت کے برعکس نظر آنے والی اشیاء سے دھوکے پہ دھوکہ کھا چکے تھے۔۔۔ اب وہ کسی پر اعتبار کرنے کو تیار نہ تھے۔ وہ تو اب پانی کو بھی سراب سمجھ کر اس سے پناہ مانگتے تھے۔ لہٰذا اس نے جب سایوں والے اس دہشت ناک جنگل میں سے سلامتی سے نکال کر عافیت کی روشنی میں لے جانے کا وعدہ کیا تو وہ اور بھی زیادہ مشکوک ہو گئے۔

"نہیں نہیں یہ ہم میں سے نہیں ہو سکتا۔"

ان سب نے اپنی خاموش سوچوں میں اسے مطعون کرنا شروع کر دیا تھا یہ کیسے ہمیں اس تاریک جنگل میں سے نکال کر لے جا سکتا ہے کہ جنگل تو افق تا افق ہے اور تاریکی ہمارے اندر یوں سرایت کر چکی ہے کہ اب ہمارے خون میں خلیوں کی مانند گردش کرتی ہے۔ یقیناً یہ وجود بھی تاریکی کا ایک پیکر ہے۔ غالباً یہ اگیا بیتال ہے جو انہیں ورغلا کر ہلاکت کے گڑھے میں گرانے کو آیا ہے۔ گو انہوں نے اسے اپنے ساتھ چلنے دیا مگر اسے خود سے الگ ہی سمجھتے رہے۔ کیا پتہ کب یہ بھی اپنے اصل روپ میں آ کر ایک بھیانک قہقہہ لگا کر دانت نکوستا حملہ آور ہو کر انہیں ہڑپ کر جائے۔ ہر چند کہ اس نے انہیں نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کی تھی، مگر وہ اسے مشکوک نظروں سے ہی دیکھتے تھے کہ حقیقت کے برعکس نظر آنے والی اشیاء کے اس جنگل میں شک اُن کی پناہ گاہ بن چکا تھا۔ اس حد تک کہ کلی کو انگارہ سمجھ کر اس سے پرے رہتے۔

بعض اوقات وہ ایسی کام کی بات کرتا جو ان کی مشکوک فطرت کے باوجود دل لگتی مثلاً اس کے کہنے پر جب انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ مضبوطی سے تھام کر چلنا شروع

کیا تو برقی رو کی مانند ایک کی توانائی نے دوسرے میں منتقل ہو کر ان کے گرد ایک حفاظتی حصار قائم کر دیا۔ اس نے کہا۔

"میں ایک ایسا راستہ جانتا ہوں جس سے تم سب کو اس تاریک پُر اسرار جنگل سے نکال کر لے جاؤں گا۔"

انہوں نے اس کی بات تو رد کاٹی پر اسے حق بھی نہ جانا۔ لیکن ایک بات تھی کہ اس کی باتوں سے دل میں جگنو اڑتے محسوس ہوتے ہر چند کہ اس کا اعتراف کوئی نہ کرتا۔

ایک خوفناک دریا راہ روکے تھا۔

لہریں مگرمچھوں کے کھلے دہانوں ایسی ہلاکت انگیز تھیں کہ ان کے کف میں آتشیں چنگاریاں تھیں جن سے گرداب شعلوں کے کنوؤں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ یہ منظر العجائب! اب کیا کریں؟ ___ کنارے پر کھڑے لرزاں یہی سوچ رہے تھے۔

"گھبراؤ مت ___ وہ بولا ___ " میں پُل بن جاتا ہوں۔"

انہوں نے بے اعتباری کے خوف سے اُسے دیکھا۔

"ڈرو مت میں سچ مچ کا پُل بن جاؤں گا اور یوں تم مجھ پر سے گزر کر پار اتر جانا۔"

انہوں نے اُسے مشکوک نظروں سے دیکھا ___ ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ یہ ہماری ہلاکت کے لئے ہے۔ اب کیا کریں؟

ان کی شک بھری آنکھوں نے عجب منظر دیکھا۔ اس نے دریا کا کنارہ پکڑ کر اپنا وجود لمبا کرنا شروع کر دیا۔ اتنا کہ اس کے پاؤں دوسرے کنارے سے جا لگے۔ اب وہ ایک پُل کی طرح تنا تھا اور نیچے آتشیں کف والی موجوں کے مگرمچھ منہ کھولے اُن کے منتظر تھے۔

انہیں متامل دیکھ کر وہ بولا۔

"جلدی کرو جلدی۔"

وہ پھر بھی کھڑے رہے۔

"جلدی کرو جلدی، تمہیں کچھ نہ ہوگا۔"

وہ پھر بھی کھڑے رہے۔

"جلدی کرو جلدی۔ ڈرتے کیوں ہو؟"

انہوں نے سوچا ——— پُل پر بھی موت ہے اور پُل کے نیچے بھی موت اور جب مرنا ہی ہے تو پُل پر سے نیچے گرنے کی موت بھی تو موت ہی ہوگی ——— مرنے کی نیت سے جب پاؤں رکھا تو اسے بجا مضبوط پایا۔ وہ حیرت زدہ سلامتی کے کنارے پر آ چکے تھے۔

وہ اس کے مشکور تھے مگر بڑا اعتماد پہلے سے بھی زیادہ۔ یقیناً یہ ہم میں سے نہیں ورنہ یہ بھی ہماری طرح خوفزدہ ہوتا۔ لاریب، کہ یہ بھی حقیقت کے برعکس نظر آنے والی اشیاء میں سے ہے۔ بھلا انسان دوسرے انسان کا پُل بن سکتا ہے ——— پھر سوچتے، مگر اُس نے روپ بدل کر دیگر چھلاووں کی طرح دھوکہ تو نہیں دیا، نہ ہی خوفزدہ کیا ——— شاید یہ مافوق الفطرت مخلوق خدا نے ہماری امداد کے لئے بھیجی ہو۔ چلو، اس کے ساتھ چلتے جاتے ہیں ہمارا کیا لیتا ہے پھر اب تک اس نے کوئی نقصان بھی تو نہیں پہنچایا۔

اب وہ ایک ایسے مقام پر آ پہنچے تھے جہاں ہزاروں فٹ گہرائیاں منہ کھولے کھڑی تھیں۔ اور سامنے نظر آنے والی عافیت کی پہاڑی اگرچہ نزدیک نظر آتی تھی مگر درحقیقت وہ بہت دور تھی۔ وہ سب گھبرا کر رک گئے۔

"گھبراؤ مت"۔ وہ بولا ——— "میں رسہ بن جاتا ہوں۔"

اب اُن کی نگاہوں کے سامنے رسہ تنا تھا۔ اس پہاڑ سے اُس پہاڑ تک جن کے درمیان موت کا کھُلا دہانہ تھا۔ اس مرتبہ بھی وہ جھجکے مگر اتنے نہیں اور انہوں نے اس رسہ پر سے ہلاکت کی طرف بلانے والی گہرائیوں کو سلامتی سے پار کر لیا

اگرچہ وہ اُس کی موجودگی سے کچھ کچھ مانوس ہوتے جا رہے تھے مگر اس کا اپنے سے الگ ہونے اور جو ہے وہ نہ ہونے کا احساس قوی سے قوی تر ہوتا گیا۔ ایک موقع

پر اس نے کہا۔

"یہاں دلدل ہے۔"

جبکہ وہاں خشک زمین نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے کہا مان کر وہ موڑ چھوڑ دیا مگر تشفی کرنے کے لئے جب ایک بڑا سا پتھر پھینکا تو وہ ان کی نگاہوں سے روپوش ہو گیا۔ ایک مرتبہ اس نے سایوں میں سایہ بنے ایک پُراسرار ہیولٰی سے انہیں خبردار کیا۔

یہ سب تو ٹھیک تھا مگر ان کے دل میں اعتماد کے برعکس یہ احساس گہرا ہوتا گیا کہ یہ ہمدرد تو ہے۔ لیکن یہ ہم میں سے نہیں ہے یقیناً یہ حقیقت کے برعکس نظر آنے والی اشیاء میں سے ہے اور ایک روز ہماری ہلاکت کا باعث بنے گا لیکن کسی اور طریقہ سے۔ شاید ہمیں ہلاکت کی مختلف صورتوں سے اس لئے بچا رہا ہے کہ ہمارے لئے کوئی خاص ... موت سوچ رکھی ہے یہ یقیناً چھلاوہ ہے جو انسان کا روپ دھارے پھر رہا ہے۔ دن بدن اِن کا یہ احساس گہرے سے گہرا ہوتا گیا اور یہ یقین پختہ سے پختہ تر ہوتا گیا کہ ایک دن یہ ہمیں ہلاکت کے گڑھے میں ضرور دھکیل دے گا۔ اور تب انہوں نے سوچا کیوں نہ ہم ہی اسے پہلے مار دیں —— یہ سوچا اور دل میں اس کے قتل کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ مگر اسے ماریں کیسے؟ —— وہ ان کے مقابلے میں بیحد قوی تھا۔ وہ روپ بدل سکتا تھا —— ہو سکتا ہے جسے ہم قتل کریں وہ اس کا حقیقی روپ ہی نہ ہو۔

تب ایک دن وہ یوں گویا ہوا۔

"میں جانتا ہوں تم کیا سوچ رہے ہو؟"

کسی نے جواب دینے کی کوشش نہ کی

"تم مجھے مارنے کے طریقے سوچ رہے ہو۔"

انہوں نے نظریں جُھکا لیں۔

"میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ تم کیوں مجھے مارنا چاہتے ہو۔ اس لئے کہ اب تک تم نے مجھے

اپنے میں سے نہ جانا۔"

ان کی زبانوں نے جھوٹ بولنے سے انکار کر دیا تھا۔

"لیکن تم مجھے مار نہیں سکتے۔"

انہوں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اس لئے کہ تم مجھ میں ہو اور میں تم میں ہوں۔ مجھے مارنا خود کو مارنا ہوگا۔"

وہ لاتعلقی سے سنتے رہے مگر دل دھڑک رہے تھے۔

"کیا تم واقعی مجھے مارنے پر تُل گئے ہو؟"

ان کی خاموشی مکمل رضامندی تھی۔

"اچھا تو آؤ مجھے مار دو۔"

وہ اُن کے سامنے لیٹ گیا —— وہ خاموش گھیرا باندھے اُسے دیکھ رہے تھے —— کہیں اس میں بھی کوئی چال نہ ہو۔

"میرے دل میں پیش قبض اُتار دو کہ اسی طرح میں مر سکتا ہوں۔"

انہوں نے مشکوک ہو کر سوچا —— یقیناً اس میں اس کی کوئی چال ہے ورنہ خود ہی لیٹ کر اپنے مرنے کی ترکیب کبھی نہ بتاتا۔ اس میں کوئی بہت بڑا چکر ہے۔

"دیر نہ کرو! ورنہ میری موت کا تماشہ دیکھنے والوں میں اضافہ ہوتا جائے گا۔"

انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ جانوروں کا ہجوم تھا۔ چھوٹی چھوٹی مکار آنکھوں والے ہاتھی کے دانت گویا مجرم قرار دینے والی انگلی سے اس کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ اس کے پاس داڑھیوں والے بکرے تھے جن سے بُو کے بھبھاکے اٹھ رہے تھے۔ ان کے پاس گِرگِٹوں کی لُو سے خاصے بے چین اُونٹ احمقانہ انداز میں تھوتھنیاں اٹھائے کھڑے تھے۔ پھر گدھ تھے، چیلیں تھیں، کوے تھے، کنکھجورے تھے اور بچھو اور سانپ بھی حتیٰ کہ مکھیاں، ٹڈیاں اور جھینگر بھی تماشائی تھے۔

وہ بولا ـــــ "جلدی کرو۔ موت کو کم سے کم تماشہ بنانا چاہیئے۔"

ان کا خیال تھا کہ مرنے پر بجلی کڑکے گی، سُرخ آندھی چلے گی، زلزلے آئیں گے مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ اس کے دل سے محبت سے منور روشن خون نکلا۔ ان کا خیال تھا کہ اس میں بھی کوئی شعبدہ ہوگا ـــــ مگر نہیں، وہ آرام سے مرگیا۔ نہ اس نے کوئی چال چلی نہ کوئی نیا روپ دھارا ـــــ کیا یہ واقعی مرگیا ہے۔ انہیں یقین نہ آرہا تھا ـــــ ان کے پیچھے جانوروں کا پھیلا ہوا دائرہ ساکت تھا۔ سب کی آنکھیں لاش پر مرکوز تھیں ـــــ انہیں توقع تھی کہ شاید اس لاش میں سے کوئی دھماکہ ہوگا اور ان سب کے چیتھڑے اڑ جائیں گے مگر کچھ نہ ہوا۔ نہ ہی اس کے خون نے کسی اور پُراسرار شے کا روپ دھارا۔ یہ سب کچھ نہ ہونا انہیں اور زیادہ ہراساں کر رہا تھا۔

وہ جانوروں کے گھیرے میں اس کی لاش چھوڑ کر آگے نکل آئے تھے لیکن پیچھے مڑ مڑ کر بھی دیکھتے جاتے کہ کہیں وہ آ تو نہیں رہا۔ پھر اس لئے مڑ مڑ کر دیکھتے رہے کہ شاید وہ آجائے اور پھر اس لئے مڑ مڑ کر دیکھتے رہے کہ اے کاش وہ آجائے۔

وہ پہلے سے بھی زیادہ خوفزدہ تھے کہ تاریکی پہلے سے بھی زیادہ تاریک تھی اور اندھیرے میں پہلے سے بھی زیادہ اندھیر تھا۔ انہوں نے اسکے بنائے ہوئے طریقہ کے مطابق ایکدوسرے کے ہاتھ تھام کر حفاظت کا حصار قائم کرنا چاہا۔ لیکن اب اُن میں توانائی کی برقی رو کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ پاؤں جیسے آگے کے، بجائے پیچھے پڑ رہے تھے ـــ سفر طے نہ ہو رہا تھا کہ انہیں دائروں میں گھومنے کا احساس ہو رہا تھا۔ دل خوف کی آہنی مٹھی میں دبا جا رہا تھا۔ انہوں نے بیچارگی سے ایکدوسرے کی طرف دیکھا ان میں سے ایک نے خوف سے جھرجھری لے کر آیۃ الکرسی کا ورد شروع کرنا چاہا مگر وہ تقویت بخش آیات ذہن سے محو ہو چکی تھیں۔ پھر اس نے اذان دینے کو منہ کھولا تو معلوم ہوا کہ حلق بیٹھ چکا ہے۔ لہٰذا کھلے منہ سے صرف سہمی سہمی سانسیں باہر نکل رہی تھیں ـــ تب انکی آنکھوں سے آنسو نکلے اور سوکھے ہونٹوں سے دُعا۔

"اے اللہ! ہم ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کو تیار ہیں۔"

اب وہ چاروں خاموش سر جھکائے۔ آنکھیں بند کئے موت کے منتظر بیٹھے ہیں۔

زنجیر

ہلتے لب کالے کالے، ہونٹ موٹے چھوٹے باریک، زبانیں سرخ سیاہ لمبی، باتیں چھوٹی بڑی اچھی بُری، بحث سیاسی مذہبی اقتصادی، آنکھیں کھلی بند ادھ کھلی، کان بند، شور سے بند، اپنی باتوں کے شور سے بند۔ شور ریل کا، آدمیوں سے بھرے ڈبے میں شور، آدمیوں سے بھری ریل کے باہر پٹڑیوں پر دوڑتے پہیوں کا شور — شور! شور! شور!!!

باتوں بھرے ڈبے میں کسی کو زنجیر ہلتی دکھائی نہ دے رہی تھی، زنجیر دائیں بائیں یوں ہل رہی تھی جیسے سٹر ہلا کر اپنی جانب متوجہ کر رہی ہو۔ کچھ کہہ رہی ہو، سمجھا رہی ہو، منع کر رہی ہو۔

"خطرے کے وقت زنجیر کھینچی جائے۔ بلا ضرورت زنجیر کھینچنے والے کو پچاس روپے جرمانہ ہوگا اور اسے حوالۂ پولیس بھی کیا جا سکتا ہے۔"

ویسے کوئی خطرے کی بات تو نہ تھی، ریل کا انجن نیا تھا اور تازہ آگ پانی کھا کر شوک رہا تھا، دوسرے کو اپنے خطرہ سے متنبہ کرنے والی اس کی وسل میں بھی بڑی کاٹ تھی، چنانچہ ریل کی پٹڑی اور ساتھ بھاگتے کھیتوں میں اطمینان سے چرتے مویشی اور سکون سے جگالی کرتی بھینسیں اس وسل کے خطرے کو محسوس کر کے بھاگ نکلتیں اور پھر ان کے پیچھے ان کے اونگھتے رکھوالے بھی بھاگتے دیکھے جا سکتے تھے۔ واقعی تازہ آگ پانی کھائے انجن میں بڑا خطرہ تھا مگر ان کے لیے جو پٹڑی کی حد سے باہر تھے، ان کے لیے نہیں جو ریل کے ڈبوں میں بند اپنے شور میں ملفوف بیٹھے تھے، واقعی کوئی خطرے کی بات نہ تھی۔

تو پھر خطرے کا احساس کیسا؟ بس یوں محسوس ہوتا گویا ریل غلط سمت جا رہی ہے اور ان

اسٹیشنوں سے گذر رہی ہے۔ جنہیں اس سفر میں نہ آنا چاہیئے اور بالآخر کسی ایسے اسٹیشن پر رے جائے
گی جس کے لیے ٹکٹ نہ خریدا گیا تھا۔ لیکن دیکھا جائے تو یہ بھی کوئی ایسی خطرناک بات نہ ہوتی، اصل
اسٹیشن کے برعکس کسی غلط اسٹیشن پر جا اترنے میں کم از کم جان کا خطرہ تو نہیں ہوتا، ہاں یہ خطرہ تو ہو
سکتا ہے کہ شاید غلط اسٹیشن پر اصل اسٹیشن کے لیے ٹکٹ نہ بکتا ہو!

زنجیر کھینچی جائے یا نہ کھینچی جائے تو یہ ابھی TO BE OR NOT TO BE? ایسا اہم
مسئلہ نہ بنا تھا، پھر یہ زنجیر گردن ہلا ہلا کر کیا کہہ رہی ہے؟ ترغیب دے رہی ہے یا منع کر رہی ہے؟

گاڑی کا انجن نیا ہے اور اپنے نئے پن کے نشے میں سرشار، ادھر اس نے جو تازہ تازہ آگ
پانی کھایا ہے تو وہ بھی اس کے معدے میں بھاپ بن کر کلکلیاریاں مار رہا ہے۔ زیادہ کھانے میں خطرہ
تو ہے مگر آدمیوں کے لیے، انجنوں کے لیے نہیں۔ تو پھر دوسروں کو خوفزدہ کرنے والی چیخیں مارنے
والے اس انجن سے اسے کیوں خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ یہ انجن تو آگ پانی کھا کر ان سب کا بوجھ خوش
خوش کھینچے جا رہا ہے تو یہ زنجیر کیوں بار بار سر ہلا رہی ہے۔ یقیناً کوئی نہ کوئی بات ہے ضرور!

لیکن خطرہ اس کے اعصاب میں کیوں گھنٹی بجا رہا ہے اور زنجیر صرف اسی سے کیوں مخاطب
ہے۔ کیا سلامتی گرجتے شور کرتے انجن میں ہے اور اس کے پیچھے پیچھے دیوانہ وار بھاگتے ڈبوں میں ہے؟
یا زنجیر میں ہے جسے بلاوجہ کھینچنے پر جرمانہ اور قید کی سزا بھی ہو سکتی ہے؟ کہیں یہ تو نہیں کہ یہ
سزا محض زنجیر کھینچنے ہی کی ہو۔ وجہ اور بلاوجہ کا فرق۔ زنجیر کھینچے بغیر کیسے معلوم ہو سکتا ہے، کہیں
یہ تو نہیں کہ سلامتی صرف زنجیر کھینچنے ہی میں ہو؟

"دس بارہ قدم چل کر پیچھے دیکھا تو آدمیوں کو نہ پایا اور نہ دروازہ ہی نظر آیا مگر ایک جنگل لق دق
موجود تھا۔ متفکر ہوا، دائیں بائیں نکل کر اضطراب سے ادھر ادھر بھٹکتا رہا، چند روز کے بعد
ایک سمت کا راستہ لیا۔ تھوڑی دور گیا تھا کہ ایک آدمی پر نظر پڑی۔ کیا دیکھتا ہے کہ وہ اس کی طرف
آ رہا ہے۔ جب نزدیک پہنچا تو حاتم کو سلام کیا اور آئینہ بغل سے نکال کر حاتم کو دیا۔ حاتم نے لے کر
اپنا منہ دیکھا اور پوچھا کہ "تو تو حجام ہے جو آئینہ دکھاتا ہے۔"؟

اس نے کہا "البتہ! جس شخص کو دیکھتا ہوں اسے لے جاکر حمام میں نہلاتا ہوں۔ اگر آپ بھی چل کر حمام کریں تو آپ کی بدولت کچھ مل رہے گا۔"

حاتم حجام کے ساتھ چلا، دو تین کوس چلے تھے کہ ایک گنبد نظر آیا۔ حجام حمام کے اندر گیا اور حاتم کو بلایا۔ وہ جونہی داخل ہوا دروازہ بند ہوگیا۔ آخر کار حجام اسے ایک حوض پہ لے گیا اور کہا کہ آپ اس میں اتریں تو میں بدن پہ پانی ڈالوں اور لنگی پاکیزہ، بہت تحفہ، حاتم کو باندھنے کو دی، جب وہ حوض میں اترا تو حجام نے ایک بڑا طاس گرم پانی سے بھر کر اس کے ہاتھ میں دے دیا جو اس نے سر پہ ڈال لیا۔ جب تیسری مرتبہ حاتم نے طاس سر پہ ڈالا، وہیں ایک تڑاقا ہوا کہ حمام میں اندھیرا ہوگیا۔ ایک ساعت کے بعد تاریکی جاتی رہی تو کیا دیکھتا ہے کہ نہ حجام ہے نہ حمام ہے نہ حوض، ایک تراشا ہوا گنبد ہے۔ اس کا تمام صحن پانی سے بھرا ہوا ہے۔ ایک دم نہ گزرا تھا کہ پانی پنڈلیوں تک آگیا۔ حاتم عاجز ہوگیا۔ ادھر اُدھر دیکھنے لگا اور پانی بڑھ کر گھٹنوں سے بھی اونچا ہوگیا، تب وہ گھبرایا، یکایک مضطرب ہوکر دروازے کی طرف بڑھا، چاروں طرف سر ٹکرایا، راستہ نہ پایا۔ اتنے میں پانی ڈباؤ ہوگیا۔ یہ تیراک تھا۔ تیرنے لگا۔ الغرض! اس قدر بلند ہوا کہ اس کا سر گنبد میں جا لگا۔ یہ نہایت ماندہ ہوا، ہاتھ پاؤں شل ہوگئے، قریب تھا کہ ایک ہی دفعہ بیٹھ جائے کہ ایک زنجیر لٹکی ہوئی دکھائی دی۔ حاتم نے بے اختیار دونوں ہاتھوں سے زنجیر پکڑ لی کہ پھر ایسی ہی آواز آئی اور اپنے آپ کو گنبد کے باہر جنگل میں کھڑا دیکھا۔ یکایک ایک عمارت عالی شان چمکتی ہوئی نظر آئی۔ اس طرف روانہ ہوا۔ جب نزدیک پہنچا ایک خوش قطع پرفضا باغ دیکھا۔ جس کا دروازہ کھلا تھا۔ حاتم اندر چلا گیا۔"

ہلتے لب کالے کالے، ہونٹ موٹے چھوٹے باریک، زبانیں سرخ سیاہ ملبی، باتیں چھوٹی بڑی اچھی بری، بحث سیاسی مذہبی اقتصادی، آنکھیں کھلی بند ادھ کھلی، کان بند، شور سے بند، اپنی باتوں کے شور سے بند، شور ریل کا، آدمیوں سے بھرے ڈبے میں شور، آدمیوں سے بھری ریل کے باہر پٹڑیوں پہ دوڑتے پہیوں کا شور۔ شور! شور!! شور!!!

وہ اپنے پڑوسی کے کان میں سرگوشی کرتا ہے، اسے خطرے سے مطلع کرتا ہے مگر پڑوسی کچھ نہیں سن پاتا، پھر زور سے کہتا ہے اور پھر اور زور سے ـــــ مگر پڑوسی اس کی طرف توجہ نہیں دیتا، تب وہ اسے جھنجھوڑتا ہے جس پر پڑوسی اسے بتاتا ہے کہ وہ سننے کے قابل نہیں اور یہ کہ کر وہ بہرہ سرگوشیوں میں ساتھ والے سے کوئی بات کرتا ہے۔ وہ دونوں اسے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں، پھر سرگوشیاں کرتے ہیں اور ہنستے ہیں۔

باہر مناظر گڈمڈ ہیں۔ میدان کھیت کھلیان مویشی آدمی سب دھبے بن کر اڑتے جا رہے ہیں۔ انجن کی رفتار بے حد تیز ہے اور کمال ہے کہ اس تیز رفتاری اور پٹڑیاں بدلنے کی کھٹ کھٹا کھٹ میں بعض لوگوں کے لیے لوری ہے، وہ اطمینان کے ساتھ ٹیک لگائے سو رہے ہیں، ریل کے جھٹکوں کی تال پر ان کے سر جھولتے ہیں، بالکل چابی بھرے باوے کی طرح۔

الڑ بلڑ باوے دا
باوا کنک لیاوے گا۔
باوی بہ کے چھٹے گی
باوا بہ کے کھاوے گا۔

ہائیں! یہ بے تکی لوری اسے کیسے یاد آگئی، یہ تو بچپن میں ماں بہلانے کو سنایا کرتی تھی، مثلاً اس وقت جب اسے بھوک ستاتی اور وہ ٹھنک ٹھنک کر کھانا مانگتا تو ماں اسے الڑ بلڑ باوے میں الجھا لیتی۔ اسی طرح پیسے مانگنے پر، نئے کپڑے مانگنے پر، نئی ٹوپی مانگنے پر، الغرض ہر مطالبے پر وہ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں اس کا سر پکڑ لیتی۔ الڑ بلڑ کرتی جاتی اور اس کا سر ہلاتی جاتی ـــــ اور وہ سچ مچ باوا بن جاتا۔ خود بخود سر ہلانے لگتا اور زور زور سے الڑ بلڑ کرتا جاتا۔ مگر یہ ڈبے کے مسافر صاف خطرے کو بھانپے بغیر خود بخود کیوں الڑ بلڑ باوے بن گئے ہیں۔ اسے خاص طور پر اس شخص پر غصہ آ رہا تھا جو گھڑیال کے پنڈولم کی مانند ہلتی زنجیر کے عین نیچے بیٹھا زنجیر کھینچنے کی بجائے آلتی پالتی مارے اخبار میں گم تھا۔

اس کے قریب ہی ایک شخص سیٹ پر بیٹھا نماز پڑھ رہا تھا! اس نے تو قبلے کی طرف پیٹھ کر رکھی ہے اور انجن کی سمت سجدہ کر رہا ہے - اس نے سوچا شاید مجھے ہی مغالطہ ہوا، بھلا مسلمان غلط سمت میں کیسے سجدہ کر سکتا ہے، مگر نہیں ڈوبتے سورج سے قبلے کی سمت کا تعین کچھ ایسا مشکل نہ تھا تو پھر اس مردِ خدا نے انجن کو کیسے قبلہ مان لیا - وہ دوسرے مسافروں کی جانب اس توقع پر دیکھتا ہے کہ شاید کسی کو اس غلطی کا احساس ہوا ہو مگر سب اپنے آپ میں مگن تھے - کوئی نمازی کی طرف نہ دیکھ رہا تھا کہ وہ کدھر سجدہ کر رہا ہے - وہ کوئی ایسا پکا مسلمان تو نہ تھا کہ خواہ مخواہ تبلیغ کرتا پھرے، مگر پکا مسلمان نہ ہونے کے باوجود بھی وہ ایک مسلمان کو قبلے سے ہٹ کر کسی اور جانب سجدہ کرتے نہ دیکھ سکتا تھا، اس لیے وہ اٹھا اور لوگوں کی بھیڑ میں سے بمشکل اپنے لیے راستہ بناتا ہوا اس کی طرف گیا - اس نے نمازی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے بتانا چاہا، مگر نمازی آنکھیں بند کیے اس خضوع و خشوع سے نماز پڑھ رہا تھا کہ اس کی نماز میں خلل ڈالنے کو جی نہ مانا، چنانچہ خاموش اس کے پاس کھڑا رہا، جب وہ سلام پھیر چکا تو اس نے اسے اس کی غلطی کے بارے میں بتایا - اس پر وہ اللہ کا نیک بندہ یوں گویا ہوا: "سفر میں قبلہ کی طرف منہ کرنا ضروری نہیں جدھر جی چاہے منہ کر کے نماز ادا کر لو۔"

"مگر انجن کی طرف ہی کیوں؟"

وہ کچھ دیر اسے ترس کی نگاہ سے دیکھتا رہا، جیسے کسی بچۂ نادان کو دیکھتے ہیں - پھر پکار کر بولا: "اس لیے کہ اس کی طرف منہ کرنے میں سہولت ہے۔"

"سہولت" وہ بولا - "کیا تمہیں معلوم نہیں کہ انجن غلط سمت میں جا رہا ہے۔"

"اے لو۔" وہ تمسخر اڑانے والے لہجے میں لوگوں سے مخاطب ہو کر بولا: "اس ریل بابو کی سنی؟" سب کی نگاہیں اسے سوئیوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔ "جناب فرماتے ہیں کہ انجن غلط سمت جا رہا ہے۔"

"ہا ہا ہا" ایک دم سیاہ سفید زرد دانت باہر نکل آتے ہیں۔ "انجن کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔"

"انجن ہی تو منزل تک پہنچاتا ہے۔"

"انجن پر بھروسا نہ رکھو گے تو سفر عذاب بن جائے گا۔"

"اگر تمہیں صحیح راستے کا علم ہے تو گاڑی سے اتر کیوں نہیں جاتے۔"

وہ دانتوں آنکھوں اور زبانوں پر سے چیخ کر کہتا ہے: "میں خطرہ کی زنجیر کھینچنا چاہتا ہوں۔"

اس پر سب ایک دم ساکت ہو جاتے ہیں، اس کی طرف سے نظریں چرا لیتے ہیں۔ اب اس کے چہرے کی طرف کوئی خشمگیں نظر نہیں اٹھ رہی۔ ایک بزرگ اسے سمجھاتا ہے۔ "بیٹا بلا وجہ زنجیر کھینچنے کی سزا جرمانہ ہے۔"

"اور تم حوالۂ پولیس بھی کیے جا سکتے ہو۔" دوسرا لقمہ دیتا ہے۔

تب شہنشاہ جہانگیر نے کہ عدل اس کی سرشت میں تھا، سونے کی ایک لمبی زنجیر بنوائی۔ اس زنجیر کے لیے سلطنت کے دور دراز حصوں سے سونا جمع کیا گیا، رعایا کو اپنے محبوب شہنشاہ کی انصاف پروری پر اتنا اعتماد تھا کہ کنواریوں نے اپنے چاہنے والوں کی دی ہوئی انگوٹھیاں دے دیں، بیاہتا نے سہاگ ٹیکا اور عورتوں نے کنگن، اتنا سونا اکٹھا ہو گیا، اتنا سونا اکٹھا ہو گیا کہ اس سے سونے کی اتنی لمبی زنجیر بن سکتی تھی کہ تمام سلطنت پر محیط ہوتی۔ مگر شہنشاہ کو بہت زیادہ لمبی زنجیر کی ضرورت نہ تھی، صرف اتنی کہ ایک سرا محل کی دیوار کے نیچے لٹکتا رہے تاکہ اس سے بندھی سونے کی گھنٹی ہلائی جا سکے۔ زنجیر کی ساخت میں بہترین مغل کاریگری کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔ زنجیر کا سرا زمین سے خاصا اونچا رکھا گیا۔ اس میں یہ مصلحت تھی کہ کہیں آتے جاتے لوگ یوں ہی شوقیہ زنجیر ہلاتے جائیں۔[1]

جلتے لب کالے کالے، ہونٹ موٹے چھوٹے باریک، زبانیں سُرخ سیاہ لمبی، باتیں چھوٹی

---

[1]: اس زنجیر کو کتنے مظلوموں نے ہلایا۔ اس کے بارے میں "تزک جہانگیری" خاموش ہے، البتہ تاریخوں میں ایک دھوبن کا واقعہ ضرور ملتا ہے (حوالے کیلئے ملاحظہ ہو ہدایت کار سہراب مودی کی فلم "پکار")

بڑی اچھی بُری، بحث سیاسی مذہبی اقتصادی، آنکھیں کھلی بند ادھ کھلی، کان بند، شور سے بند، اپنی باتوں کے شور سے بند، شور ریل کا، آدمیوں سے بھرے ڈبے میں شور، آدمیوں سے بھری ریل کے باہر پٹڑیوں پر دوڑتے پہیوں کا شور۔ شور! شور!! شور!!!

اسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا ڈبے کے سب لوگ زنجیر سے چشم پوشی کی سازش میں شریک ہوں۔ یہی نہیں وہ ان کی نیتوں کو ان کے جسموں سے اٹھتے تعفن کی طرح محسوس کر رہا تھا۔ ویسے بھی ڈبے میں بے حد حبس تھا اور بدبودار پسینہ گاڑھے تیل کی طرح مساموں سے خارج ہو رہا تھا۔ ڈبے میں عجیب ناگوار سی بو تھی۔ جیسی چڑیا گھر میں ہوتی ہے۔ لومڑ، بھیڑیا، لگڑ بھگا اور پہاڑی بکرے، یوں محسوس ہوتا گویا وہ ان سب کے ساتھ ایک ہی پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ وہ ان سب کو شکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا اور وہ اسے خونخوار نگاہوں سے۔ ایک آدمی ہنسا تو اسے اس کے لمبے لمبے دانتوں میں گوشت کے ریشے نظر آئے۔ ایک شخص پوری دھوتی اٹھا کر سیاہ بالوں سے بھری ہوئی موٹی رانوں کے بیچ کھجلی کر رہا تھا۔ اسے کراہت کا شدید احساس ہو رہا تھا۔ ایک اور شخص نے زور زور سے آخ تھو کی اور سیاہ بلغم کا گولا پاؤں کے پاس اگل دیا۔

خدایا! میں کن لوگوں میں پھنس گیا ہوں، میرا اور ان کا کیا تعلق ہے؟ میں نے تیرا کیا بگاڑا کہ ان کا ہم سفر کیا۔ نماز نہ پڑھنے کی اتنی بڑی سزا؟ کیا انجن کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے والا مجھ سے زیادہ نیک ہے کہ وہ غلط رُخ پر قبلہ بنا کر مطمئن ہے۔

اس نے کراہت سے منہ پھیر کر گردن کھڑکی سے باہر نکال دی اور تب اچانک کوندے کی لپک کی مانند خطرے کے غیر مبہم احساس نے ٹھوس روپ اختیار کر لیا۔ اصل خطرہ تو یہ ہم سفر تھے، جنہیں کسی خطرے کا احساس نہ تھا، جو بے شعوری کی جنت میں مگن تھے، اسی لیے اسے انجن کے غلط سمت جانے کا دھڑکا لگا تھا اور انہیں نہیں تھا۔ اسی لیے انھیں زنجیر کھینچنے کی ضرورت کا احساس نہ تھا۔

اس نے خود پر نفرین کی کہ اب تک ان کا ہم سفر رہا اور ان کی نیتوں کے تعفن کو اتنی دیر میں محسوس کیا اور اس احساس نے اسے خوف زدہ کر دیا کہ انسان ہو کر وہ اتنی دیر تک جانوروں کا ہم سفر رہا۔

اس نے جھولتی زنجیر کی طرف دیکھا۔ وہ ڈبے کے آخری سرے پر تھی۔ اس کے اور زنجیر کے درمیان جانور ہی جانور، طرح طرح کے جانور، دانت نکوسے، پنجوں کے ناخن تیز کر رہے تھے۔ وہ سب خاموش اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ وہ ان کی زرد مٹیالی اور سرخ آنکھوں میں اپنے لیے خوف دیکھ رہا تھا۔ ان کی رالوں سے لتھڑی زبانیں کھلے جبڑوں سے لٹک رہی تھیں، خوف نے اس کی ریڑھ کی ہڈی کو سن کیا تو چہرے پر ڈر پسینے کی صورت میں نمودار ہو گیا۔ اس پر سرد کر دینے والی اس حقیقت کا انکشاف ہو چکا تھا کہ وہ اب اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے تھے کہ وہ ان کی اصلیت جان چکا ہے۔

زنجیر اب عافیت کا کنارہ تھی۔

وہ خاموش اسے گھور رہے تھے۔ اس نے بے خوفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی کوشش کی لیکن ان بھوکی آنکھوں کے نرغے میں وہ خود کو مجرم محسوس کر رہا تھا۔ اگر وہ ایک مرتبہ زنجیر کھینچ ڈالے تو پھر یہ اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ گاڑی رکتے ہی اس نائٹ میئر کا خاتمہ ہو جائے گا اور اچھا برا جیسا بھی اسٹیشن ملے، وہ اتر کر ان کے شر سے محفوظ ہو جائے گا۔

وَ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ۔ آج اس آیت کی عظیم معنویت اس پہ صحیح معنوں میں آشکار ہوئی تھی۔ یہ ترجمہ لفظی نہ تھا، عملی تجربہ تھا!

وہ ابھی تک اسے گھورے جا رہے تھے، لاتعداد آنکھیں، کھلے منہ اور پنجوں کی طرح تنے ہاتھ۔ یہ ایک حصار تھا مگر اسے توڑنا بھی ضروری تھا۔ ورنہ وہ ان سے بچ نہ سکے گا۔

اس نے شیشے کی کرچیوں کی طرح ٹوٹتی ہمت کو جوڑا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اب بھی خاموش تھے، مگر نظروں کا جال اس کے گرد تنگ کرتے جا رہے تھے۔ صرف ایک جست درکار تھی اور پھر زنجیر اس کے ہاتھ میں ہوگی۔

ان کی آنکھیں خون کبوتر ہو گئیں، ان کے حلقوں سے غصیلی آوازیں نکلیں، ان کی انگلیوں کے ناخن بڑھ گئے، ان کے جسموں کی بو ناقابل برداشت ہو گئی، ان کی زبانیں باہر کو لٹک گئیں

اور رال لپالپ ٹپک رہی تھی۔ اس نے زنجیر کی جانب جو چھلانگ لگائی۔ وہ ان کے دائرے میں ٹوٹ گئی۔ وہ خوف سے گنگ تھا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھ رہی تھیں اور ہلتے ہونٹوں میں آیت الکرسی تھی۔ انہوں نے اسے کسی بادے کی طرح اٹھالیا اور گلے میں زنجیر پھنسا کر اسے لٹکا دیا۔

جب چیکر ڈبے میں داخل ہوا تو اسے سب ٹھیک نظر آیا۔ اس نے سب کے ٹکٹ چیک کیے۔ سب کے پاس ٹکٹ موجود تھے۔ لوگ اب ایماندار ہو گئے ہیں۔ اس نے خوش ہو کر سوچا، ساری گاڑی میں ایک مسافر بھی بے ٹکٹ نہیں ہے۔ کمال ہے!

پھر اس کی نگاہ زنجیر پر پڑی جس سے بندھا ایک بادا جھول رہا تھا۔ وہ یوں مضحکہ خیز طریقے سے ہلتے بادے کو دیکھ کر بہت ہنسا۔ مسافر بھی اس کی ہنسی میں شریک ہو گئے۔ ریل کا سفر اچانک بے حد خوشگوار ہو گیا۔

ظلِّ ہُما

خلقت رنجور، عمائدین دل گرفتہ اور کل عالم ملول، قصرِ شاہی پہ پرچم شاہ سرنگوں، محلات کی بیگمات بال بکھیرے سوگوار، آنکھیں اشکبار اور ہونٹوں پر سرد آہیں —— اپنی اولاد کو دیکھتیں تو تاسف سے سر ہلاتیں مگر کچھ کر نہ پاتیں کہ کارکنانِ قضا و قدر کے ہاتھوں بے بس تھیں۔

شہنشاہ عالم، گیتی پناہ، مالک تاج و تخت شاہی، معظم الملک مظفر العالم انتقال فرما گئے تھے۔

رسومِ تدفین کے بعد ارکین مملکت، عمائدین سلطنت مقربان خاص اور دربارِ شاہی کے رتن، خالی تخت اور بے سر تاج کے سامنے صلاح و مشورے کے لئے باہم جمع ہوئے تو ہر دل کے سرور اور ہر آنکھ کے نور کو اپنے درمیان نہ پاکر اشک آنکھوں میں بھر بھر لاتے۔

تب وزیر باتدبیر نے اراکینِ مملکت، عمائدینِ سلطنت، مقربانِ خاص اور دربارِ شاہی کے رتنوں سے یوں خطاب فرمایا:

"دنیا سرائے فانی ہے، اس لئے ظلِ ہما کا ماتم برحق، ہم سب بھیڑوں کے گلے کی مانند تھے اور ظلِ ہما راعی! مگر اُمورِ مملکت تعطل میں نہیں رکھے جا سکتے۔ تخت خالی نہیں رہ سکتا کہ خالی تخت پر

شیطان قابض ہو جاتا ہے اور تاج بے سر نہیں رہ سکتا کہ تاج صرف سرِ شاہ پر ہی سجتا ہے اگر یوں نہ ہو تو ملک میں انتشار رواج پا جاتا ہے اور بھیڑوں کا گلہ بے ترتیب ہو کر اس انتشار میں مزید اضافہ کا موجب بنتا ہے ، لہٰذا دستورِ ملک اور آئین مملکت کے مطابق اپنی عظیم روایات کی پیروی کرتے ہوئے ہمیں اپنے لئے نئے بادشاہ کا انتخاب کرنا ہوگا۔ آج سوگ کی آخری رات ہے ۔ کل طلوعِ آفتاب سے پہلے حسبِ قاعدہ ہما اُڑایا جائے گا اور وہ جس کے سر پر بیٹھ گیا۔ وہی ہمارے لئے شہنشاہ معظم ہوں گے کہ وہ ظلِ ہما ہوں گے ۔ آپ جانتے ہیں کہ شاہی کا تعلق بازو کی قوت ، دماغ کی عقل اور قلب کی نیکی سے نہیں بلکہ صرف اور صرف مقدّر سے ہے "

اراکینِ مملکت ، عمائدینِ سلطنت ، مقربانِ خاص ، دربارِ شاہی کے رتن اور تمام رعایا یہ اعلان سن کر بے حد مطمئن ہوئی کہ مملکت کی عظیم روایات کا اس مرتبہ بھی تحفظ کیا جا رہا ہے ورنہ اگر وزیر باتدبیر خود ہی تاج و تخت پر قابض ہو جاتا تو کسی نے اس کا کیا کر لینا تھا ۔ ویسے آج تک کبھی بھی ایسا نہ ہوا تھا ، چنانچہ وہاں بادشاہ کا انتخاب ہمیشہ ہما ہی کیا کرتا کہ ہما خوش بختی کی نشانی تھا اور اسی لئے پرندوں کی دنیا میں سب سے زیادہ مبارک بھی ، یہی وجہ تھی کہ ظلِ ہما بادشاہ قرار پاتا ۔

(۲)

جب وہ پیدا ہوا تو نہ پیشانی منوّر تھی ، نہ آنکھوں میں غیر معمولی چمک اور نہ ہی بشرہ سے غیر معمولی ذہانت عیاں تھی ۔ اس کی پیدائش کے موقع پر بہت سے بڑے آدمیوں کی پیدائش کے دستور کے مطابق ، نہ آسمان پر روشن ستاروں کا ہجوم نظر آیا ، نہ فضا میں رنگ بکھرے اور نہ ہی روشنی کی پھلجھڑیاں چلیں ۔ اس نے تو اپنے رنگ جیسی شب تار کی اس گھڑی میں جنم لیا جب رات دو پلڑوں میں تل رہی تھی ۔

عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کا غبی پن نمایاں سے نمایاں تر ہوتا گیا ، کوتاہ قد

پلکوں کے بغیر چندھی آنکھیں اور منہ سے ٹپکتی رال ۔ بات کرتا تو منہ سے بدبو کے بھبھاکے اُٹھتے چنانچہ ایک خاص فاصلہ درمیان میں رکھ کر ہی اس سے گفتگو ممکن تھی ۔ بچپن گندی گلیوں کی غلاظت میں بسر ہوا تو لڑکپن ہم عمروں کے مذاق کا نشانہ بنتے بنتے گزر گیا، جوانی آئی تو کوئی گھر بطور داماد قبول کرنے کو تیار نہ ہوا حتیٰ کہ اس کے بارے میں باتیں سننے کے بعد اس اندھی لڑکی نے بھی اس سے شادی سے انکار کر دیا جو خود مدت سے بن بیاہی بیٹھی تھی ۔ باپ نے اپنا ہنر سکھانا چاہا ۔ مگر اس کا محدود دماغ، ہاتھ اوزار اور کام میں رابطہ پیدا کرنے میں ناکام رہا ۔ تنگ آکر باپ نے اُسے اس کے حال پر چھوڑ دیا ، ماں اس کی حالت پر آٹھ آٹھ آنسو روتی ۔

جب خلقت میدان میں جمع ہوئی تو ان میں وہ نہ تھا ۔ اس کا ذہن اتنی پیچیدہ بات سمجھنے کی اہلیت ہی نہ رکھتا تھا کہ بادشاہ کیا ہوتا ہے ، اس کے مرنے سے کیا نقصان ہوتا ہے اور بادشاہ بننے کے کیا کیا فائدے ہیں ۔ اسی لئے وہ اپنے گھر کی ٹوٹی منڈیر پر دلجمعی سے بیٹھا دھوپ کے ساتھ گڑ کھاتا رہا ۔ اگر اس کے گرد مکھیوں کا ہجوم تھا تو وہ ان کی بھنبھناہٹ سے بے خبر تھا ،

اُدھر مکھیوں ہی کی مانند خلقت وسیع میدان میں بھنبھنا رہی تھی سب کی نگاہیں محل کے سب سے اونچے کنگرے پر تھیں جہاں سے ہما نے آغازِ پرواز کرنا تھا ۔ بارے ستارہ شناسوں اور زائچہ سازوں کی مقرر کردہ سعد ساعت کے عین مطابق ہما اُڑایا گیا ۔ ہما کیا تھا ۔ رنگوں کا اُڑتا میلہ تھا ایسے رنگ جو قوسِ قزح میں نظر نہ آئے تھے ، ایسے رنگ جو شاعر کے تخیل سے ماورا تھے اور ایسے رنگ جنہیں کسی مصور نے استعمال نہ کیا تھا ۔ ان رنگوں سے عجب روشنی کا اخراج ہوتا تھا ۔ چمکیلی دھوپ ، شفاف فضا اور دُھلے آسمان کی نیلاہٹ کے پس منظر میں نامانوس رنگوں کا یہ محوِ پرواز پھول ہر نگاہ کا مرکز تھا ۔ اس کے دیکھنے سے آنکھوں کو عجب ٹھنڈک کا احساس ہوتا ۔ دل

میں سرور موجیں مارتا یوں کہ اعصاب سرشاری میں ڈوب جاتے۔

اگرچہ ہر آنکھ کی تپلی میں ہما تھا۔ مگر ہر تپلی میں ہما کی تصویر الگ الگ تھی۔ بوڑھوں کے لئے اعادۂ شباب کی نوید، جوانوں کے لئے خوابوں کا رس کنواریوں کے لئے پیکرِ محبوب، نیکوں کے لئے غیبی کرشمہ!

آج تک نہ دیکھے رنگوں کے اس منظر کو دیکھ کر مصوّر رو دیا کہ جانتا تھا کہ اس کی تصویر بنانے کے لئے اس کے پاس رنگ نہیں۔ چشمِ تصور سے بھی دور کے منظر کو اتنا قریب دیکھ کر شاعر رو دیا کہ اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ اس منظر کی درست تصویر کشی کے لئے اس کے پاس موزوں ترین الفاظ نہ تھے۔

الغرض! سب کی تارنگاہ سے آزاد ہما محو پرواز تھا۔

صرف اراکینِ مملکت، عمائدین سلطنت، مقرّبان خاص اور دربار شاہی کے رتن پرُسکون نگاہوں سے خلقت کے سمندر میں انسانی سروں سے بنتی بگڑتی لہروں کے مدوجزر کا نظارہ کر رہے تھے کہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ بادشاہ خواہ کوئی بنے ہمیشہ وہی اراکینِ مملکت، عمائدینِ سلطنت، مقربانِ خاص اور دربار شاہی کے رتن رہیں گے۔

ہما خلقت کے موجیں مارتے سمندر پر اس بے چین جل پنچھی کی مانند چکّر لگا رہا تھا جسے من پسند مچھلی کی تلاش ہو، ایک دو مرتبہ اس نے ایک خاص سمت میں جھکاؤ بھی کیا لیکن سروں کی اُمڈتی موجوں سے جیسے گھبرا کر رُخ پلٹ لیا۔ وہ اسی طرح اپنے بادشاہ کی تلاش میں چکّر لگا تا رہا حتیٰ کہ اس نے تنگ آ کر اس انسانی سمندر سے کنارہ کیا اور اب اس کا رخ بستی کی طرف تھا چنانچہ پتنگ لوٹنے والے بچوں کی مانند اس پر نگاہیں جمائے خلقت بھی گلیوں میں بکھرتی گئی اور پھر اچانک جیسے سب سکتہ میں آ گئے۔ جیسے کسی ساحر نے اپنے جادوئی عصا کے ذریعہ انہیں انسانوں سے تصویر میں تبدیل کر دیا ہو۔

ہما کھیوں کے ہجوم میں بیٹھے اس غبی کے کندھے پر بیٹھ گیا۔ جس کے لئے حکومت کسی

چڑیا کا نام تھا تو بادشاہ کسی جانور کا، وہ تو خوفزدہ ہو کر اس عجیب وغریب اور رنگوں میں لتھڑے پرندہ کو اپنے کندھے سے اُڑانے کی کوشش کر رہا تھا اور اسی کشمکش میں گڑ کی ڈلی اس کے ہاتھ سے گر گئی۔

تب اس نے پہلی مرتبہ اپنے گرد کھڑا دم بخود ہجوم دیکھا یقیناً اس نے کوئی بہت بڑا جرم کیا ہے۔ جو اَب تمام لوگ اُسے سزا دینے کو جمع ہو گئے ہیں اور جب اس نے شاہی چوبداروں اور نقیبوں کے پیچھے پیچھے زرق برق لباس میں بڑے بڑے عماموں والوں کو بھی اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو خوف سے اس کی پتلیاں مزید پھیل گئیں، وہ نرغہ میں گھرے جانور کی مانند جست لگا کر بھاگنے کی تیاری میں تھا کہ لوگ اس کے سامنے رکوع کے بل جھک گئے، اس کی جے جے ہو رہی تھی، وزراء نے لپک کر اسے کندھوں پر سوار کر لیا، سارا شہر نعرے لگا تا اس کے جلو میں تھا۔

اس کا محدود دماغ ابھی تک صورتِ حال نہ سمجھ پایا تھا کہ یہ اس کے ساتھ کیا کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ آنکھوں میں ابھی تک نو گرفتار جانور جیسی وحشت تھی اور اسی لئے منہ سے رالوں کا سیلاب اُمڈا چلا آ رہا تھا اور تو اور وہ تو اپنی گڑ کی ڈلی بھی بھول چکا تھا۔

"ظلِ ہُما!" "ظلِ ہما!!" فضا میں ایک ہی گونج تھی۔

"ظلِ ہما زندہ باد!"

"ظلِ ہما پائندہ باد!"

اس وقت دو عورتیں بہت روئیں ایک تو اس کی ماں تھی جو خوشی کے آنسو بہا رہی تھی اور دوسری وہ اندھی جس نے اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

"ظلِ ہما زندہ باد!"

"ظلِ ہما پائندہ باد!!"

(۳)

تقدیر پر لوگوں کا پہلے سے بھی زیادہ پختہ یقین ہو گیا مگر تقدیر پر اصل یقین تو اس شخص کا تھا۔ جسے یہ بھی نہ معلوم تھا کہ تقدیر کیا ہوتی ہے اور اب یہ بھی تو مقدر ہی کی بات تھی کہ رسم تاج پوشی کے بعد ہی اس کے انداز و اطوار میں انقلابی تبدیلی پیدا ہو گئی۔ ایک طرف جھکاؤ کھانے والے کندھوں میں اکڑاؤ پیدا ہو گیا۔ گدّدل بھری چند ہی آنکھوں میں روشنی بھر گئی یوں کہ دوسرے سے آنکھ ملا کر بات کرتا تو ان میں عجیب بجلی کوندتی محسوس ہوتی۔ چنانچہ مخاطب نظروں کی تاب نہ لا کر آنکھیں جھکانے پر مجبور ہو جاتا اور تو اور اس کی رالیں بہنی بھی بند ہو گئی تھیں۔ اب اُسے کیونکہ بادشاہت مل چکی تھی۔ اس لئے گڑ کی بھی ضرورت نہ رہی تھی۔ ظلِ ہما زندہ باد!

انداز میں تمکنت، اطوار میں شائستگی، چال میں وقار، گردن میں شاہانہ تناؤ، بشرہ پر ذہانت، گفتگو میں متانت، فیصلوں میں دانائی۔ الغرض! وہ بے حد کامیاب بادشاہ ثابت ہو رہا تھا۔ ابتدا میں اُسے شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے والے اب اس کے اندازِ کج کلاہی دیکھ کر ہما کے درست فیصلہ کے قائل ہو چکے تھے اور یوں ہما مقدّر کا مترادف قرار پایا۔ ظلِ ہما زندہ باد!

اراکین مملکت، عمائدینِ سلطنت، مقربانِ خاص اور دربارِ شاہی کے رتنوں نے بیٹیاں اور بہنیں اور بیویاں پیش کیں اس نے کسی کا دل نہ توڑا اور سب قبول فرمائیں۔ چنانچہ جلد ہی قصرِ شاہی، شاہی باغ میں تبدیل ہو گیا۔

ظلِ ہما زندہ باد!

دن امن اور سکون سے گزرتے رہے۔ بارشیں وقت پر ہوتیں۔ کھیتوں میں فصلیں لہلہاتیں، باغ میں ڈالیاں پھلوں سے جھک جاتیں، نہ کوئی وبا پھوٹی نہ کسی غنیم نے ادھر کا رُخ کیا، ظلِ ہما زندہ باد

(۴)

ہما کہاں رہتا ہے ؟

تمام سلطنت میں اس بھید سے صرف وزیر باتدبیر آگاہ تھا ۔ وہ کیا کھاتا تھا یہ بھی کوئی نہ جانتا تھا ۔ البتہ یہ مشہور تھا کہ وہ سچے موتی کھاتا ہے ۔

یہ موتی کس سمندر کی تہ سے آتے ہیں ، انہیں کون لاتا ہے ، ہما کو کون کھلاتا ہے ۔ یہ کوئی بھی نہ جانتا تھا حتیٰ کہ خود بادشاہ وقت کو بھی ان تمام باتوں سے بے خبر رکھا جاتا تھا ۔ اس نے بھی پیش رو بادشاہوں کی مانند کئی مرتبہ وزیر باتدبیر سے استفسار کیا مگر وہ سخن سازی کر جاتا ۔ جس سے بادشاہ کا اطمینان تو کیا ہوتا ۔ آتشِ شوق مزید بھڑکتی ۔ راج ہٹ بہت مشہور ہے ۔ چنانچہ بادشاہ بھی اپنی کوششوں میں لگا رہا ۔ حتیٰ کہ ایک رازدار خواجہ سرا کی امداد سے اُسے یہ علم ہو گیا کہ ہما کہاں پوشیدہ ہے ۔

تب بادشاہ نے جشنِ شاہی کا اہتمام کیا اور شاہانہ ضیافت کے بعد دربارِ عام میں اپنے سب سے بڑے بیٹے کو ولی عہد مقرر کرنے کا اعلان کر دیا ۔ اراکینِ مملکت یہ اعلان سن کر ششدر رہ گئے ۔ عمائدینِ سلطنت نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا غالباً انہوں نے درست نہ سُنا تھا ، مقربانِ خاص کی زبانیں گنگ تھیں ۔ جبکہ دربار کے رتنوں کے چہروں سے پریشانی ہویدا تھی ۔

تب وزیر باتدبیر اُٹھا ، تختِ شاہی کے پائے کو بوسہ دیا اور بادشاہ کو یاد دلایا کہ ایسا ہونا آئینِ مملکت کے منافی اور ملکی روایات کے برعکس ہے ۔ ہما کی موجودگی میں کوئی شخص ـــــ خواہ وہ بادشاہ وقت ہی کیوں نہ ہو ـــــ اس فیصلہ کا مجاز نہیں کہ تخت پر کس کا قبضہ ہو گا کہ خود بادشاہ بھی تو ظلِ ہما ہی ہے ۔

اس کلام پر بادشاہ کی آنکھوں میں بجلی چمکی ۔

"کیسا ہما ؟" وہ قہقہہ لگا کر بولا ۔ " اسے تو کل رات میں کھا چکا ہوں ۔"

جب وزیر بے تدبیر، چند احمق عمائد اور ایک آدھ رکنِ سلطنت کے سر قلم ہوتے دیکھے تو سب نے بادشاہ کے ساتھ ولی عہد کی جے جے کی۔ تب بادشاہ نے جشنِ عام کا اعلان فرمایا۔ خزانوں کے منہ کھول دیئے گئے اور سلطنت کی حدود میں سات دن اور سات رات تک جشن منایا گیا۔

کھجوروں کا موسم

اس بستی کا بادشاہ ـــــ کہ سر پر سایۂ ہما تھا اور بخت رسا نے چھتر تانا تھا ـــــ نہایت نیک نہاد، نیک خو، اور نیک نیّت تھا۔ ہر دم اپنی پرجا اور چاکروں کی فکر میں ہمتِ عالی کو غلطاں رکھتا۔ دن بھر مشیروں اور بہی خواہوں کے جھرمٹ میں مثلِ ماہتاب چمکتا اور اُن سے پرجا اور چاکروں کی بہبود کے لئے نیک مشورے اور صائب رائے لیتا وہ بھی ایسے نیک نہاد، نیک خو اور نیک نیّت تھے کہ کبھی غلط مشورے نہ دیتے۔ جب دن تمام ہوتا تو مانندِ آفتاب شبستانِ عطر بیز میں استراحت فرماتا بلکہ خوفِ خدا سے شب بیدار ہوتا اور اس اندیشہ سے ہلاک ہوتا کہ سلطنت خداداد میں کوئی بچہ بھوک سے نہ روتا ہو کسی بیوہ کے گال آنسوؤں سے تر نہ ہوں۔ کوئی ناہنجار رات کی تیرہ چادر اوڑھ کسی بے کس ناکتخدا پر ظلم نہ ڈھائے۔ خون ناحق نہ بہے۔ رعیت اور چاکر چین کی نیند سوئیں ـــــ انہی فکروں میں چشمِ نرگس آسا سے نیند کو دور رکھتا۔ شب بیدار رہتا۔ دل کا قرار گنواتا اور مثلِ مُرغِ نو گرفتار محل کی غلام گردشوں اور قلعہ کی فصیلوں پر دیوانہ وار پھرتا ـــــ بیگمات شب بسری کے لئے درخواست گزار ہوتیں مگر وہ ہرگز شبستانِ عشرت کا رُخ نہ کرتا ـــــ یہ اس نیک نہاد نیک خو اور نیک نیّت بادشاہ کی بدولت تھا کہ پرجا نیک چلن اور چاکر خوش حال تھے۔ ڈکیت سولی پاتے، بدمعاش زمین میں گاڑ دیئے جاتے اور گوہرِ عصمت کو جکنا چوُر کرنے

والوں کی علامت کاٹ دی جاتی ـــــ یہ سب سرِعام ہوتا، وہ نیک نہاد، نیک خو اور نیک نیت بادشاہ کھیل تماشوں، موسیقی، ناچ رنگ اور بے کار تفریحات میں وقت ضائع کرنا پسند نہ فرماتا تھا۔ اس لئے ہر روز مجرموں کی سرِعام بیخ کنی کے مشاہدہ کو ایک خلق کا اژدہام ہوتا۔ امراء ڈاکوؤں کو سولی پر تڑپتے دیکھ کر نعرہ زن ہوتے، بدمعاشوں کو گردن تک زمین میں دھنسے دیکھ کر شرفاء اطمینان کی سانس لیتے اور عزتوں کے لٹیروں کی کٹی علامت دیکھ کر کنواریاں تاسف سے گردن ہلاتیں۔ الغرض اِ نیک نہاد، نیک خو اور نیک نیت بادشاہ کے زیرِ اثر اس کی پرجا اور چاکر بھی نیک نہاد، نیک خو اور نیک نیت بن چکے تھے۔

بادشاہ نے کہ بخت رسا کی مانند ذہن رسا بھی رکھتا تھا ـــــ ایک دن مشیروں کو کہ دانش و فراست میں ستاروں جیسی تابانی رکھتے تھے، طلب فرمایا، سب بموجب دستورِ دربار کورنش و آداب بجالائے ہر چند کہ چہرہ پُرنُور دیکھنے کی آرزو دل میں رکھتے تھے مگر فرطِ ادب سے نگاہ فرش سے نہ اُٹھاتے، بادشاہ نے کہ اِن ستاروں میں ماہتاب پُرنور تھا۔ لبِ مُبارک سے سب کو یہ نوید دی کہ اب مملکتِ خداداد میں کرنے کو کچھ نہ رہا تھا۔ پرجا کے سُکھ چین اور چاکروں کی بہبود کے لیے جو کچھ کیا جا سکتا تھا، وہ کیا جا چکا تھا۔ جس کے نتیجے میں بیت المال کہ درحقیقت عوام کا مال ہے۔ زرِ سُرخ و سپید، جواہرات اور ملک ملک کے تحائف نادر و کمیاب اور نایاب اشیاء سے پُر ہو چکا ہے۔ پہلی مرتبہ دستِ سخاوت نے فراغت پائی کہ اب لینے والا کوئی نہیں۔

سب نے یک زبان ہو کر اس نیک نہاد، نیک خو اور نیک نیت بادشاہ کی ثنا کی۔ جس نے اپنے اعمالِ نیک سے ملک کی تیرہ تاریخ میں ایک روشن باب قلم بند کر کے شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں اپنے لئے عالی مرتبت کرسی حاصل کر لی تھی۔ بادشاہ کہ درحقیقت شاہِ روزگار تھا اس تعریف سے ہرگز شاد نہ ہوا کہ اس امر سے

آگاہ تھا کہ یہی اس کا فرضِ منصبی تھا، انکساری کے بارگراں سے سر جھکا لیا۔ عاجزی و انکساری کے اس مظاہرہ سے تمام مشیرانِ ذی شعور دم بخود رہ گئے۔ چندے توقف فرمایا اور پھر لبِ گوہر بار کو یوں جنبش دی۔ کئی راتوں کی مسلسل بیداری کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اگرچہ پرجا اور چاکروں کی خوش حالی اور بہبود کے لئے اب مزید کرنے کو کچھ نہ رہا تاہم بادشاہ کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ کرتا ہے۔ ورنہ بادشاہ اور پرجا میں کیا فرق؟ سب مشیرانِ عالی قدر نے اس نکتہ روشن کو یک زبان ہو کر سراہا اس پر بادشاہ نے تبسم فرمایا اور جنبشِ لب کو یوں تکلیف دی کہ ہم نے مسلسل شب بیداری کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ اب اس مملکتِ خداداد میں کھجوروں کے درخت عام کیے جائیں۔ یہ نکتہ دقیق اور رمزِ لطیف تھا اس لئے مشیرانِ کرام نے توثیق میں سر ہلایا مگر لب کشا نہ ہوئے۔ بادشاہ نے کہ چہروں سے دلوں کی پوشیدہ تحریر پڑھ لیتا تھا۔ مشیرانِ گرامی قدر سے فرمایا ہم سمجھتے ہیں کہ تم یہ رمزِ لطیف نہیں سمجھے اور ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ تم بھی یہ سمجھتے ہو کہ ہم بھی سب سمجھ گئے ہیں۔ یہ کلماتِ لطیف سُن کر سب نے نظریں جھکا لیں کہ خاموشی حسبِ حال تھی بادشاہ نے کہ دلوں کا بادشاہ بھی تھا باری باری سب کی جھکی نظریں اور خمیدہ گردنیں دیکھیں اور یوں لب کشا ہوا۔

کھجور کا درخت خالی از حکمت نہیں تنا سر کشیدہ، کھجور میں شہد ہی شہد دربار ی حکیم نے ہماری شاہی معلومات میں یہ اضافہ کیا ہے کہ کھجور ہزار امراض کی شفا ہے اس کی شاخیں بھی ہزار طرح سے سود مند ثابت ہو سکتی ہیں، صرف ایک خرابی ہے کہ ٹھنڈی اور گھنی چھاؤں دینے سے قاصر ہے لیکن وجہ ظاہر ہے۔ یہ کہہ کر بادشاہ نے عقابی نظریں سب پر دوڑائیں مگر کوئی مشیر بھی وجہ نہ بتا سکتا تھا، چنانچہ بادشاہ سلامت نے خود ہی لب گوہر بار کی ایک جنبش سے اس راز پر سے پردہ اُٹھا کر فرمایا۔ چھتری اگر اُونچی ہو تو اس سے چھاؤں عنقا ہو جاتی ہے، سب مشیروں نے بادشاہ کی فہم رسا کی داد دی۔ اپنی کوتاہ فہمی کا اعتراف

کیا اور اس امر کو صادر کیا۔

بموجب فرمان شاہ پرجا اور چاکر کھجور کا درخت لگانے میں مصروف ہو گئے اگرچہ ملک میں پہلے بھی کھجور کے درختوں کی کمی نہ تھی اور کھجور بلکہ اس کی گٹھلیوں تک کو ہر مرض کی دوا بھی سمجھا جاتا تھا مگر اب تو معاملہ ہی اور تھا۔ بادشاہ نے دربار موقوف کیا۔ امورِ سلطنت سے ہاتھ اٹھایا اور بیت المال کا دروازہ کھول دیا۔ چنانچہ قلیل عرصہ میں ملک میں ہر طرف کھجور کے درخت نظر آنے لگے۔ جب کھیت چراگاہ، باغ اور راستے کھجور کے درختوں سے پُر ہو گئے تو گھروں اور آنگنوں میں درخت اگائے جانے لگے بادشاہ سلامت کا جوش پرجا میں مثل خون دوڑ گیا۔ اس لئے پرجا اور چاکروں نے امورِ زیست معطل کئے اور صرف کھجور کے درختوں کے لئے وقف ہو کر رہ گئے، وہ بھی اور ان کی زندگیاں بھی!

(۲)

اس نے بازو میں زور سے ناخن چبھوئے تو احساس ہوا کہ یہ سب دہشت ناک خواب نہیں حقیقت ہے لیکن خواب ثابت نہ ہونے سے حقیقت کی دہشت کم نہیں ہو سکتی وہ دہشت جسے صرف خوابوں ہی میں مجسم دیکھا جا سکتا ہے۔ کہیں یہ تو نہیں کہ یہ دہشت ناک خواب اتنا طویل ہو چکا ہو کہ اب یہی حقیقت اور حقیقت کا معیار ٹھہرے۔ آخر حقیقت کی طرح خوابوں کے بھی تو اپنے معیار ہوتے ہیں خواہ دہشت ناک خواب ہی کیوں نہ ہوں۔

اگر واقعی یہی حقیقت ہے اور وہ عالم خواب میں دہشت زدہ نہیں تو پھر یقیناً وحشت زدہ ہے، بازو میں ناخن گاڑے تو حقیقت کی پہچان کی مگر اپنے ذہن میں کیا چبھوئے کہ دیوانہ ثابت نہ ہو۔ کیا دوسروں کے شہبازوں سے اپنا مولہ لڑا دے؟

اس نے دُور تک نگاہ دوڑائی، تاحدِ نگاہ کھجور کے سرکشیدہ درخت فاتحین کے

پرچموں کی مانند نظر آرہے تھے۔ ہوا کھجوروں کی مٹھاس سے بوجھل تھی، اگرچہ یہاں کے ہر موسم میں ہمیشہ سے ہی حبس رہا تھا مگر کھجوروں کی مٹھاس نے ہوا میں شامل ہو کر جو حبس پیدا کیا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ اس بستی کے بعض کال جیسے تاریخی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ یہ حبس بھی ویسے ہی تاریخ ساز ثابت ہو رہا تھا۔

کھجوروں کے درختوں کے بارے میں لوگوں کے جوش کا یہ عالم تھا کہ ان کا بس نہ چلتا ورنہ خود ہی بازو پھیلا کر درختوں میں تبدیل ہو جاتے۔ تمام قوم ہمہ وقت درخت لگانے میں مصروف رہتی، اتنے درخت لگے کہ آسمان ان کی شاخوں میں چھپ گیا۔ جس کے نتیجہ میں اب سورج نظر نہ آتا تھا بلکہ عجیب و غریب جھٹ پٹا سا رہتا تھا زمین اور اس کے ساتھ ساتھ وقت کی گردش تھم گئی ہو۔ چاند ستارے نظر نہ آنے سے شاعر گیت اور عشاق اختر شماری بھولتے جا رہے تھے۔ تاحد نگاہ پھیلے لمبے لمبے تنوں نے ایک ہجوم کی صورت اختیار کر لی ایسا ہجوم جو انسانوں کا راستہ روکے! چند قدم چلو تو یہ تنے راستہ روک لیتے۔ موڑ مڑتے تو کسی تنے سے جا ٹکراتے۔ یہ ناممکن تھا کہ بازو پھیلاؤ اور وہ کسی تنے سے نہ جا اُلجھے۔ تہواروں کے موقع پر یوں محسوس ہوتا کہ اپنے عزیز و اقارب کی بجائے تنوں سے معانقہ ہو رہا ہے۔

فضا، ہوا اور سانس میں کھجوروں کی مٹھاس یوں رچی کہ اب اپنا وجود چپچپاتی کھجور میں تبدیل ہوتا محسوس ہو رہا تھا ڈر تھا کہ کہیں سب لوگ کھجوروں میں تبدیل نہ ہو جائیں۔ دھڑ، تنا، بازو شاخیں اور ذہن میں کھجوروں کی گٹھلیاں!

ملک کی تاریخ، کھجور کی تاریخ میں تبدیل ہو گئی۔ جغرافیہ کھجور کا موسم قرار پایا تو کھجور کا درخت مرکزِ ثقل!

نہ گھنے درختوں کی خنک چھاؤں میں کویل کوکتی، نہ املتاس کے درختوں پہ پیلے پھولوں کے جھومر سجتے نہ جھاڑیوں کی مہکار میں چڑا چڑیا سے اظہارِ محبت کرتا۔ نہ دن کو موتیا مہکتا نہ رات کو رات کی رانی ــــ خوشبودار سانس لیتی، نہ بن میں مورنی کو رجھانے

کے لئے مور رقص کرتا۔ ان سب کو کاٹ کر ان کی جگہ کھجور کے درخت لگا دیئے گئے تھے

یوں صرف مگرمچھ کی کھال جیسے لمبے لمبے تنے ہی باقی رہ گئے تھے مصور ہزار زاویوں سے کھجور کے درختوں کی تصویریں

بناتے مگر یہ محسوس کرتے کہ حق ادا نہ ہو۔ شاعر کھجوروں کی تعریف میں لفظوں کے خم پہ خم لنڈھاتے مگر یہ محسوس کرتے کہ حق ادا نہ ہوا۔ جذبۂ عشق سے مغلوب محبوب کھجوروں سے ہم آغوش ہوتے مگر یہ محسوس کرتے کہ حق ادا نہ ہوا۔ کلفتِ عشق کے مارے عشّاق جنون اختیار کر کے کھجوروں سے سر ٹکرا زخمی ہوتے مگر یہ محسوس کرتے کہ حق ادا نہ ہوا۔

شاعر نے کھجور کی سخت کھال میں اپنے ناخن اتار دیئے تو ٹوٹے ناخن دیکھ کر یقین آگیا کہ حقیقت یہی ہے۔ نہ وہ دیوانہ ہے اور نہ کسی دہشت ناک خواب کے عالم میں ہے مگر چند روز پیشتر اس نے جو کچھ دیکھا تھا وہ اسے کیسے فراموش کر سکتا ہے۔

وہ دونوں دوست تھے، دونوں شاعر، حسن، خوشبو، رنگ اور سچائی سے پیار کرنے والے، دونوں کی دوستی کی مانند ان کی شاعری بھی پائیدار تھی، پھر وہ انفرادی سوچ کے حامل بھی تھے اور شاید یہی خرابی کی بنا تھی۔ وہ دونوں خواب دیکھنے والے تھے اور ان کے خوابوں میں کھجوروں کی گنجائش نہ تھی اور شاید یہی خرابی کی بنا تھی۔

اس کا دوست جذباتی تھا، اس لئے وہ زیادہ نادان تھا اور اسی لئے بہت اچھا بلکہ سب سے اچھا شاعر تھا، اس نے سب سے پہلے کوئل کی کوک، چڑیوں کی چہچہاہٹ، مور کے ناچ، موتیے اور رات کی رانی کی کمی کو محسوس کیا، اگر محسوس کر کے خاموش رہتا تو شاید بات نہ بگڑتی مگر اس نے تو ان کا برملا اظہار بھی شروع کر دیا، یہ سن کر لوگوں نے اس سے قطع تعلق کر لیا کہ ایسی سوچ بے سود تھی اور ایسی باتیں سود مند نہ تھیں۔ صرف شاعر کا دوست شاعر رہ گیا کہ وہ بھی تقریباً اتنا ہی جذباتی اور اتنا ہی نادان تھا۔

اور پھر ایک دن !

وہ دونوں بستی سے باہر کھجوروں کے جھُنڈ میں بیٹھے تھے موضوع وہی ایک تھا۔ یعنی کھجور کا درخت ــــ وہ حسبِ معمول زور دار لہجہ میں کھجوروں کی مذمت کر رہا تھا کہ اچانک پہلو کا درخت جھکا اور بیشتر اس کے کہ انہیں احساس ہوتا درخت کی لمبی لمبی شاخوں نے اُسے کسی بچّہ کی مانند اپنے بازو میں لے لیا درخت سیدھا ہوا تو وہ اس کی شاخوں میں گم ہو چکا تھا۔ یہ سب اتنا اچانک تھا کہ اب تک اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ کھجور کا بے ضرر درخت اچانک آدم خور درخت بن گیا۔

اس نے لوگوں سے اس حادثہ کا ذکر کیا تو سب نے اسے خالی خالی نظروں سے دیکھا، کوئی اس کی بات نہ سمجھ رہا تھا۔ بند ہونٹوں اور نہ دیکھتی آنکھوں سے سب نے اس کی بات کا استقبال کیا اور تب اسے یہ احساس ہوا کہ وقتاً فوقتاً اس سے بیشتر بھی اسی طرح لوگ غائب ہوتے رہے ہیں تو کیا یہ سب کھجور کے درختوں کا کھاجا بنے ؟ کیا انسان اب صرف کھجور کے درخت کی کھاد بننے کے لئے رہ گیا ہے ؟

(۳)

وہ سوچتے سوچتے پاگل ہوا جا رہا تھا اور پھر ایک دن وہ سچ مچ ہی پاگل ہو گیا۔ اس نے کلہاڑی اٹھائی اور کھجور کے درخت کے تنے پر اپنی پوری دیوانگی کی شدّت کے ساتھ ایک کاری ضرب لگائی اور لوگوں کی حیرت سے پھٹی آنکھوں نے دیکھا کہ اس کے دوست کو کھا جانے والا درخت ایک ہی ضرب میں ڈھ گیا ہے۔ اس نے خوشی کا ایک نعرہ لگایا مگر پیشتر اس کے کہ اس کا کھلا منہ بند ہوتا ایک اور درخت اسے اُچک چکا تھا۔

تال پاتال

پکار

بستی خوف کی مٹھی میں دبی تھی کہ زندگی بند مٹھی سے ریت کی مانند پھسلتی محسوس ہو رہی تھی۔ دن باعثِ تقویت تھا کہ وہ بلارات کی پرچھائیں اوڑھے آتی تھی۔

بستی سے دور، اجاڑ قلعے کے پچھواڑے، دلدلوں سے گزرتا کائی آلود راستہ جس قبرستان کی طرف لے جاتا اس کی قدامت بوڑھوں کی رونگٹے کھڑے کردینے والی حکایات کے اسرار میں گم ہے۔ سالخوردہ بیلیں کسی پلید روح کے خشک بالوں کی طرح الجھی ہیں۔ ان بیلوں کے پیچھے سنگی دیوار میں گویا دروازہ کا نقش ہے جس کے بے تالہ کواڑ کسی سے بھی نہیں کھل سکتے۔ جب غیر مرئی ہاتھ سے دروازے کے پٹ زنگ آلودہ پچوں پر چرچراہٹ سے گھومتے تو جو چوبی زینہ پاتال میں اترتا نظر آتا اس کے گھن کھائے تختے کسی فانی وجود کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے۔ تازہ ہوا کا گذر نہیں کہ بیلیں راستہ نہیں دیتیں۔ صرف دائمی سیلن کی بو کا راج ہے۔ زینہ جس تہ خانے میں ختم ہوتا ہے۔ وہاں ہڈیوں کا ڈھیر ہے۔ جس سے ذرا فاصلے پر ایک کھوپڑی آنکھوں کے دو سوراخوں سے منظر پہ پہرا دے رہی ہے۔ وہاں سُرخ چیونٹوں کے سوراخ ہیں، دیمک کا ڈھیر ہے۔ مادہ بچھو سے اس کے بچے چمٹے ہیں اور سانپ کی بانبی ہے لیکن ہڈیوں کے دائرے کے قریب پھٹکنے کی مجال نہیں۔

جب وقت کے پلڑے میں رات برابر برابر تلتی ہے اور دور بستی میں

کسی خوف زدہ کتے کی کپکپاتی آواز بند کواڑوں پر دستک دیتی ہے تو دائرے کے اندر نیند میں ڈوبی ہڈیاں بیدار ہو جاتی ہیں۔ بوڑھے جوڑ ہلے ہیں۔ پاؤں، پنڈلیاں، رانیں پسلیاں، بازو، ہاتھ، گردن سب بے آواز جڑتے جاتے ہیں حتیٰ کہ جسم مکمل ہو جاتا ہے۔ تب یہ بے سر جسم کھوپڑی کے سامنے رکوع کے بل ہو جاتا ہے اور کھوپڑی اچھل کر اپنے مقام پر متمکن ہو جاتی ہے۔ یہ جسم چلتا نہیں بلکہ ہوا کے جھونکوں کی مانند لہرا لیتا ہے۔ گھن لگا زینہ اس کے لئے سنگی زینہ بن جاتا ہے۔ دروازہ کھلتا ہے تو سمٹ کر بیلیں راستہ دیتی ہیں۔ دلدلوں کی مانگ میں کائی آلود راستے پر چلتے چلتے یہ فیصلہ کر لیا کہ آج کیا بننا ہے۔ بستی والے حصولِ غذا دشوار سے دشوار تر بناتے جا رہے تھے لیکن یہ رکاوٹیں غذائیں مصالحہ ثابت ہوتیں۔

نالی سے گھر میں داخل ہو کر چوہا گول گول آنکھوں سے تمام گھر کی تلاشی لے رہا تھا کہ ماں کے پہلو میں لیٹا کومل وجود نظر آ گیا۔ وہ رک گیا مگر مونچھوں کے بال متحرک رہے۔ گول پتلیوں میں بچے کا وجود ساکت تھا۔ اس نے جست لگائی تو وہ چوہا تھا مگر بچہ منہ میں دبائے جس نے دیوار پھلانگی وہ سیاہ بھیڑیا تھا۔ بچے کی دردیلی چیخ حلق میں دم توڑ گئی۔ خون کے قطرے رہ نما تھے۔ خوف زدہ گلیوں میں خاموشی چوکیدار تھی۔ چوہا جب بچہ منہ سے نکلا تو بھیپھڑے ساکت تھے۔ بھیڑیئے نے انسان کی مانند دونوں پنجوں میں گردن دبا کر یوں مروڑی کہ وہ الگ ہو گئی۔ نرخرے سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا جسے اس کی زبان لپا لپ پی رہی تھی۔ خون پینے کے بعد لمبے لمبے ناخنوں سے بچے کا ملائم پیٹ ادھیڑتا رہا۔ وہ ایک ایک حصّے کا نرم نرم گوشت مزے لے لے کر چبا رہا تھا۔ اس گوشت اور خون کی بو سونگھ کر کتے ایسے خوفزدہ ہوئے کہ ٹانگوں میں دم دبائے میاؤں میاؤں کرتے بھاگ نکلے:

صبح چوک میں بچے کے ناخن، بال اور چیتھڑے نظر آئے۔ بستی کی ہر کھڑکی نے

لہسن کے ہار پہنے رکھے تھے کہ عام عقیدے کے بموجب لہسن کی بُو اس کے لیے ناگوار تھی۔ ہر دروازے پر مقدس پانی چھڑکا جاتا اس توقع پر کہ شاید یہ مقدس قطرے انگاروں میں تبدیل ہو جائیں۔

خواب گاہ میں جاگنے والی، بلا سے خوفزدہ نہ تھی کہ انتظارِ محبوب میں تھی۔ پیغام ملا تھا کہ وہ رات کو کسی نہ کسی طرح پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ دن کی روشنی دشمن تھی اور رات پناہ گاہ پر دہ سرکایا۔ چاندنی میں نہایا راستہ خالی تھا۔ وہ کئی دن بعد ملنے والے تھے۔ چنانچہ یہ تصوّر ہی جسم میں لطیف ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ بستر پر بے چینی سے کروٹ بدلی تو کھڑکی کے پاس سایہ لہرایا۔ فوراً اُٹھی۔ کھڑکی کے پٹ کھولے اور لہسن کے جال کو مکڑی کے جالے کی طرح اتار پھینکا۔ وہ ہوا کے جھونکے کے ساتھ اندر چلا آیا۔ وہ جو کھڑکی کے باہر رقصاں ذرّات کا ہیولیٰ تھا کمرے کے اندر مجسم ہو چکا تھا۔ خوف سے ٹانگیں گویا بڑیوں کے گودے میں تبدیل ہو گئیں۔ وحشت سے پھٹی آنکھوں میں محبوب کی تصویر نہ تھی، دہشت سے منہ تو کھلا مگر چیخ زخمی پرندے کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ میں تبدیل ہو گئی۔ پیچھے ہٹنا چاہا مگر اب مانندِ تصویر بے جان آنکھوں کی پھیلی پتلیوں میں وہ قدم قدم اس کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے بھنور میں وہ ڈوبتی نیا تھی۔ اس کے چھونے کی ٹھنڈک نے سردِ چھری بن کر اعصاب ذبح کر دیئے۔ وہ اس کے بازوؤں میں نڈھال تھی۔ اُس نے نہایت نرمی اور پیار سے لبادے کے بند کھولے۔

یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیا یہ اسی کا وجود ہے یا اور کسی کا؟ اس کی گردن کے نیچے شہہ رگ پر دانتوں نے سوراخ کیسے کیا؟ سُرخ اور نرم ہونٹوں کے لمس سے اس پر سرشاری کی کپکپاہٹ کیوں طاری ہو رہی ہے اور یہ کیسی لذّت ہے کہ جسم کے ایک ایک مسام کے خفیہ دروا کئے جا رہی ہے۔ اس نے بے قرار ہو کر دونوں بازو اُس کی گردن میں حمائل کر کے اُسے اپنی جانب کھینچا تو سوراخ پر رکھے ہونٹوں میں مزید گرم جوشی پیدا ہو گئی۔ رگوں

میں گویا خون کا جوالا مکھی بیدار ہو گیا۔

یوں محسوس ہو رہا تھا گویا یہ سب اس کے ساتھ نہیں ہو رہا بلکہ وہ اپنے وجود سے الگ ہو کر اس عمل کا نظارہ کر رہی ہے۔ کیا یہ خواب ہے؟ دن بھر سوچتی رہی مگر انمول لذّت خوابوں کا مقدر کہاں؟ یہ میٹھی میٹھی کسلمندی بھلا کس خواب کی تعبیر ہو سکتی ہے۔ کبھی کبھی بے خیالی میں ہاتھ اس ننھے سے سوراخ کو ٹٹول لیتا تو خواب کے حقیقت ہونے کا یقین آجاتا۔ وہ مقناطیسی لہریں خارج کرتی آنکھیں، وہ اعصاب پر سرد چھری کا پہلا وار، وہ سرخ ہونٹوں کی نرماہٹ، وہ سرد دانتوں کا جلد کُتر کر سوراخ کرنا —— سوراخ چھوتے ہی کپکپی سب یاد دلا دیتی۔ دن بھر وہ عجب بے چینی اور بے کلی میں مبتلا رہی کہ رگوں میں دوڑتے خون کی پکار نہ تھمی۔

بستی پر خوف کے گہرے ہوتے سائے لوگوں کے تعلقات بھی متاثر کر رہے تھے۔ ہر شخص دوسرے کو بلا سمجھ کر موردِ الزام ٹھہراتا۔ خوشگوار تعلقات میں خوف کی پھانس اٹک چکی تھی۔ ہر ذہن شک کے کانٹوں کی فصل اُگا رہا تھا۔

اس نے سوچا شاید یہ بھی میرا واہمہ ہو کہ وہ اب ملتفت نہ تھی مگر آنکھوں کو کیسے جھٹلاتا جنہوں نے کسی اور ہی کے لئے اسے کھڑکی کھولتے دیکھا تھا۔

وہ روز بروز کمزور ہو رہی تھی۔ گالوں کے سیب چہرے کی سرسوں میں چھپ گئے۔ ہونٹوں کی کلیاں کملا گئیں۔ آنکھوں کے ستاروں کی روشنی ہوا سے بجھتے دیپ کی لَو کی مانند تھرا اُٹھتی۔ اِدھر رگوں میں دوڑتے لہو کی پکار جیسے جنون میں تبدیل ہو گئی۔ وہ کسی سے بات نہ کرتی، بس اپنی لذّت کے حصار میں مقید لہو کی گنگناہٹ سُنتی رہتی۔ دن بھر پژمردہ رہتی۔ رات آتی تو رات کی رانی بن کر لہو کی مہک دینے لگتی۔ کھڑکی کے پٹ دیوانے عاشق کے بازوؤں کی مانند کھلے رہتے۔

بستی کے خوف زدہ لوگ بلا سے نجات حاصل کرنے کی تدبیروں میں لگے تھے۔ مگر

عامل، ساحر، کاہن سب ناکام رہے تھے۔

بستی سے دو دن کے فاصلے پر ایسا بیابان تھا جہاں مارے خوف کے لوگ دن کو بھی جانے کی ہمت نہ کرتے تھے۔ درختوں کی شاخیں سانپ بن کر ڈستی محسوس ہوتیں۔ جھاڑیاں خبیث بونوں کا روپ دھار لیتیں۔ مسافر سستانے کے لئے بیٹھ جاتے تو سیاہ چیونٹے جسم میں بل بنا کر قطار در قطار داخل ہونا شروع ہو جاتے ــــ اور اس بیابان سے وہ متوالا گزر رہا تھا۔ وہ خوف زدہ نہ تھا۔ کیونکہ اس کے لئے تو سب سے بڑا خوف محبوب کی جان جانے کا تھا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ محبوبہ اب نادیدہ وجود کے قبضے میں ہے۔ اسے ہر قیمت پر حتیٰ کہ اپنی جان کی قیمت پر بھی بچا لینے کا سودا مہنگا نہ تھا۔ کبھی کبھی ماحول غلبہ پا کر اسے خوف زدہ کر دیتا۔ تب وہ محبوبہ کا روشن چہرہ آنکھوں کے سامنے لاتا تو اس کی روشنی سے خوف چمگادڑ کی مانند اڑ جاتا۔

اچانک اس نے خود کو جادوگرنی کے سامنے پایا جو جھاڑو پر اڑتی تھی۔ وہ جس کچھوے پر سواری کرتی تھی اس کی پشت اونٹ کے کوہان سے بھی اونچی تھی۔ وہ چھپکلیوں کا ناشتہ کرتی تھی۔ سیہہ کا شوربہ پیتی تھی۔ غصے میں آتی تو بال سانپ بن کر پھنکاریں مارتے۔ اپنا بال توڑ کر آگ میں ڈال دیتی تو اڑتی چنگاریاں بونوں میں تبدیل ہو جاتیں ــــ ایسے بونے جن کے بھالے زہر میں بجھے ہوتے۔

وہ کہ محبت میں سرشار تھا اور محبوبہ کا تصور دل میں بٹھائے تھا، بلا خوف جادوگرنی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ جس کا گوشت ہڈیاں چھوڑ چکا تھا، جس کے پلپلے منہ میں سیاہ دانت سنگریزوں کی مانند تھے مگر جھریوں کے بھنور میں جس کی انگارہ آنکھیں اس کی منتظر تھیں۔ بولی تو آواز میں صدیوں پرانے کنویں کی گونج تھی۔

"مجھے معلوم ہے تم کیوں آئے ہو۔"

وہ قدموں پر گر پڑا۔

"اس بلا سے بچنا آسان نہیں۔ صدیوں پرانی ہے، جسم بدل سکتی ہے، جُون بدل سکتی ہے، وقت بدل سکتی ہے۔ ایک بستی چٹ کر لے تو دوسری کا رُخ کرتی ہے۔ جس کا خون منہ کو لگ جائے اسے کبھی نہیں چھوڑتی، حتیٰ کہ جسم سے خون کا آخری قطرہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ یوں مرنے والا مرکر امر ہو جاتا ہے کہ وہ خود بھی خون پینا شروع کر دیتا ہے۔"

کان سُن رہے تھے مگر ذہن الفاظ کے خوفناک معانی سمجھنے سے قاصر تھا کیا اس کی معصوم محبوبہ خون آشام بلا میں تبدیل ہو جائے گی؟ وہ خوبصورت ہونٹ جو صرف پیار کے لئے بنائے گئے ہیں، کیا دوسروں کا خون چوسیں گے؟

"میں جانتی ہوں تم کیا چاہتے ہو۔"

وہ اس کا ہاتھ تھامے ایک غار میں لے آئی جہاں الاؤ کے بلند شعلوں پر لوہے کے برتن میں بلبلے دیوانہ وار رقص کر رہے تھے۔ وہ اس میں لوہے کی سلاخ ہلاتے ہوئے بولی "یہ زہر ہے۔"

وہ تھرا گیا۔

"یہ زہر اپنی عورت کو پلا دو۔ اس کے اثر سے اس کا خون زہریلا ہو جائے گا اور جب وہ بلا اس کا خون پئے گی تو زہر اس کے جسم میں بھی داخل ہو جائے گا۔ تمہاری عورت کی موت میں اس کی زندگی ہے۔"

کمرے میں داخل ہوا تو وہ بستر پر لیٹی تھی۔ کس قدر کمزور ہو چکی ہے۔ چہرہ سیاہ اور ہونٹوں سے جیسے خون نچڑ چکا ہو۔ ہاتھ میں شیشی تھامے بستر کے قریب وہ بے یقینی کے عالم میں کھڑا تھا۔

اچانک اس کی بند آنکھیں کھلیں، آنکھیں چار ہوئیں تو وہ مسکرا دی وہی دلفریب مسکراہٹ جس نے اسے دیوانہ بنا دیا تھا۔ بستر سے اُٹھی تو مسکراہٹ میں ایسی تبدیلی پیدا ہو گئی کہ اس کے جسم کو دہشت کی سرد لہر چھری کی مانند کاٹ گئی۔ وہ اس

کی طرف قدم قدم بڑھ رہی تھی۔ اس نے بازو پھیلا رکھے تھے۔ وہ قدم قدم پیچھے ہٹتا جا رہا تھا۔ تب اُس نے زہر منہ میں انڈیلنے کو ہاتھ اُٹھایا مگر ایک ہی ضرب سے شیشی فرش پر چکنا چور ہو گئی۔ زندگی بچانے والا زہر فرش میں جذب ہو گیا۔

اس کی محبوبہ کے کمزور جسم میں اب بلا کی توانائی تھی کہ اس کے بازوؤں میں وہ کسی بچے کی مانند مچل رہا تھا۔ پھر خوف سے پھیلی پتلیوں نے اُس کے چہرے کو خود پر جھکتے دیکھا۔ باریک دانت شہ رگ پر سُوراخ بنا چکے تھے اور جب وہ اس کے ساکت جسم سے بالآخر ہٹی تو اس کے گالوں سے زیادہ اس کے ہونٹوں کی سُرخی دلفریب تھی۔

لہو کی چہچہاہٹ

رات بھر طوفان نے وحشت کا رقص کیا، بادل کی گرج سے زمین زلزلہ میں مبتلا، بجلی کڑک کڑک کر پہرے لے رہی تھی، بارش ایسی کہ سمندر کا پانی بادلوں سے جا لگا۔ طوفان سے بڑی موجیں، موجوں سے بڑی ان کی خشونت اور خشونت سے بڑی ان کی جھاگ ـــــ

رات بھر طوفان نے من مانی کی! اور پھر طوفان گویا من مانی کرتے کرتے تھک گیا، اس کی طبیعت سیر ہو گئی اور وہ اپنا من پرچانے کسی اور سمت نکل گیا۔

پُر سکون سمندر کی نیلگوں لہروں پر ایک چوبی تختہ، ڈولتا ڈولتا! تختہ پر ایک عورت، بے ہوش، تیز دھوپ میں چمکتا جسم، سیاہ بالوں کے ہالہ میں زرد چہرہ، گویا موم کا بنا، جسم کے سوکھے حصوں پر نمکین ذرّات کی چمک۔

جل پنچھی اس کے گرد، اُڑانیں کرتے، غوطے لگاتے، شور مچاتے۔ دو چار تختہ پر براجمان، عورت بے ہوشی کے گہرے پانیوں میں غوطہ زن!

ایک موج کف بر تختہ کو تھامے آتی ہے اور پُر شور لہجہ میں تختہ کو ساحل پر دے مارتی ہے۔

تیز دُھوپ اور خنک ہوا۔ ہاتھ تھام کر اُسے آہستہ آہستہ نیند کے گہرے پانیوں سے باہر لا رہی ہے۔ پلکوں میں نیند سے بیداری کی خفیف سی لرزش، اور اب وہ بیدار ہے

گہرے سبز رنگ کے گھنے درختوں کی تنی چادر، اُجلی جھاڑیوں میں چمکیلے پھول، پرندوں

کا شور دور کسی آبشار کی آواز اور خاموشی! ایسی خاموشی جس میں دور کی آواز بھی اپنے معانی سمجھا دے، خاموشی کا گھونگھٹ اُٹھانے کو انسانی آواز نہ تھی۔ وہ موٹی موٹی سیاہ آنکھیں کھولے بڑی دیر تک جزیرہ، گہری سبز چادر اور اس پر کڑھے خوشنما پھول دیکھا کی۔

یاد آیا، رات طوفان میں ان کا جہاز غرق ہو گیا تھا، وہ ایک تختہ پر تھی۔ تو گویا وہ زندہ بچ گئی؟ مگر باقی؟ سب مچھلیوں کا کھاجا بن گئے؟ جسم میں کپکپی کی لہر دوڑ گئی، آنکھیں بھر آئیں۔ دل ڈوبنے لگا!

ایک مرتبہ پھر گہری سبز چادر کو دیکھا، جسے چیر کر ابھی تک کوئی جانور، درندہ، انسان برآمد نہ ہوا تھا۔ تو جزیرہ غیر آباد ہے؟ ساتھ ہی بھوک اور عریانی کا بھی احساس ہوا۔ اُٹھنے کی کوشش کی تو نقاہت سے لڑکھڑا کر ریت پر گر پڑی اور عین اسی لمحہ وہ اس پر ٹوٹ پڑے!

ٹیڑھی پگڈنڈی پر وہ پانچوں قطار میں بڑھے چلے جا رہے تھے۔ سب سے آگے چلنے والے کے کندھے پر لٹکی بے ہوش عورت کے بازو اور لمبے بال جھولتے جا رہے تھے۔ وہ خاموش تھے کہ جانتے تھے کہ وہ کیا کرنے جا رہے ہیں!

آبشار کے قریب ہموار جگہ زمین پر ٹپکے جانے سے عورت بیدار ہو گئی مگر اُٹھنے کی سکت نہ تھی، کچھ کہنے کو منہ کھولا مگر ٹھوڑی کپکپا کر رہ گئی، کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر خوف نے حلق میں خار زار اگا دیا تھا۔ خوف سے پھیلی پتلیوں نے دیکھا۔ ایک گڑھا کھود رہا ہے، دوسرا درختوں کی سوکھی ٹہنیاں بڑے سلیقہ سے سجا رہا ہے، تیسرا پتھر پہ ہتھیار کی تیز دھار چمکانے میں محو ہے۔ چوتھا آبشار سے پانی لا رہا ہے۔ پانچواں اطمینان سے تمام منظر پر پہرہ دے رہا ہے۔ خوف سے اکڑی زبان ہونٹوں پر پھیری تو تھوک کا گولا حلق سے نیچے اُتارا مگر حلق کی خشکی میں کمی نہ ہوتی۔ ایک مرتبہ آنکھیں بھینچ کر دیکھا مگر منظر اسی طرح تھا، سبھی اپنے کام میں محو، کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہ تھا حتیٰ کہ وہ شخص بھی۔ جو کچھ نہ کر رہا تھا اور صرف منظر

پر پہرہ دے رہا تھا۔

گڑھا کھودنے والے نے گڑھا تیار کر لیا تھا اور اب فالتو پتھر، سنگریزے، کنکریاں نکال رہا تھا۔ خشک لکڑیاں بھی حسبِ ضرورت جمع ہو گئی تھیں۔ انہیں وہ بڑے قرینے سے ایک کے اُوپر ایک رکھ رہا تھا۔ ہتھیار تیز کرنے والے نے انگوٹھے پر تھوک لگا کر دھار پرکھی اور مطمئن ہو کر سر ہلا دیا۔

اس نے چیخنے کو منہ کھولا مگر چیخ حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ دو نے اس کے ہلتے بازو اور دو نے مچلتی ٹانگیں جکڑ لیں؛ مشّاق گرفت بے حد مضبوط تھی، اس لئے، کندھوں اور ٹخنوں میں پنجے کھبے جا رہے تھے اِدھر اُدھر گردن ہلانے سے بال زمین پر لہریئے ڈال رہے تھے ـــــ اچانک پھیپھڑوں میں اتنی قوت آ گئی کہ حلق کے شکنجے میں جکڑی چیخ رہائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ لمحہ بھر کو شور مچاتے پرندے نامانوس آواز سے ٹھٹھکے، اس کے بعد پوری قوت سے دوبارہ بولنے لگے۔

اب مچلتے جسم کا سر گڑھے پر تھا۔ پانچویں نے زمین پر پڑا ہتھیار اٹھا لیا، اس نے نہایت اطمینان سے دھار پرکھی، زمین پر عورت اب ساکن تھی، اس کے بال اب حالتِ سکون میں تھے، خوفزدہ آنکھوں میں دھار کی چمک کے جگنو تھے۔ چاروں کے جسموں کا زور ان کی انگلیوں میں اُتر آیا تھا۔ مرد نے بائیں ہاتھ سے کس کر اس کی گردن پکڑ لی یوں کہ عورت کو سانس رکتی محسوس ہوئی اس کا دایاں ہاتھ بلند ہوا تو ایک کرن نے دھار کو روشنی میں نہلا دیا مگر ہاتھ قدرے ہل گیا تھا۔ لہٰذا عورت کی آدھی گردن کٹ سکی۔ آدھی باقی رہ گئی اس پر اس نے نہایت اطمینان مگر احتیاط سے دوسرا وار کیا اس مرتبہ پوری گردن دھڑ سے الگ ہو گئی، اُس نے بالوں سے پکڑ کر سر کو ایک طرف گھاس پر پھینک دیا۔ جو کئی لڑھکنیاں کھانے کے بعد قریبی درخت کے تنے سے جا اٹکا، بن گردن جسم کی تڑپن شہ رگ کی تڑپن تھی تو گڑھا خون کا پیالہ بن چکا تھا انہوں نے اپنا پیالہ نکالا اور خون سے لب ریز کر کے باری باری پیا۔ خون سے ان

کے ہونٹ سُرخ ہو رہے تھے اور اب وہ جسم میں توانائی کی نئی لہر دوڑتی محسوس کر رہے تھے جس سے آنکھوں کی چمک میں اضافہ ہوگیا۔ سوکھی لکڑیوں سے الاؤ روشن کیا جا رہا تھا،

پانچویں مرد نے پھر ہتھیار سنبھالا۔ ایسے جچے تلے ہاتھ مارے کہ دونوں بازو اور دونوں رانیں الگ جا پڑیں۔ اس کے سامنے عورت کا دھڑ پڑا تھا۔ اس نے گردن پر ہتھیار رکھا اور اب وہ ایک گہری لکیر میں چلتا ہوا پسلیوں، پیٹ، ناف اور جسم کو دو حصّوں میں تقسیم کرتا گیا۔ پھک کی آواز آئی اور پیٹ سے انتڑیوں کا ڈھیر اُبل پڑا۔ تین انتڑیاں صاف کرنے لگے جن میں سے گذشتہ دو روز کی کھائی غذا کے ذرّے نکل رہے تھے۔ چوتھے نے اوجھڑی سنبھالی اور اسے دھونے چلا گیا۔ پانچویں نے پیٹ کے اندر ہاتھ ہاتھ ڈال کر پھیپھڑا کلیجی، دل، جگر، تلی اور نرخرا کھینچ باہر نکالے مگر اس مہارت سے کہ ہر عضو اپنی درست حالت میں نکلا کسی پر خراش تک بھی نہ آئی یہ سب لذت اور تقویت دینے والی چیزیں تھیں اس لئے جسم سے نکالنے میں ہر ممکن احتیاط کی ضرورت تھی۔ چنانچہ بڑی صفائی سے کلیجی اور پھیپھڑے کے ٹکڑے کٹے گئے۔ دل کی قاشیں بنائی گئیں اور پھونک مار کر نرخرے کو صاف کیا گیا تب پانچویں نے اسے ہار کی مانند اپنے گلے میں ڈال لیا۔

سبھی اپنے اپنے حصے کے دل، پھیپھڑے اور کلیجی کو نہایت انہماک سے کھا رہے تھے، پانچوں خاموش تھے صرف چلتے جبڑوں سے چپڑ چپڑ کی آوازیں نکل رہی تھیں، تازہ گوشت کے ریشے دانتوں تلے آ کر مچل جاتے اس لئے وہ آہستہ آہستہ چبا رہے تھے مگر جو چباتے اسے ایک دم حلق سے نیچے نہ اُتار دیتے بلکہ گوشت کا تمام رس منہ ہی میں رکھتے اس کے بعد جب منہ رس سے بھر جاتا اور مزید منہ چلانا ممکن نہ رہتا تو اس رس کو منہ میں گھماتے رہتے تاکہ تالو اس کے ذائقہ کی لذت سے اچھی طرح آشنا ہو جائے تب، کہیں جا کر وہ رس بھرا گھونٹ حلق سے نیچے اُتارتے۔ کھانے کا یہ طویل عمل گوشت کی لذت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کے لئے تھا۔

الاؤ پوری طرح دھک چکا تھا، شعلوں کی زبانیں سانپوں کی طرح لہرا رہی

تھیں۔ جلتی لکڑیاں تڑخ تڑخ تڑخ کر انگاروں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ الاؤ میں سب سے پہلے عورت کا دھڑ رکھا گیا۔ اس کے بعد دونوں رانیں اور پھر دونوں بازو اور مدھم آنچ پر خستگی برقرار رکھنے کے لئے ان سب کے اوپر دونوں چھاتیاں جو اب محض چربی کی دو گیندیں بن کر رہ گئی تھیں، ان کے اصل ذائقہ کی برقراری کے لئے بے حد احتیاط کی ضرورت تھی کیونکہ زیادہ آنچ سے ان کی نرم چربی پگھل کر بہہ جانے کا اندیشہ تھا۔ اسی طرح زیادہ جل جانے پر ان کی نرم جلد کا لطیف ذائقہ اور سوندھی سوندھی خوشبو بھی خراب ہو جاتی۔

اس کام سے فراغت پاکر بالوں پر جھوتا سر لیا اور ہتھیار کی نوک سے پہلے دونوں آنکھیں نکالیں جو جسم کا لذیذ ترین حصہ ہوتی ہیں اس لئے آنکھیں نکالنے میں پانچویں شخص نے خصوصی احتیاط اور مہارت کا ثبوت دیا چاروں للچائی نظروں سے آنکھیں نکلنے کا عمل دیکھ رہے تھے۔ انہماک کی وجہ سے ماتھے پر شکنیں ابھر آئی تھیں جبکہ آنکھیں نکالنے والے کی اپنی آنکھوں میں عورت کی آنکھیں اتر آئی تھیں، اس نے اس مہارت سے آنکھیں نکالیں کہ پتلی تک محفوظ رہی۔ دونوں آنکھیں ایک چوڑے پتہ میں سجا دی گئیں تو عورت کی کھلی آنکھوں میں قاتل دھار کے جگنو کی چمک ابھی تک برقرار تھی، نہایت احتیاط سے آنکھوں کے حصے کئے گئے مگر انہوں نے منہ میں ڈالتے ہی انہیں نگلنے کی کوشش نہ کی بلکہ منہ میں رکھ کر آہستہ آہستہ زبان اور تالو پر ان کے ذائقہ کی خوشگواری محسوس کرتے گئے حتیٰ کہ منہ کی گرمی سے پگھل کر وہ خود بخود حلق تر کرتی نیچے اتر گئیں۔ ان کی آنکھوں میں یہ لذت نشہ بن کر لہرا گئی۔ پلکوں کے جو بال منہ میں ایک طرف دبا رکھے تھے ان سب کو تھوک دیا گیا۔

اس کے بعد انہوں نے عورت کا سر اٹھایا۔ اور اب سیاہ بالوں کے درمیان اس کا سر دھرا تھا، جس میں آنکھوں کے گڑھوں سے خون رس رہا تھا۔ ہتھیار کی ایک ہی ضرب سے کھوپڑی نکل گئی، بال ہٹانے پر اندر سے مغز نکل آیا، آنکھوں کے بعد یہ

دوسری لذیذ ترین چیز تھی۔ چنانچہ سب نے اُسے بھی نہایت انہماک سے کھایا، وہ مغز کو جلد ختم نہ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ مغز کی ایک ایک لڑی کو لیتے، نہایت غور سے اُسے دیکھتے اور پھر منہ میں ڈال کر آہستہ آہستہ چباتے تاکہ لذّت زیادہ سے زیادہ دیر تک منہ میں رہے۔ کھوپڑی کے پیالے میں سے سارا مغز چٹ کرنے تک چھاتیاں بھن کر خستہ ہو چکی تھیں۔ چنانچہ وہ ان پر ٹوٹ پڑے۔

فضا میں بھنتے گوشت کی سوندھی سوندھی مہک تھی اور اس خوشبو کی لہروں پر ان کے اعصاب ڈوب اور اُبھر رہے تھے۔ کھانے کی خوشبو سونگھ کر ارد گرد کے تمام درخت چہچہاتے پرندوں سے بھر گئے تھے صرف گدھ ٹیڑھی گردنیں کئے خاموشی سے کھانے کا منظر دیکھ رہے تھے مگر غول در غول نہایت صبر و سکون سے اپنی باری حاصل کرنے کے لئے درختوں کی چوٹیوں پر براجمان رہے ان کی باری تب آئی جب نیچے دہکتی آگ سرد ہو گئی اور صرف چوسی ہوئی ہڈیوں کا ڈھیر باقی رہ گیا۔

پیٹ بھرنے کی آسودگی سے گرانبار وہ سب خراٹے لے رہے تھے، ان کے ارد گرد ہڈیوں پر دعوت اُڑاتے گدھ اپنے بڑے بڑے پَر پھڑ پھڑا رہے تھے اور دوسرے پرندے شور مچا رہے تھے۔ جب ان میں سے ایک کی آنکھ کھلی تو دن ڈھل چکا تھا۔ اس نے باقی سب کو بھی جگایا، چربی والے گوشت نے پیاس چمکا دی تھی۔ چنانچہ آبشار کا ٹھنڈا پانی جی بھر کر پیا مگر پانی پی کر مڑنے بھی نہ پائے تھے کہ وہ لوگ اُن پر ٹوٹ پڑے، پیشتر اس کے کہ وہ سنبھلتے اُن کی گردنیں جسموں سے الگ ہو چکی تھیں۔ راکھ کرید کر انگارے نکالے گئے، الاؤ اور زیادہ روشن کر دیا گیا فرق صرف یہ تھا کہ اس مرتبہ پہلے کے مقابلہ میں اس میں لکڑیاں کہیں زیادہ تھیں، شعلوں کی زبانیں پہلے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ لمبی تھیں اور ہتھیار تیز کرنے والے ہاتھوں میں پہلے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ پھرتی اور مشاقی تھی۔

اماوس

دن جتنا اُجلا اور دُھوپ جتنی چمکیلی تھی رات اتنی ہی سیاہ اور ڈراؤنی تھی کہ یہ اماوس رات تھی، ایسی تاریک رات کہ اُلوؤں کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں اور چمگادڑوں کے دل خوشی سے دھڑک اُٹھے۔ اُلّو نے طشتری جیسے گول دیدے گھماتے تو ان میں تپلیوں کی گیندیں دمک اُٹھیں۔ درختوں کی شاخوں پر پتوں کی مانند لٹکیں چمگادڑوں نے اپنے پَر پھیلائے اور اُن کا جھنڈ اُڑا تو فضا کی سیاہی کا ایک حصہ بن گیا۔ بستی سے دور شمشان میں اگیا بتیال دن بھر کی نیند سے انگڑائی لے کر بیدار ہوئے۔ اردگرد پھیلے گھور اندھیرے دیکھ مسکرائے کہ ان کے لئے تو تاریکی کے تاریک سمندر کی تاریک تہہ کی تاریک پرچھائیں ہی چاندنی تھی۔ انہوں نے بن پوَن کے جھونکے جیسے سراپا کو حرکت دی تو تاریکی میں چنگاریاں چھُوٹنے لگیں۔ شمشان میں تازہ جلی لاش کی چِتا ابھی سَرد نہ ہوئی تھی۔ ان کے وجود کی چنگاریاں چِتا کے کوئلوں کو ہوا دینے لگیں۔ وہ ٹوٹی کھوپڑی سے کھیلنے میں مگن ہو گئے کہ اس سے زیادہ پُر لطف کھیل وہ نہ جانتے تھے۔ ادھر قبرستان پر تاریکی موسلا دھار تھی۔ کسی قبر کے سرہانے چراغ تو کیا روشن ہوتا، جگنو کی چمک بھی نہ تھی۔ بجّو تازہ کھدی قبر کے پہلو میں سوراخ بنا رہا تھا کہ جانتا تھا اندر تر نوالہ ہے۔ شام کو دفن ہوئے بچے کی لاش کی مہک ابھی تک اس کے نتھنوں کو سہلا رہی تھی۔ چند قدم پر سیہہ اپنے کانٹوں کا پھول کھلائے منظر کے لطف

میں اضافہ کر رہی تھی۔ بستی سے دور کھنڈر کے بھوت خوشی کی چیخیں، مارتے اٹھے ۔ کبھی وہ بستی کے باسی تھے۔ انسانوں کا شوروغل اور روشنیاں ان کے مشاغل میں حارج ہونے لگیں۔ جن ٹنڈ مُنڈ درختوں پر ان کا بسیرا تھا وہ کٹ کر ایندھن بنے، جلے اور راکھ ہو گئے۔ ناچارا انہوں نے کھنڈر میں پناہ لی اور اب تاریکی کی گھنگھور گھٹا ترنگ کی بارش کر رہی تھی ۔

کھنڈر کے بھوتوں سے ملاپ کے لئے چھل پائیاں تاریکی کے سمندر پر لہرئیے لیتی جا رہی تھیں۔ ناک جس طرف تھی۔ پاؤں کی انگلیاں اُدھر نہ تھیں۔ وجود موڑے بغیر گردن گھما کر اماوس پھولوں سے مَن پر چا رہی تھیں، ان کے بال سانپوں کی مانند لہرا رہے تھے، سانپ جو صرف آگ کے گلزار کا پھول ہوتے ہیں ۔

اماوس مخلوق بیدار تھی!

صرف انسان خوف کی نیند کے بوجھ تلے کراہ رہا تھا!

مگر کچھ انسان، کچھ مرد، کچھ عورتیں ایسی بھی تھیں جن کے لئے اماوس چودھویں کی چاندنی تھی ۔یہ ساعت منتظر کے لئے بیدار تھے۔ ان کے اعصاب خوشی کی تال پر جھوم رہے تھے۔ باہر کی تاریکی من میں دیپ روشن کر رہی تھی۔ اعصاب لمحۂ منتظر کے نشہ کی توقع میں سرشار تھے۔

جب رات کا دل دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا تو اڈتا اُلو زہریلی مکڑی کے جال میں پھنس گیا ۔جس نے زہر بھرا بوسہ اُلو کے دل میں اُتار دیا۔ فضا چیخوں سے یوں لرزی کہ چمگادڑیں لمحہ بھر کے لئے پرواز میں ساکت ہو کر رہ گئیں۔

یہی لمحۂ موعود تھا!

خاوند خاموشی سے اُٹھا، پہلو میں بے ہوش بیوی پر ایک نگاہ ڈالی ۔اس کے بعد اُس نے خنجر کی نوک سے اُس کی دونوں آنکھیں نکال لیں۔ وہ بادامی آنکھیں جن میں محبت کے دیپ لو دیتے تھے۔ اب اس کی ہتھیلیوں پر تھیں، پتلیوں میں ابھی تک محبت بازی کے سرشار لمحوں کی شفق کے گلاب کھلے تھے، خاوند کے چہرے پر عزم کی سختی تھی۔

دائی نے سرِشام جس چاند کو جنم دلایا تھا، اس نے جب اُسے خوابیدہ ماں کے پہلو سے اُٹھایا تو اُسے دیکھ کر وہ مسکرا دیا۔ مگر دائی کی آنکھوں میں بچے کی نہیں کسی اور کی تصویر تھی، اس نے بچہ کو گندے کپڑے کے بدبُودار تھیلے میں یوں ڈال دیا گویا وہ گلا سڑا پھل ہو۔

عین جس لمحہ محبوب آغوش میں لینے کو تھا۔ اُس نے اپنے نوکیلے ناخن سے اس کے سینہ پر ایسی گہری لکیر کھینچی کہ سینہ دو ہو گیا۔ اس نے اس کے سینہ کی پھانکیں ہٹائیں تو اندر دل دھڑک رہا تھا۔ اس نے ڈالی سے کچا پھل توڑنے کی مانند دل کھینچا تو دھڑکن کی آخری تڑپ نے یوں احتجاج کیا گویا پنچھی پنجرے ہی میں رہنا چاہتا ہو، محبوبہ کے سرد ہاتھوں پر اُبھری رگوں میں رگِ سنگ جیسی تُندی تھی۔

تازہ کھدی قبر سے جب لاش نکالی تو وہ اکڑ کر لکڑی ہو رہی تھی۔ اس نے کپڑے اُتار دیئے اور لاش کے تختہ جیسے سینہ پر بیٹھ کر غسلِ عَمل کا آغاز کیا۔

اماوس رات میں اماوس مخلوق بیدار تھی! کھنڈر قبرستان، شمشان اور جنگل کے ملاپ سے جنم لینے والے نشیبی قطعہ پر مشعل کی روشنی سے بننے والا ملگجی دائرہ اپنے اندر روشنی کم اور بُو زیادہ رکھتا ہے کہ یہ مشعل مردار خور کی چربی سے روشن تھی۔ وہ سب قوس در قوس بیٹھے ہیں، ان میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی، وہ لڑکیاں بھی ہیں جن کے جوان جسموں میں سینہ کے کنول مہکتے ہیں۔ وہ مائیں بھی جن کے سینوں پر مردہ چوہیاں جھولتی ہیں۔ مرد جن کے سینہ میں شباب کی بھٹی دہکتی ہے، مرد ـــــ جن کے سینہ کے کھنڈر میں سانس بھوت کی مانند شوکتی ہے۔ مرد ـــــ جن کے سینہ کی گُپھا میں کبھی کوئی کرن نہیں اُتری۔

سب بیٹھے تھے، آنکھوں میں انتظار کی بے چین چمک، اعصاب میں انتظار کا تناؤ، عضلات آنکھ کی مانند پھڑک اُٹھتے۔ دل جیسے ایک لمحہ کو دھڑکن روک کر سننے کی کوشش کرتا مگر آمد کا اشارہ نہ ملتا تو پھر دھڑکن کا سفر جاری رکھتا۔

اماوس رات میں اماوس مخلوق منتظر تھی۔ اس کی جس کا نام نہیں لیا جا سکتا جس کا

نام ادا کرنے کی سزا میں زبان چھالے چھالے ہو جائے۔ وہ عام طور خود نہیں آتا تھا۔ البتہ مقرب احکام لاتا تھا۔ خود مقرب کا بھی مرتبہ بے حد اونچا تھا کہ اس نے اپنی علامت کا بلیدان دیا تھا اور یہ بلیدان معمولی نہ تھا۔ مگر آج تو اعزاز کی رات تھی۔ مرادیں بر لانے کی رات تھی، حسرتیں نکالنے کی رات تھی کہ اماوس رات تھی وہ اماوس رات جب رات کے غار میں چاندیوں اترتا ہے کہ واپسی آسان نہیں رہتی اور اس لئے آج اس کے درشن ہونے تھے جس کا نام نہیں لیا جا سکتا!

مقرب نے دور تک پھیلے دائرہ پر نگاہ دوڑائی چہرے ہی چہرے۔ روشنی کے دائرہ سے باہر نکل کر اندھیرے کے غار میں اترتی سیڑھیوں کی مانند جسم، چہرہ در چہرہ، جسم در جسم، شمشان میں آگیا بیتال نے کھوپڑی سے کھیلنا بند کر دیا۔ اب وہ اماوس مخلوق کی جانب آرہے تھے۔ فضا میں ان کے وجود کی بو پھیلتی جا رہی تھی، قبرستان میں بجو بچے کی لاش سے سیر ہو چکا تھا اور اب وہ بھی مشعل کے دائرہ سے باہر سیہہ کی معیت میں بیٹھا تھا، بھوت اور چھل پائیاں ملاپ سے فراغت پاکر اماوس مخلوق سے ملاپ کے لئے آرہی تھیں۔ درختوں کی پھننگ پر الو کٹورا آنکھیں کھولے تھا۔ چمگادڑیں آئیں اور ان کے سروں پر گویا ساکت ہو کر رہ گئیں۔

یہ اماوس جشن تھا۔

مقرب نے ایک مرتبہ پھر ان منتظر چہروں کو دیکھا جن پر روشنی اور سایوں کی عجیب تحریر پڑھنی آسان نہ تھی صرف وہی پڑھ سکتا تھا کہ جس کا نام نہیں لیا جا سکتا۔ خوشی اور اطمینان نے خود مقرب کی آنکھوں میں مشعلیں روشن کر رکھی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ اماوس مخلوق بلیدان کو کیسے کیسے قیمتی تحفے لائی ہے۔ دلِ عاشق اور چشمِ معشوق سے لے کر نوزائیدہ بچہ تک کیا کچھ نہ تھا۔ یقیناً جشنِ اماوس بے حد کامیاب رہے گا۔ سب کی مرادیں پوری ہوں گی، تاریکی راج کرے گی، زندگی یقیناً قیمتی تھی کہ وہ اس کا مقرب تھا جس کا نام نہیں

لیا جا سکتا۔

تب اچانک ہی وہ ان کے سامنے کھڑا تھا۔ حیرت سے سینے میں اُترتی سانسوں سے فضا جیسے ایک لمحہ کو مرتعش ہوئی اور پھر خاموشی، گھور اندھیرے جیسی اتھاہ خاموشی۔ ایسی خاموشی کہ دردِ زہ میں مبتلا رات کی کراہ سُنی جا سکے وہ جس کا نام نہ لیا جا سکتا تھا سب کی نگاہوں کے دائرہ میں تھا اس کی پیشانی کے نیچے جیسے دو گڑھوں میں الاؤ دہک رہے تھے۔ آنکھوں کی یہ زرد روشنی سب کے اعصاب کو مقناطیسی ڈور میں باندھے جا رہی تھی، پھیلے نتھنوں سے سانس شوکتی آندھی کے جھونکے کی مانند خارج ہو رہی تھی۔ موٹے لٹکتے ہونٹوں میں سے بڑے بڑے زرد دانت نظر آ رہے تھے، چہرہ کی تکون ٹھوڑی کے لمبے بالوں پر آ کر ختم ہوئی تھی، اس کے کھُر زمین پر تھے، مگر سینگ بجلی سے جلے شاہ بلوط کو چھوتے محسوس ہو رہے تھے تو وہ یہ تھا جس کا نام نہیں لیا جا سکتا۔ جس کے درشن کی پرارتھنا کی جاتی تھی۔ ہر پتلی میں اس کی آنکھ تھی، ہر دھڑکن میں اس کا دل تھا۔ ہر دماغ میں اس کا ذہن تھا۔ یہ اماوس برات کا دولہا تھا۔

ہر ایک خاموشی سے اُٹھتا۔ اس کے قدموں میں بلیدان دھرتا اور اپنی حاجت بیان کرتا۔ دشمن کا کلیجہ چاہئے، سوت کا بچہ مرجائے۔ بیوی کا عاشق تباہ ہوجائے۔ خاوند غارت ہو جائے۔ ساس کا نشان نہ رہے۔ ناجائز حمل گر جائے، سب آتے گئے، حاجتیں بیان کرتے گئے، بلیدان دیتے گئے۔ دلِ عشق، چشمِ معشوق۔ زلفِ محبوب —— کیا کچھ نہ ڈھیر ہو گیا!

وہ سب کی سُنتا گیا، اس کی آنکھوں کی زرد روشنی میں سب کا سراپا تھا، اس کے نتھنوں سے نکلتی شوک حرارت دے رہی تھی۔

سب ساعتِ منتظر کے لئے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ مقرب نے اشارہ کیا۔ دائی آگے بڑھی اور نوزائیدہ بچے کو اس کے قدموں میں رکھ دیا۔ سب کی آنکھیں

نوزائیدہ بچے پر جمی تھیں۔ مقرّب نے خنجر نکالا۔ آنکھوں کی زرد روشنی میں خنجر کی دھار کا ہلال چمکا۔ اس نے بازو پورا کھول کر اُوپر تک اُٹھا دیا، سب ساکت تھے۔ اُلو اور چمگادڑ بجو اور سیہہ بھوت اور پچھل پائیاں اور اگیا بیتال اور مرد عورت —— سب خاموش سانس روکے منتظر!

یہ بڑی اہم رسم تھی اور اس کی درست ادائیگی پر ان کے مستقبل کے منصوبوں اور خوشیوں کا دار و مدار تھا۔ نوزائیدہ بچہ کے دل میں خنجر اُترتے ہی سب نے اس پر پل پڑنا تھا۔ اس کے خون اور گوشت میں اعادۂ شباب تھا۔ اس لئے جو جتنا خون پی سکتا یا جتنا زیادہ گوشت کھا سکتا اس کے لئے اتنا ہی زرخیز اور طویل عمر کا تحفہ تھا۔ لہٰذا سب خاموش سانس روکے منتظر!

مقرّب کا ہاتھ بلند ہوا۔ پھر اسے آنکھوں نے نیچے ہوتے دیکھا اور پھر اچانک وہ نوزائیدہ بچہ جو مُردہ تھا۔ کھُلی آنکھوں سے زور سے ہنسا، اس کے قہقہے نے فضا کو لرزا دیا اور عین اُسی لمحہ اندھیرے کی گھٹا جیسے چھٹ گئی اور چودھویں کے چاند نے فضا کو نور کا غسل دے دیا۔

اُلو، چمگادڑ، بجو، سیہہ، بھوت، پچھل پائیاں، اگیا بیتال سب چیخیں مارتے غائب ہو گئے۔ تب چاند سوا نیزے پر آئے ہوئے سورج میں تبدیل ہو گیا۔ مرد و زن اپنے ہی دائرے میں محبوس ہو کر رہ گئے کہ ان کے ایک طرف شمشان تھا، دوسری طرف قبرستان، تیسری طرف کھنڈر اور چوتھی طرف وہ جس کا نام نہیں لیا جا سکتا۔ سب سے پہلے مقرّب تڑپ کر گرا اور پھر ایک ایک کر کے وہ یوں گرے جیسے لاکھ کے پُتلے آگ کے شعلوں میں بہنے جائیں۔

وہ جس کا نام نہیں لیا جا سکتا۔ خاموش سب دیکھا کیا۔ تب اُس نے آسمان پر چمکتے چاند کے تھال کو دیکھا ایک زقند بھری اور پناہ دینے والے اندھیرے میں غائب

ہوگیا۔ صرف نرم کرنوں کے مسکراتے جھولے میں نوزائیدہ بچہ انگوٹھا چوستا رہ گیا۔

شاہی دستر خوان

پیارے بچو! اگرچہ ہمارا تمہارا بادشاہ خدا ہے مگر اس کے باوجود زمین پر بھی بادشاہ ہوا کرتے ہیں۔ تاریخ دانوں نے بادشاہوں کے جو متعدد فوائد گنوائے ہیں۔ ان میں سے ایک فائدہ سب سے بڑھ کر! یعنی بادشاہ کو خلقِ خدا کے لئے مثال بنایا جاتا ہے۔ جس طرح بلندی کی بناء پر سب لوگ چاند سورج کی جانب منہ اُٹھا کر دیکھتے ہیں۔ اسی طرح منصب کی بلندی کے باعث سب لوگ بادشاہ کا منہ دیکھنے پر مجبور ہوتے ہیں اور اسی لئے قابلِ تقلید مثال قرار پاتے ہیں۔

پیارے بچو! تاریخ میں بڑے بڑے نامور بادشاہوں کا ذکر ملتا ہے۔ ایسے نیک نہاد بادشاہ تھے کہ خلقِ خدا کی بہبود کے لئے زندگیاں وقف کر دیں۔ چنانچہ اپنے انہیں کارناموں کی بناء پر اب وہ اپنی مثال آپ بلکہ بعض تو محاورہ بن گئے ہیں۔ جیسے نوشیرواں کا عدلِ جہانگیر کا انصاف! پہلے زمانہ کے بادشاہوں کو بھیس بدل کر اپنی رعایا کا احوال جاننے کا بہت شوق ہوتا تھا۔ ہارون الرشید اگر راتوں کو بھیس بدل بدل کر بغداد کی گلیوں میں نہ گھومتا تو الف لیلیٰ کی کہانیاں کیسے جنم لیتیں؟

تو پیارے بچو! آج ہم بھی ایک ایسے ہی بادشاہ کا قصہ بیان کرتے ہیں۔ جو بے حد مہمان نواز تھا۔ اتنا کہ تنہا کھانا نہ چکھتا، جب اڑوس پڑوس کے بادشاہوں اور شہزادوں

اور اپنے دربار کے اراکین اور عمائدین کی دعوتوں سے دل بھر گیا۔ تو اس نے راتوں کو بھیس بدل بدل کر دار الحکومت کی تنگ و تاریک گلیوں میں گھومنا شروع کر دیا۔ جو غریب یا غریب الوطن نظر آتا دل جمعی سے اسے کھانا کھلاتا۔ کیونکہ ایسے لوگوں کو شاہی محل میں لانے سے مفسدوں کی افترا پردازی کا اندیشہ تھا اس لئے اس مقصد کے لئے شہر کے ایک گمنام گوشہ میں ایک مکان پُر تکلف طور پر آراستہ کیا۔ خدمت کو راز دار خواجہ سرا اور کھانا پکانے کو داروغہ مطبخ کا اہتمام کیا گیا شاہی مطبخ الوان نعمت سے پُر، طرح طرح کے مصالحہ جات اور روغنیات سے مُزیّن اور ماہر باورچی نت نئے اور انوکھے پکوان پکانے کے تجربے کرتا رہتا تھا۔

جب رات آتی، محل میں بیگمات شبستانِ شاہی میں استراحت فرما ہوتیں تو یہ بھیس بدل کر چپکے سے محل کے چور دروازے سے باہر نکلتا، گلیوں میں چوکیداروں کی ہوشیار خبردار کی آوازیں گونج رہی ہوتیں۔ صرف زاہدِ شب بیدار یا طالب علم کے گھر روشنی نظر آتی۔ الغرض؛ بادشاہ اور چور کو چھوڑ کر تمام شہر خوابیدہ ہوتا بادشاہ گلی گلی پھرتا جسے پریشان اور خستہ دیکھتا اس کی مدد کرتا کوئی بھوکا مسافر ملتا تو گھر لے آتا۔ تب نہایت اہتمام سے دستر خوان آراستہ کیا جاتا، خواجہ سرا معطر پانی سے مسافر کے ہاتھ پاؤں سے دور کی مسافتوں کی گرد دھوتا اسے صاف ستھری پوشاک پہنائی جاتی ہم طعام اور ہم پیالہ ہونے کے بعد بادشاہ مسافروں سے ان کی سیاحت کا احوال سُنتا، دیار و امصار کے بارے میں معلومات حاصل کرتا۔ قصصِ عجیب اور حکایاتِ غریب سے لطف اندوز ہوتا۔

پیارے بچو! بادشاہ کے لیل و نہار اسی طور بسر ہوتے، دن امور سلطنت کی نگرانی میں گزرتا۔ رات آتی تو ایک متواضع اور خلیق میزبان کا بھیس بدل کر اپنے خفیہ مکان میں میزبانی کی محفل سجاتا، سلطنت آباد اور عوام خوشحال تھے۔ راستے محفوظ تھے۔ اس لئے دار الحکومت میں مسافروں کی کمی نہ تھی، داروغہ مطبخ ہر دم مصالحہ جات اور

روغنیات کے اہتمام میں رہتا، باورچی نت نئے پکوانوں کے تجربے کرتا اور بادشاہ ہمہ تن میزبانی میں محو رہتا۔

کھانے کے اختتام پر ہر مسافر یہی کہتا گیا کہ ساری عمر میں اور اپنی مسافرت میں نہ تو ایسا خلیق میزبان دیکھا اور نہ ہی ایسی انوکھی لذت والے کھانے چکھے، گوشت کی نرمی اور نفیس ذائقہ بے مثال۔ کھانوں کی مہک میں عجب دلنوازی کھاتے جاؤ مگر اشتہا سرد نہ ہو۔ پیٹ بھر جائے۔ نیت سیر نہ ہو، کھانے سے جسم میں توانائی کی لہریں موجزن ہوتی کہ اعصاب سرشاری سے جھوم اُٹھتے۔ اس گوشت کی حرارت جسم میں جو لذت آگیں آتش کدہ روشن کرتی وہ پانی سے سرد نہ ہوتا۔

بادشاہ یہ تعریفیں سُنتا اور خوش ہوتا، مزید تن دہی سے فرائض میزبانی بجا لاتا اور مہمانوں کی تلاش میں مزید انہماک کا اظہار کرتا۔ کبھی مسافر نہ ملتا تو تنہا کھانا خود پر حرام گردانتا۔

اور پیارے بچّو! تب عجیب بات ہوئی اچانک رازدار خواجہ سرا پاگل ہو گیا اور دارالحکومت کی گلیوں میں چلانے لگا بادشاہ مہمان خور ہے۔ بادشاہ مسافر خور ہے بادشاہ مردم خور ہے۔

سب نے یہ کلمات غریب سے تو خواجہ سرا پر لعنت بھیجی۔ ویسے خواجہ سرا کا پاگل پن بہت مختصر ثابت ہوا کیونکہ اس شام کے بعد وہ کبھی نہ دیکھا گیا۔ بادشاہ نے صرف اتنا کیا کہ شہر کے اور زیادہ گمنام گوشہ میں مکان حاصل کر لیا۔ ایسا مکان جس میں کمروں کا جال بچھا تھا اور ایسے خواجہ سرا کو خدمت کے لئے مامور کیا جس کی سات پشتوں میں بھی کوئی پاگل نہ ہوا تھا۔

ایک رات طعام سے فراغت پا کر اور سفر کی کہانیاں سنا کر اور مے ناب سے مدہوش ہو کر جب تازہ وارد مسافر مہمان خانہ میں سو گیا تو نئے خواجہ سرا نے دست بستہ

عرض کی "حضور"۔

"کیا بات ہے؟"

"کمرہ پھر بھر گیا ہے۔"

"اتنی جلدی؟" بادشاہ نے چونک کر پوچھا۔

"حضور ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔"

"چلو!"

جب خواجہ سرا نے تالہ کھولا تو بادشاہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ اتنا بڑا کمرہ واقعی اٹا پڑا تھا۔ یوں کہ چھوٹی انگلی رکھنے کی بھی گنجائش نہ تھی۔

"حضور"؟ خواجہ سرا نے پوچھا "آج والے مسافر کا کیا کریں گے؟"

"کرنا کیا ہے نیا کمرہ شروع کرا دو۔"

اس نے دانت میں خلال کرتے ہوئے سوچا۔ اتنے بہت سے کمرے اتنی جلدی بھر گئے؟ ــــ کمال ہے!

کنول کے پھول اور تھالیوں جیسے چوڑے پتے ہٹا کر پانی میں چہرہ دیکھا تو حیرت سے آنکھوں کو پھیلتے پایا — یہ میں ہوں؟ اس کی آنکھوں نے اپنی آنکھوں کے دریچوں میں جھانکا تو وہاں کمزوری کی پرچھائیاں لرزتی دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا — یہ مجھے کیا ہو گیا؟ ہوا کی سلوٹوں کے بغیر پانی سفید چادر کی مانند تھا۔ سفید اور سرخ کنول کے پھولوں اور گہرے سبز پتوں والی چادر میں اس کا نڈھال چہرہ کسی اور ہی شاخ کا زرد پھول تھا۔ وہ اور اس کا سایہ ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ خوف کن آنکھوں میں زیادہ تھا اس کی یا سایہ کی؟ بالوں پر ہاتھ پھیرا تو مردہ بیلیں چھو لینے کے احساس نے جسم میں کراہت کی لہر دوڑا دی۔ ان کی سیاہ چمک کس نے چرا لی ہے؟ وہ ریشم کہاں گیا جو کنواریوں کے سہلانے کے لئے تھا؟ اس نے بے چارگی سے بالوں کو ٹٹولا تو ایک گچھا ہاتھ میں آ گیا۔ اس نے دہشت زدہ ہو کر انہیں یوں پھینکا گویا ہاتھ میں مکڑی کا جالا آ گیا ہو۔ بازو ٹٹولے تو پتھریلا گوشت انگلیوں سے دبتا چلا گیا۔ سینے پر ہاتھ دھرا تو دھڑکن یوں ٹھٹھکی گویا دل اپنا نہ تھا یا ہاتھ پرایا تھا اور رانیں؟ درخت کے تنے جیسی مضبوط رانیں گویا نچڑ چکی تھیں۔ نگاہ نیچے سرکی، ہاتھ ٹھٹھکا، اس کی

شکتی کا جھولا چوسا پھل تھا کہ مجرم پھول؟

خالی خالی آنکھوں سے بے شکن پانی میں چہرے کی شکنوں کا جائزہ لیا اور لرز گیا ــــ خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا؟ ــــ سوچتا رہا، ذہن جیسے گزرے نشے کی لہروں پر ڈوبتے ہوئے بلبلے کی مانند تھا جو ہوا کی گرہ پر زندہ ہو مگر جس ہوا کی زندگی کی گانٹھ کا اور چھور نہ ہو۔ اس نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھنا چاہا مگر ٹانگوں نے جسم سنبھالنے سے انکار کر دیا۔ ٹھنڈی ہوا میں جنگل کی باس گویا تھپکیاں دے رہی تھی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ گھل مل کر گویا لوری بن گئی۔

سامنے پانی کے آئینہ میں اس نے آنکھوں پہ پپوٹوں کو گرتے دیکھا تو سر جھٹک کر آنکھوں کو سہلاتی انگلیوں کو گویا جھٹک دیا مگر اسے یہ بھی ناگوار لگا۔ جی چاہا پانی کنارے ان پودوں کی سنگت میں وہ بھی زمین میں پاؤں دھنساتے بیٹھا رہے، بیٹھا رہے حتیٰ کہ سر کی بیلوں میں چڑیا آبسرام کرے۔

شفق شام میں گھل کر درختوں کو سرخ کر رہی تھی۔ پرندوں کی بھاشا سے جنگل گونج رہا تھا۔ اس کے قریب جھاڑی سے ایک ہرن نے گردن نکالی، دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو ہرن کی سرمئی آنکھ میں اس کی تصویر ابھر آئی۔ اس نے کانوں کو ہلا کر سنا تو کہیں کوئی مشکوک آواز نہ تھی تب اس نے اطمینان سے گردن جھکائی اور پانی پینے لگا مگر ابھی پیاس ختم نہ ہوئی تھی کہ وہ چونکا۔ کان ہلائے، بے چین آنکھوں سے اسے دیکھا تو بھیگے ہونٹوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے ــــ اگلے لمحہ اس نے چوکڑی بھری اور پھیلتے سایوں کی دھند میں چھپ گیا۔

تب اس نے سفید اور سرخ کنول کے پھولوں اور گہرے سبز پتوں والی چادر پر اس کا عکس ابھرتے دیکھا۔ پانی میں دونوں کی آنکھیں ملیں تو وہ مسکرادی۔ گردن اٹھا کر دیکھا، عجیب مسکراہٹ تھی کہ آنکھوں میں تھی مگر ہونٹوں پر نہ تھی،

مرد نے کچھ کہنا چاہا مگر ہونٹوں کے کنارے کپکپا کر رہ گئے۔ عورت کے سر پر بالوں کا جنگل تھا اور اسی جنگل نے جسم کا شہر ڈھانپ رکھا تھا۔ اس نے اس شہر کی یاترا کی تھی۔ ایسی یاترا کہ تیرتھ پر پہنچا، ہر گھاٹ دیکھا اور تراوٹ کا اشنان کیا۔ وہ ایسی یاترا تھی کہ پل جُگ میں تبدیل ہو جائے اور ایسا جگ کہ جیون کا روپ دھار لے — خواب تھا یا خیال تھا، کیا تھا؟ — گزری لذت کی کپکپی نے کھنڈر جسم کی بنیادیں میں بھونچال برپا کر دیا۔

وہ اس کے سامنے کھڑی تھی، خاموش، ساکت، صرف آنکھیں تکے جا رہی تھیں۔ پلک جھپکائے بغیر۔ ابتدا میں ان آنکھوں کی مسکراہٹ بے قرار تھی۔ اس نے زور لگا کر اُٹھنا چاہا، اس عورت کی خاطر، اپنی خاطر اُٹھنا چاہا مگر وہ نہ اُٹھ سکا۔ تب نگاہ اپنے پاؤں پر پڑی جن میں سنہری چیونٹیوں اور سیاہ چیونٹوں کی قطاریں گھُسی جا رہی تھیں۔ چیخنے کو منہ کھولا مگر حلق سے آواز نہ نکلی۔ مرد نے مدد کے لئے عورت کی جانب ہاتھ بڑھانا چاہا مگر آنکھوں کی مسکراہٹ دیکھ کر ٹھٹھکا، ہاتھ نے اُٹھنے سے انکار کر دیا۔

عورت نے دھکا دیا تو وہ کٹے ہوئے تنے کی مانند ڈھے گیا۔ شفق اور شام ہاتھ پکڑے رات کی جانب دوڑی جا رہی تھیں۔ عورت جب جھکی تو مرد نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جن میں اب مسکراہٹ کی بجائے جنگل کی شام کے تمام سائے سمٹ آئے تھے۔ وہ اور جھکی تو بال دونوں پر جنگل بن کر چھا گئے اور تب مرد کی دہشت سے پھٹی آنکھوں نے عورت کی مٹھی کھلتی دیکھی۔ اس کی انگلیاں دیکھیں، اس کے ناخن دیکھے، اس نے تو کبھی یہ ہاتھ نہ دیکھا تھا، اس نے تو کبھی یہ انگلیاں نہ دیکھی تھیں۔ اس نے تو کبھی یہ ناخن نہ دیکھے تھے۔ اُس نے اُسے روکنا چاہا مگر اب جیسے جسم کا کھوکھلا تنا چیونٹیوں اور چیونٹوں کا شہر بن چکا تھا۔ ادھر عورت کے ناخن ریتی بن کر مرد کا سینہ چیر رہے تھے۔ وہ نہایت اطمینان سے یہ کام کر رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کھال کو دونوں جانب کھینچا تو پسلیوں کے پنجرے میں پکھیرو دل بے قرار پایا۔ وہ گہرے انہماک سے دیکھتی رہی۔

اس کی آنکھوں میں اب جگنو تھے اور نیم وا ہونٹوں سے سانس بھاپ بن کر خارج ہو رہی تھی۔ پسلیوں کا پنجرہ ٹوٹا تو عورت کے ہاتھوں میں دل نے آخری پھڑ پھڑاہٹ لی۔ اب وہ خاموش پکھیرو تھا۔ وہ ہاتھوں میں لئے اسے دیکھتی رہی۔ وہ کھلونا تھا کہ پھل؟ محبت تھی کہ زندگی؟ تب سیاہی میں اس کے سفید دانت چمکے۔ اس نے گرم دل کی ہموار سطح پر رگڑ کر دانت تیز کئے اور پھر اس نے دانت دل میں اتار دیئے۔ جیسے جیسے دل چبایا گیا لہو میں گرمی بڑھتی گئی اور خون کی گردش میں جیسے بھنور پڑنے لگے۔ تب اس نے مرد کا پھل توڑا جو بہترین ہے اور اسی لئے لذیذ ترین بھی! مرد کی شکتی اس کی رگوں میں، پٹھوں میں، عضوں میں، ماس اور مسام میں، ناخنوں اور بالوں میں، تمام جسم میں جوالا مکھی جگا رہی تھی۔

ہوا ساکت تھی، بجلی سے ٹنڈ منڈ درخت پر الّو خاموش تھا۔ اڑتی چمگادڑیں بھی فضا میں ٹھہری ٹھہری لگ رہی تھیں۔ جنگل چاندنی کی چادر اوڑھے سو رہا تھا۔

عورت کام ختم کر کے جب مرد کے جسم پر سے اٹھی تو گویا اٹھتی ہی چلی گئی۔ آنکھوں کے جگنو اب شعلوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ ماتھے پر نئی جوانی کی لَو تھی تو ہونٹوں پر سرخی کا تاج۔ اس نے بھرپور انگڑائی لی تو محسوس کیا وہ سارا جنگل اپنے بازوؤں میں لے کر اسے مروڑ سکتی ہے۔ اوپر چاند دیکھا تو سوچا وہ جب چاہے اسے توڑ کر نیچے پھینک سکتی ہے۔

—— وہ شکتی دان تھی!

وہ صدیوں سے سفر میں تھی، سفر کی صدیاں شکتی بغیر کیسے کٹ سکتی تھیں —— بالکل اسی طرح جیسے آنے والی صدیوں کا سفر شکتی کے بغیر طے کرنا ممکن نہ تھا۔

اور تب جسم اچانک کمان کی طرح تن گیا۔ حساس کانوں نے آوازیں سنی تھیں جوان مردوں کی آوازیں، ایک مرد کی آواز —— مردانگی کے نشے میں ڈوبی گونجیلی آواز

وہ اِدھر ہی آرہے تھے اور پھر وہ سب ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے سامنے درخت کے تنے سے لپٹی بیل اوڑھے سندر نار کھڑی تھی۔ جس نے جھکا سر اُٹھایا تو اس کی آنکھوں کی ڈور ان میں سے ایک کو باندھ چکی تھی۔

جنون کی رات

ہوا کے بے چین جھونکے نے بلا دستک کیواڑ کھولے تو اس نے سرد ہوا کے بڑے بڑے گھونٹ بھر لیئے۔ سرد لہروں نے جسم میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ بجلی کے نیلگوں لہریئے نے دروازے کی چوکھٹ میں خارجی منظر کی تصویر چمکا دی۔ مگر ایک ثانیے کو، گھاس میں پگڈنڈی کی جگہ کوڑیالا تھا۔ ہوا نہیں بلکہ چڑیلیں شُوک رہی تھیں۔ درختوں کی بجائے ڈائنیں سر جوڑے مگن تھیں اور ان کے پیچھے جنگل۔ جنگل میں جنگل، جنگل مین درخت، جھاڑیاں اور چھتنار۔ جہاں بھوتوں سے چھل پائیاں ملاپ کرتیں۔ تاریک سایوں میں کیڑے تحلیل ہو جاتے۔ ایسے کیڑے جو تیز دھوپ میں اپنا کوہان سر پہ تان لیتے اور جب رات آتی تو اسی کوہان میں بسرام کرتے۔ بجلی دوبارہ چمکی، گھاس پر کوڑیالا ابھی تک سو رہا تھا۔ اس کوڑیالے پہ وہ بونے چلتے تھے۔ جن کی سانسوں سے چنگاریاں پھوٹتی تھیں۔ مگر جو خود کسی جوالا میں نہ جلتے۔

وہ اسی راستے سے آتی تھی۔ کہاں سے؟ یہ نہ بتاتی! شاید جنگل سے؟ مدھم مدھم میٹھی تازہ گھاس کی مہک ہوتی۔ ہونٹوں میں کچا شہد، بالوں میں پھول، کانوں میں کلیاں، گلے میں ہار، بازو میں پھول کنگن، کلائیوں میں پھول گجرے، وہ کیا تھی؟

شجر ؟ تن بن شجر جیسی سختی مگر انگ انگ میں بیل کو ملتا۔ناری پھل پیش کرتی تو یوں لپٹتی جیسے شجر سے بیل، یوں چھا جاتی ۔ جیسے جنگل میں دھند، یوں جھومتی جیسے ساون کی گھٹائیں برستی جیسے پہلی پھوار ۔ وہ بارش میں دھلے شجر کی مانند سرافراز، بے برگ وبار شاخ سرکشیدہ ثمر بن جاتی ۔ وہ جھولا جھولتی ، ناگن بن کر شوکتی ، امرت جل سے نہال ہوتی !

سورج کی پہلی کرن درختوں کی پھننگ پر اٹکے شبنم کے قطروں میں رنگوں کے آنچل لہرا دیتی ، تب جنگل پرندوں کی آوازوں سے گونج اُٹھتا۔گھاس پر سویا کوڑیالا پگڈنڈی میں تبدیل ہو جاتا ، درختوں سے بھوت اُترتے ، ڈائنیں غائب ہو جاتیں ۔ پچھل پائیاں رخصت ہو جاتیں اور چھتنار خالی ہو جاتا۔آنکھ کھلنے پر وہ اپنا پہلو خالی پاتا۔ خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا؟ دھیان کی لہروں میں یادوں کے بنتے ٹوٹتے بلبلوں میں وہ ضدی بلبلہ ثابت ہوتی ۔

بجلی کی چمک سے دروازے کی چوکھٹ میں منظر چمکا تو وہ دہلیز پر تھی ۔گیلے بالوں سے قطرے ٹپکتے تو جسم پر کہیں نہ رکتے ۔ تن کی وادی پر بالوں کے بادل چھائے ۔ بادلوں میں دو چاند منور تھے ۔ گہن کے بغیر۔ دائرے میں دائرہ ۔ دائرے میں دائرہ ۔ دائرے میں آنکھ۔ آنکھ میں دل ۔ دل میں کائنات کا نقطہ۔ شجر تن سے لپٹی تن بیل۔ نار پھل یا نور ثمر؟

ناری پھل چکھا ، پھر کاٹا۔ دانتوں سے ہلال بن گیا۔ دانتوں سے قوس بنی اور پھر دانتوں نے دائرہ مکمل کر دیا ۔

دانتوں کا دائرہ سفید، نیلا اور پھر سُرخ !

منہ میں لہو گنگنایا تو رگوں میں لہو مور بن کر جھوما !

دانتوں کا دائرہ اور اس کی سرخی پھیلتی گئی ۔

منہ میں لہو چھپایا تو لہو کے بگولے رقص کرنے لگے ۔ دائرے پھیلتے گئے ۔ لہو کے جوار بھاٹے کی گت تیز ہوتی گئی ۔ دائرہ پھیلتا گیا ۔ لہو کا تانڈو ناچ تیز تر ہو گیا! بجلی چمکی!

جسم کی پھلواری میں زخموں کے سرخ پھولوں کی کیاریاں تھیں ۔ وادی میں سُرخ پھول، نشیب پر سرخ پھول، فراز پر سرخ پھول، جسم سُرخ پھولوں کا دھکتا بار! اس نے منہ پونچھا تو آستین سرخ ہو گئی مگر اسے اس کا احساس نہ تھا ۔ وہ اب کھل کر برسے بادل کی مانند خالی تھا ۔ سرد بھاپ ۔ سانسوں کی دھمال ختم ہو چکی تھی ۔ تنے ہوئے بازو ڈھیلے ہو گئے تھے ۔ اکڑی رانیں نرم پڑ چکی تھیں ۔ گہری نیند غلبہ پا رہی تھی ۔ سر جھٹک کر نیند سے بوجھل ہوتی آنکھوں کو پورا کھول کر نار کو دیکھا ۔ بجلی کی نیلگوں روشنی میں اس کا جسم دانتوں کے دائروں کے سُرخ ہار لئے تھا ۔ جسم کے آسمانوں پر سُرخ ہلال اور خون کے چاند تھے اس نے اُسے اُٹھایا اور باہر لے چلا تو ٹپکتا لہو قدموں کے نشانات میں سرخی بھرتا گیا ۔ نرم گھاس اور بازوپکڑ کر روکتی جھاڑیوں سے دور اس حصے میں جہاں زمین جذام میں مبتلا تھی ۔ اس نے نار کو وہاں لٹا دیا اور خود دور گھاس پر نڈھال جا گرا ۔ جذامی زمین پر نار کے جسم سے رستا ٹپکتا اور بہتا لہو گرم مہک دے رہا تھا ۔ ایسی مہک کہ من موربا ؤلا ہو جائے ۔

جذامی زمین نے اپنے تمام سوراخ کھول دیئے تھے ۔ سیاہ چیونٹیاں، سنہری چیونٹیاں، سرخ چیونٹیاں لہو کی پکار پر لپکی جا رہی تھیں ۔ سنہری چیونٹے، سیاہ چیونٹے سرخ چیونٹے لہو کی خوشبو کے نشے میں سرشار دیوانہ وار بڑھتے جا رہے تھے ۔ قطار در قطار لہر در لہر، موج در موج حتیٰ کہ جذامی زمین سیاہ، سنہری اور سُرخ لہروں میں تبدیل ہو گئی ۔ چیونٹیاں اور چیونٹے بالوں کی کمندوں سے چڑھے اور برجوں پر قابض ہو گئے ۔ ناک کے نتھنوں سے داخل ہوتے تو آنکھوں کے روشندانوں سے باہر نکلتے ۔ وہ زخم کے

پھولوں پر منڈلائے، گھونٹ گھونٹ لہو پیا۔ لہو نے تن کی جوالا بھڑکا دی۔ چیونٹیاں چیونٹیاں نہ رہیں نار بن گئیں۔ چیونٹے چیونٹے نہ رہے مرد بن گئے۔

تھکن اب اس پر غالب تھی اور خواہش اور کوشش کے باوجود بھی وہ بند ہوتی آنکھیں نہ کھول پایا۔ وہ کتنا سویا لمحہ یا صدی؟ خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا؟ جب بالآخر آنکھ کھلی تو ہوا خنک تھی اور نیلا آسمان دُھلا دُھلا اور نکھرا نکھرا تھا کچھ دیر تک وہ خالی الذہن لیٹا رہا اور پھر اچانک بجلی کے کوندے کی مانند اُسے رات یاد آئی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھا۔ مگر تبدیل شدہ منظر دیکھ کر تصویر بنا رہ گیا۔ جذامی زمین نے صحت یاب ہو کر مُسکرا مُسکرا کر اشارے کرتے سرخ پھولوں کا لباس پہن رکھا تھا!

بحرِ ظلمات

افسانہ — جو میں لکھنا بھول گیا!

میز ہے، کاغذ ہے، قلم ہے۔ سامنے دیوار پر علامہ اقبال کی تصویر ہے، دوسری دیوار پر قائدِ اعظم کا کیلنڈر کھڑکی سے آنے والی ہوا سے جھول رہا ہے۔ شیلف کتابوں سے بھری ہے۔ میز پر اخبارات بکھرے ہیں اور میز کے پیچھے ریک رسالوں سے اٹا پڑا ہے۔ الغرض! لکھنے کا سارا سامان موجود ہے۔

میں افسانہ لکھنے بیٹھا، لیکن اب اچانک جیسے فلم چلتے چلتے ٹوٹ جائے اور خوبصورت مناظر پل بھر میں نظروں سے اوجھل ہو کر اپنے پیچھے سراب کی مانند سکرین چھوڑ جائیں۔ کچھ اسی طرح سے میرا ذہن بالکل صاف ہو چکا ہے۔ خوب صورت تصویر، دل فریب گیت، مدھر سنگیت سب غائب اور ذہن دھلی سلیٹ! یہ عجیب کیفیت ہے۔ میں ایک کہنہ مشق افسانہ نگار ہوں اور اپنے کرافٹ کی ٹیکنیک سے پوری طرح سے واقف ہوں۔ افسانہ کا خوب صورت منظر (خصوصاً چاندنی رات میں باغ) سے آغاز، خوش پوش ہیرو، خوش منظر ہیروئن، افسانہ میں سسپنس پیدا کرنے کے طریقے اور واقعات کے الجھاؤ کی منطق، پھر نقطۂ عروج اور پھر افسانہ کا فن کارانہ انجام! الغرض! میں افسانہ کے فن کی مبادیات سے واقف اور اس کے لوازمات پر حاوی ہوں، اس لیے مجھے افسانہ لکھنے میں کبھی دقت نہ ہوئی تھی اور نہ ہی آج تک کسی افسانے نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا تھا کہ عیار عورت کی طرح غچہ دے جائے مگر اب میرے سامنے کورا کاغذ اسی تلخ حقیقت کا احساس کرا رہا تھا کہ واقعی افسانہ مجھے دغا دے گیا ہے۔

میں ایک مرتبہ پھر ذہن کو مجتمع کرتا ہوں، علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کی تصویریں دیکھتا ہوں

اور تب اچانک مجھے یاد آتا ہے کہ اخبار پڑھنے سے پیشتر افسانہ اپنے تمام خوب صورت کرداروں، چست مکالمات اور دیگر جزئیات کے ساتھ مکمل طور پر میرے ذہن میں موجود تھا، موجود کیا حاضر تھا! لیکن اخبار پڑھ کر ختم کیا تو افسانہ غائب تھا — کمال ہے!

اس خیال سے کہ شاید گم شدہ بچے کی طرح اخبار سے گم شدہ افسانہ کا کوئی سراغ مل جائے، میں اخبار پر نظریں دوڑاتا ہوں مگر اس میں ایسی کوئی خبر نظر نہیں آتی جو ذہن سے افسانہ بھلا دے۔ البتہ ایسی کئی خبریں ہیں جن پر افسانے استوار کیے جاسکتے ہیں تب اچانک ہی مجھ پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ یہ تو وہ اخبار ہی نہیں جس نے میرا افسانہ چرایا ہے۔ یہ تو کسی اور تاریخ کا اخبار ہے۔ ہائیں! تو آج کا اخبار کہاں گیا۔ ابھی ابھی تو یہیں تھا۔ میں تمام اخبارات الٹ پلٹ کر دیکھتا ہوں مگر چیزوں کے اس ہجوم میں میرا آج کا اخبار نہ جانے کہاں گم ہو گیا۔ اب کیا کروں، کیا آج کے اخبار کی گم شدگی کی اطلاع کل کے اخبار میں چھپواؤں! اسی گم شدہ اخبار کی کسی نہ کسی خبر سے تو مجھے گم شدہ افسانہ کا سراغ ملنا تھا اور کم بخت وہی اخبار غائب ہو گیا۔ ایک مرتبہ پھر اخبارات ادھر ادھر کر کے دیکھتا ہوں شاید کل کے اخبارات تلے آج کا اخبار نظر آجائے اس دوران میں مزید ایسی خبروں پر نگاہ پڑتی ہے جو مزید افسانے دے سکتی ہیں لیکن میرا افسانہ لے کر نہ جانے آج کا اخبار کہاں گم ہو گیا اور اب میں خود کو اس پنجرے کی طرح محسوس کر رہا ہوں جس کا پنچھی آنکھ بچا کر پھر ہو گیا ہو۔

اب کیا کروں؟

میں کرسی کی پشت پر سر ٹکا کر خالی الذہن ہو کر افسانے کے بارے میں سوچتا ہوں مگر بات نہیں بنتی، اچانک الجھے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکہ سا ہوتا ہے اور ایک ترکیب سمجھ میں آتی ہے جس طرح شاعر حضرات پندرہ قافیے لکھ کر تیس اشعار کی غزل گھڑ لیتے ہیں۔ کیوں نہ میں بھی اسی طرح افسانوں سے مخصوص کچھ خاص قسم کی سچویشن لکھ لوں یا کچھ خاص کرداروں کی فہرست مرتب کر کے ان کے مطابق افسانہ بنا ڈالوں اور اس کا بھی امکان ہے کہ اس طرح بھولا افسانہ بھی یاد آجائے۔ اگرچہ میں ایک سچے افسانہ نگار کی طرح آمد کا قائل ہوں اور اس طرح مصنوعی بار آوری کا یہ طریقہ مجھے پسند نہیں لیکن کیا کیا جائے

میں جب تک اس بھوسے افسانے کو لکھ نہ لوں یہ میرے ذہن کو ہانٹ کرتا رہے گا۔ دیکھو جی! کیسا زمانہ آگیا ہے۔ پہلے تو کبھی یہ ہوتا تھا کہ چھ کردار مصنف کی تلاش میں نکلتے تھے اگرچہ خود لڑتے جھگڑتے تھے مگر مقصد ایک ہی رکھتے تھے کبھی کبھی "کالو بھنگی" آکر سر پہ سوار ہو کر زبردستی افسانہ لکھواتا تھا اور اب یہ حال ہے کہ مصنف ہاتھ میں قلم لیے بیٹھا ہے اور افسانہ رسہ تڑا گیا ہے۔ حد ہو گئی! افسانہ لکھنا نہ ہوا جنگل میں شکار کھیلنا ہو گیا۔ بندوق بھر کر مچان پہ چڑھ بیٹھو!

خیر قافیوں کی فہرست کی مانند افسانہ کی مختلف سچویشنز گھڑ کر لکھنا شروع کیا۔ کئی صفحے سیاہ کرنے کے بعد احساس ہوا کہ یہ جو میں مروج بلکہ فیشن ایبل سچویشنز بنا بنا کر افسانہ کی چولیں ٹھوک رہا ہوں تو ان میں سے کوئی بھی میرے افسانے کے مطابق نہیں ہے یہ تو اس کے برعکس ہیں، ایسی کہ ان پر ویسا افسانہ لکھا جا ہی نہیں سکتا۔ جیسا میں لکھنا چاہتا تھا۔ جب لکھے کو دوبارہ پڑھا تو مزید یہ احساس ہوا کہ جو کردار (مثلاً سی ایس پی افسر، عوامی لیڈر، دین دار، سرمایہ دار) بڑے طنطنہ والے نظر آتے تھے کاغذ پہ منتقل ہو کر نقلی جو کیدار ایسے مضحکہ خیز بن گئے، عورتیں (مثلاً اونچے گھرانوں کی سوشل ورکر بیگمات، بھارتی فلموں کے محاورہ میں پتی ورتا استریاں، پُرخلوص محبوبہ) جو ذہن کے پردہ سکرین پر بڑی گلیمرس نظر آتی تھیں، کاغذی پیرہن پہن پہن کر بھس بھری گڑیا ثابت ہوئیں۔ میں نے الٹرا ماڈرن لڑکی کی تصویر بنانی چاہی تو الجھ کر رہ گیا اسے ماڈرن بنانے کے لیے سگرٹ پلانا ضروری ہے لیکن اس میں قباحتیں بھی ہیں مثلاً شفاف لب اسٹک پہ تمباکو کے زرد ذرات بدنما لگیں گے پھر اسے رونے کا سین اس لیے نہیں دیا جا سکتا کہ امپورٹڈ آئی لینشر خراب ہو جائیں گی۔ ذہن ایسا بے زار ہوتا ہے کہ سب پھاڑ کر پھینک دیتا ہوں۔ اب کیا کروں؟

نگاہیں پھر کمرہ کی دیواروں پہ مکڑی کی طرح پھرتی جاتی ہیں۔ علامہ اقبال کی تصویر، قائداعظم کا کیلنڈر، کیلنڈر پہ نگاہ اٹک جاتی ہے اور کسی چیز کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ میں اچھل پڑتا ہوں، کئی ماہ سے تاریخوں والے صفحات نہیں پھاڑے گئے۔ چنانچہ اٹھ کر انہیں پھاڑتا ہوں اور کیلنڈر اپ ٹو ڈیٹ کرتا ہوں۔ وہ کتابیں رسالے اخبارات۔ سب پہ نگاہ دوڑ جاتی ہے۔ اچانک

ایک خیال آتا ہے۔ کیوں نہ رسالوں کے افسانوں سے روٹھے افسانہ کو مناؤں۔ رسالہ اٹھا کر فہرست پر نگاہ دوڑاتا ہوں، پیار کے پھول، ناکام الفت، گل ہی نہ جلنے، سہرا مرجھا گیا، پیار کی موت بے وفا۔ نہیں! یہ عنوانات مجھے افسانہ نہیں دے سکتے!

میں دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیتا ہوں، مسلسل سوچ بلکہ مسلسل ناکام سوچ نے سر میں شدید درد کر دیا ہے۔ تنگ آ کر سوچتا ہوں کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں افسانہ نگار نہ ہوتا، نہ دیکھتا نہ سوچتا اور لکھنے کے کرب سے بچتا اور سب سے بڑھ کر نہ لکھنے کی اذیت سے دوچار نہ ہوتا۔ بھولے افسانے کو یاد کرنا تو دیوار چاٹنے والی بات بن گئی تھی۔ اب بھلا کہاں تک دیوار چاٹی جا سکتی ہے اور دیوار بھی نہ ہونے کی!

یہ بھولا ہوا افسانہ دیوار ہی ثابت ہو رہا تھا۔ جبکہ میرا ذہن مکڑی کی طرح اس پر چڑھنے کی کوشش میں بار بار پھسل کر نیچے گر رہا تھا اور میں بھی اس معاملہ میں کنگ بروس ثابت ہو رہا تھا۔

افسانہ اس وسیع و عریض دیوار کی مانند ہے۔ جس کی جڑیں پاتال میں اتری تھیں (یا شاید وہیں سے پھوٹتی تھیں؟) اس کے پھیلاؤ میں مشرق اور مغرب دو طاقچوں کی طرح تھے، بلندی میں یہ اوپر کہیں بہت اوپر ہی اٹھتی جاتی۔ یوں کہ بادل حاشیے کا کام کر رہے تھے۔ اس کی ایک ایک سل میرے وجود سے کئی گنا بڑی تھی۔ اپنی تمام جال سازی کے باوجود، اپنی آٹھ ٹانگوں کے باوجود اور دور تک دیکھنے والی موٹی موٹی آنکھوں کے باوجود میرا وجود سل کے ایک رخنے میں سما جاتا ہے مگر میں پھر بھی کوشش میں ہوں۔ تھوڑا اوپر ہو کہ نیچے دیکھتا ہوں تو کچھ نظر نہیں آتا نہ آگے نہ پیچھے نہ دائیں نہ بائیں۔ اس عظیم دیوار کی بڑی سی سل پر میرا ناتواں وجود موہوم ہے۔ میرے چاروں طرف دھند کے تاریکیوں میں مدغم ہوتے جاتے ہیں گوڑھی سیاہی کی لرزاں پرچھائیاں ہیں۔ اچانک میرے پاؤں کپکپا جاتے ہیں یوں کہ ان میں گویا جان ہی نہ ہو۔ اب تک میں اس عظیم پھیلاؤ سے خوف زدہ نہ تھا میں خود کو اس محیط پر حاوی محسوس کرتا تھا۔ مگر اب مجھے صحیح

معنوں میں اپنے وجود، اپنی کوشش اور اوپر چڑھنے کے عزم کے بے معنی ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ ناتواں اعصاب جیسے کان میں سرگوشی کرتے ہیں۔ چھوڑو تم کس چکر میں پڑ گئے ہو، اوپر جا کر کیا کرو گے؟ اس وسیع پھیلاؤ میں اوپر نیچے اور درمیان سب بے معنی ہیں جو جس جگہ ہے وہی اسی کی جگہ ہے اور وہیں سے اس کا اوپر نیچے اور درمیان متعین ہو گا۔ بس تم اس سل پر اپنے پیر مضبوطی سے جمائے رکھو، تمہیں کیا ضرورت ہے۔ رینگ رینگ کر اپنی سل کو چھوڑ کر دوسری سل میں جانے کی!

میں ایک لمحہ کے لیے ٹھٹھک کر رہ جاتا ہوں!

جلد ہی سر کے چکر کی مانند یہ سرگوشی اور اس کا پیدا کردہ بے ہمتی کا احساس ذہن سے نکل جاتا ہے اور میں پہلے کی طرح بڑی مشکل سے ذرا سا سرک جاتا ہوں یہ معمولی سی ترقی بھی مجھ میں کامیابی کا نشہ بھر دیتی ہے۔ اردگرد نگاہ دوڑاتا ہوں تو سل کو دشت غم کی طرح چاروں کھونٹ تک پھیلے پاتا ہوں اتنا پھیلاؤ کہ اس پھیلاؤ سے دہشت محسوس ہو اور سارے کا غذ الیسی سل پر اپنا وجود حرف غلط لگے۔ مجھے اپنی بے بضاعتی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ مگر میرے اندر ایک موہوم سی روشنی بھی ہے۔ جس کے باعث میں خود کو روشنی کا مینار نہ نہ سمجھنے پر بھی کم از کم جگنو ضرور تصور کر سکتا ہوں اور یہی سوچ کر مطمئن ہو جاتا ہوں کہ اگر میں دوسروں کو روشنی نہ دے سکا تو کم از کم اپنے وجود کو تو منور رکھ سکتا ہوں اور درین حالات یہ بھی غنیمت ہے کہ یہ روشنی میری روشنائی ہے!

اور تب اسی وجودی لمحہ میں مجھ پر یہ کشف ہوتا ہے کہ میں اس دیوار کو اسی صورت میں پار کر سکتا ہوں جب میں سل کو عبور کروں گا اور سل کو یوں رینگ رینگ کر ملی میٹر سفر سے طے نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے تو دوسرا راستہ اپنانا ہوگا، سل کو زیر کرنا ہوگا اور اس کی تسخیر کا اسم اعظم ہے تحریر! سل کو صفحہ کی مانند لکھ کر بھرنا ہوگا، اپنے وجود کی روشنی سے اپنی ذات کی روشنائی سے! اسی طرح یہ سفر طے ہو سکتا ہے سل کے بعد سل صفحہ کے بعد صفحہ! تب روشنی کے جھماکے کی طرح

یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ میرے اپنے وجود کی بقا کا انحصار بھی سل کی تسخیر میں ہے، سل کی تسخیر کا اسم اعظم یعنی تحریر میری قلب ماہیت کا باعث بنے گی یوں سل کے بعد سل اور صفحے کے بعد صفحات میری تکمیل اور رفعت کا باعث بھی بنیں گے ـــ یہ احساس مجھ میں اطمینان اور اس کے نتیجے میں سرشاری کی کیفیت طاری کر دیتا ہے اور میں اپنی تمام صلاحیتیں لفظ پر مرکوز کر کے لکھنے کا عزم کرتا ہوں مگر کیا لکھوں ؟

میز پر سامنے دھرا کورا کاغذ یہ احساس کرا رہا ہے کہ میں تو وہ افسانہ ہی بھول چکا ہوں جس نے میرا اسم اعظم بن کر مجھے اس اندھے کنویں سے رہائی دلوائی تھی !

"سائے کی طرح ساتھ پھریں"

اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا مگر کوئی بھی نہ تھا۔ اگرچہ نادیدہ وجود کو پکڑنے کے لئے بہت تیزی سے گھوما تھا مگر وہ غچہ دے کر گویا سایہ میں تبدیل ہو گیا۔ یہ پہلی بار نہ تھا کہ یوں محسوس کیا بلکہ کافی عرصہ سے یہی محسوس کر رہا تھا گویا کوئی دبے پاؤں پیچھے آ رہا ہو۔ سایہ سرگوشیاں کر رہا ہو۔ جھاڑیاں وجود میں تبدیل ہو جاتیں، ہوا میں اَن دیکھے قدموں کی چاپ گھل مل جاتی۔ بعض اوقات گرم سانسوں کی شوک گردن دباتی محسوس کرتا تھا گویا کوئی دبے پاؤں پیچھے آ رہا ہو۔ سایہ سرگوشیاں کر رہا ہو، جھاڑیاں وجود میں تبدیل ہو جاتیں، ہوا میں ان دیکھے قدموں کی چاپ گھل مل جاتی، گھبراتا، مڑتا، وہ ہوا کے جھونکے کی طرح فرار ہو جاتا۔ کبھی نادیدہ ہاتھ بازو تھام لیتا کانپ کر مڑتا تو جھاڑی کی شاخ میں تبدیل ہو جاتا۔ نادیدہ وجود نے گویا اپنے سحر میں اسیر کر لیا تھا اس حد تک کہ موجودگی کا احساس ہو یا نہ ہو وہ عادتاً گھبرا کر چلتا چلتا رک جاتا۔ جسم خزاں گزیدہ پتہ کی مانند لرز جاتا۔ سانس، سینہ کاٹتی، دل دھڑکن بھولتا، سانس کے بگولے پھیپھڑوں کے کنوئیں میں دیوانہ وار چکر لگاتے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے اور وہ موت جیسی بے ہوشی کے غار میں گرتا جاتا۔

ماں پیر کے پاس لے گئی!

سفید داڑھی، بے داغ لباس، سر جھکائے مریدوں میں منور چہرہ روشن پیشانی پر محراب دیئے کی لو! سرگوشیوں میں باتیں کر رہا تھا۔ جیسے جیسے آواز دھیمی ہوتی گئی ماں کا رنگ بھی اُڑتا گیا۔ خود کو لاتعلق سا ظاہر کرنے کی کوشش کے باوجود سرگوشیوں کا مدوجزر دھڑکن کا آہنگ خراب کر رہا تھا۔ گہری دھار کے سرمہ والی چمکیلی آنکھیں اُٹھا کر پیر اُس کی طرف یوں دیکھتا گویا آنکھوں کے ترازو میں تول رہا ہو، مگر پلڑا کونسا بھاری تھا؟

سانسوں میں الائچی کی مہک نے تسلی دی۔

"بیٹا! گھبراؤ مت سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تو شفقت ریڑھ کی ہڈی پر گرم لہر بن کر پھیل گئی۔ گہرے سبز رنگ کے ریشمی بٹوے میں سے لونگ نکالے۔ دم کر کے ایک لونگ دیا۔ "اسے ہمیشہ پاس رکھنا۔" تین لونگ ماں کو دیئے۔ ایک تکیہ کے نیچے رکھنا تھا، ایک گھر کی چوکھٹ میں دبا دینا تھا اور تیسرا سیاہ مرغ کو کھلا کر صدقہ دینا تھا۔

پیر صاحب نے نذر قبول نہ کی، تسلی دی، دعا کی، سلام کرنے کو پیر صاحب کی طرف دیکھا تو سفید پگڑی میں سے دو سینگ جھانک رہے تھے۔ گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ شیطانی وسوسوں نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔

دونوں خاموشی سے نکلے ماں کے چہرہ پر پریشانی تھی ادھر سینگوں نے اسے دھلا دیا تھا۔

"کیا کہا تھا؟"

وہ ایک لمحہ خاموش رہی، سر اُٹھایا تو پریشان نظریں بیٹے کا چہرہ ٹٹول رہی تھیں۔ اُس نے گھبرا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا، وہ بولی "تم پر سایہ ہے۔"

"کیا؟"

ایسی باتیں تو دوسروں کے بارے میں کی جاتی ہیں یا ایسے واقعات کہانیوں میں پڑھنے

کو ہوتے ہیں یہ خود پر بیتنے والی باتیں تو نہیں !

"سایہ اور مجھ پر؟"

وہ تنک کر بولی "کیوں تم کوئی بھوت ہو کہ تم پر سایہ نہیں ہو سکتا"۔ اپنی بات پر خود ہی ہنس دی۔ یوں اعصابی تناؤ میں قدرے کمی ہو گئی "پیر صاحب کا خیال ہے کہ دونوں وقت ملتے تم کس درخت کے نیچے رُکے ہو جہاں کوئی آسیب ....."

"ماں" اس نے ہنس کر بات کاٹی "وہ پری بھی تو ہو سکتی ہے"

"بک مت" وہ اب غصہ میں تھی "وہ چڑیل بھی تو ہو سکتی ہے"۔

"چڑیل"؟

"ہاں! پتہ ہے چڑیل کیا کرتی ہے؟ رات کو سوتے مرد کے سینہ پر چڑھ بیٹھتی ہے۔ پھر اپنا ہاتھ اس کے حلق میں ڈال کر کلیجہ نکال کر چبا جاتی ہے" ــــ وہ رونے لگی۔

وہ اسے بتانا چاہتا ہے کہ یہ عمل تو اس کی لائی ہوئی بہو عام طور سے کرتی رہتی ہے۔ مگر آنسو دیکھ چپ رہتا ہے' آنسو پونچھ کر بولی "میں تم سے کہا کرتی تھی نا کہ جنگل میں مت پھرا کرو ــــ تمہیں نہیں معلوم جنگل کی اپنی رُوح ہوتی ہے اس میں چلنے والی ہوا کا اپنا مزاج ہوتا ہے اس کے درختوں کی اپنی ادا ہوتی ہے۔ بیٹا ان سے بچ کر چلنا چاہیئے ان کا سایہ دن میں مہربان ہوتا ہے مگر رات کو اس سایہ کی عداوت بہت بری ہوتی ہے"۔

بڑبڑاتی ماں کے پہلو میں خاموشی سے چلتا رہا اچانک ایسا قہقہہ سنا کر سن ہو گیا۔ جسے ماں نہ سن پائی، ضبط سے کام لے کر مڑ کر دیکھنے کی خواہش پہ قابو پایا، ایڑیوں پر نہ گھوما۔ تاہم یہ احساس خاصی دیر تک قہقہہ بن کر پریشان کرتا رہا کہ شاید اس مرتبہ دیکھ پاتا اچانک محسوس ہوا گویا منہ میں انگارہ بھر گیا انگارہ تھوکنے لگا تو یہ وہ لونگ تھا۔ جسے پیر صاحب نے مسلسل جیب میں رکھنے کو کہا تھا۔ تو یہ منہ میں کیسے چلا گیا،

وہ اسے نہ چبا سکتا تھا نہ تھوک سکتا، منہ کی جلن سے عجیب طمانیت کا احساس ہو رہا تھا۔ مگر اس اطمینان کو پگڑی سے جھانکتے سینگوں نے کچے کانچ کی مانند کرچی کرچی کر دیا۔ اچانک گردن کو شکنجے میں جکڑا پایا، چیخا، گھوما، مگر حسبِ معمول کوئی نہ تھا۔

"کیا ہوا؟" وہ جسے اپنی چیخ سمجھا وہ ماں کی تھی۔

"وہی ....." اس نے تھکے لہجے میں جواب دیا۔

"تم رات کو آیۃ الکرسی پڑھ لیا کرو۔"

"اچھا۔"

"واپس پیر صاحب کے پاس چلتے ہیں۔"

"کیوں؟"

"اُنہیں بتاتے ہیں۔"

"یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔"

"میں نے اس مرتبہ تمہارے چہرے پر خوف کی جو تحریر پڑھی ہے ....." وہ جھرجھری لے کر بولی۔

"چھوڑو ماں! میں نے تو خوف کو دوست بنا لیا ہے۔"

بے خیالی میں لونگ چبا جانے کا سنا تو پیر صاحب سُرخ ہو گئے، وہ نظریں جُھکا کے بیٹھا رہا، پیر صاحب نے ایک اور لونگ دم کیا اور اسی لونگ سے چارپائی کے گرد دائرہ کھینچ کر سونے کی ہدایت کی۔ دائرہ کھینچ جانے کے بعد نہ کوئی اندر آئے، نہ باہر جائے۔ بس دائرہ کے پہرہ میں رات بسر ہو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ بیوی بھی دائرہ میں آنا چاہتی تھی۔ مگر اس نے سختی سے منع کیا وہ منہ بسورتی دوسرے کمرہ میں چلی گئی۔

سارا گھر خاموش تھا، وہ خود کو سانپ کی کنڈلی میں محسوس کر رہا تھا، سانپ کی دم منہ میں، مکمل دائرہ، نہ ختم ہونے والا حصار، لگتا دائرہ کی لکیر سانپ بنی رینگ رہی

ہے۔! اگر لکیر ٹوٹ گئی ؟ بیزار ہو کر سانپ نے منہ سے دم نکال دی تو ؟ اس نے دھیان بدلنے کی کوشش کی مگر کوٹے پر لڑتی بلیوں نے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ سخت دہشت میں سوچا انہیں مار بھگائے۔

بند کھڑکی سے رقصاں ذرات قطار اندر قطار چلے آرہے تھے ریگِ رواں کا منور سیلاب ہر ذرہ اپنی ذات کے وجد میں اسیر، اپنی دھڑکن میں محور، اپنے محور پر گھوما روشن اور اپنی تال پر رقصاں رقصاں —— کمرہ میں عجب میلا تھی، روشنی اور سایوں کا سوانگ تھا، اجلی گدلی پرچھائیاں، کوئی پردار، کوئی بے پر، کچھ بے چہرہ جیسے بے وزنی کے عالم میں اس نے خود کو اپنے جسم کے بوجھ سے آزاد ہوتا محسوس کیا، وزن کم ہو رہا تھا۔ وہ اب وہ نہیں تھا جو کبھی تھا، اب وہ اس نامانوس مخلوق میں شامل تھا، پرچھائیں بنا اُن کی سنگت میں لہرا رہا تھا، ڈوب رہا تھا، اُبھر رہا تھا، ہچکولے کھا رہا تھا، لہریئے لے رہا تھا، بلا ارادہ بلا کوشش! منور ذرات لٹو کی مانند ایک مرکز پر گھوم رہے تھے، روشن بگولہ کا چمکیلا دھمال، دھمال میں تیزی آرہی تھی، تیز، تیز تر، تیز ترین۔ وہ دھمال کے مرکز میں تھا، ذرّوں کے بھنور میں ڈوبا، اُبھرا! ایک جسم وجود میں آرہا تھا، پانی پر عکس کی لہروں کی مانند لہرا رہا تھا، لمبے سیاہ چمکیلے بال، بال دعوت دے رہے تھے۔ بلا رہے تھے، سانپوں کی مانند مست، بازو بن کر پھیلے، اپنی پناہ میں لینے کو، عافیت کی گھٹا بن کر برسنے کو!

اچانک سب ختم، منہ میں لونگ کی جلن، تپتا جسم ٹھنڈے پسینہ میں بھیگا بھیگا، بھیگے بالوں میں بیوی انگلیاں پھیر رہی تھی، خوف سے پھیلی آنکھیں بیوی کی آنکھوں سے چار ہوئیں تو وہ گویا مضحکہ اُڑا رہی ہے۔ وہ چیخا" دفع ہو جاؤ"۔ مگر اس پر کوئی اثر نہیں اسی طرح بال سہلاتی جاتی ہے مگر آنکھیں اب بھی مضحکہ اُڑا رہی ہیں۔ وہ اسے بھگانا چاہتا ہے مگر خود کو بے بس پاتا ہے۔ جسم بے جان ہے، صرف آنکھوں میں جان باقی ہے۔

بیوی اس کے سینہ پر چڑھ بیٹھی ہے آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ اس کا ایک ہاتھ اس کے حلق کے نیچے اُترتا چلا جارہا ہے ۔ ہاتھ جسم کے اندر گویا مختلف اعضا ٹٹول رہا ہے ، گویا کسی چیز کی تلاش ہو ۔ نرخرہ ، پھیپھڑے ، تلی ، پتہ ، جگر اور پھر دل ـــــ دل اب بیوی کی مٹھی میں دھڑک رہا ہے ۔ کانپ رہا ہے ۔ پھڑ پھڑا رہا ہے اور پھر ایک جھٹکے سے وہ دل کو اکھاڑ لیتی ہے وہ اپنے دل کو اپنے سینہ سے باہر دیکھ رہا ہے ۔ ساکت دل سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہیں سینہ پر ابھی تک بیوی کا بوجھ ہے ، جس کی آنکھیں اب بھی مضحکہ اڑا رہی ہیں اور پھر اس نے دل منہ میں رکھ لیا وہ اسے آہستہ آہستہ چبا رہی ہے اس کے منہ سے خون کے قطرے گر رہے ہیں ، مگر وہ مسلسل چبائے جاتی ہے اور آنکھیں لذت کے نشہ سے بند ہوتی جا رہی ہیں ۔

صبح گھر والے آئے تو دائرہ سے باہر اوندھی چارپائی کے نیچے بے ہوش تھا اس نے ٹھیک ہو کر سب سے پہلے روتی بیوی کو میکہ بھجوانے کا کام کیا خوف اس کی گھریلو زندگی کو دیمک بن کر کھا گیا ۔ پہلے اسے بیوی سے کراہت کا احساس ہوا ۔ کراہت خوف میں تبدیل ہوئی جس سے گہری نفرت نے جنم لیا ۔ اسے یقین تھا کہ اس کی بیوی نے جادو کرایا ہے اگرچہ ماں نہ مانتی کہ اسے بھولی بھالی صورت والی بہو بے حد عزیز تھی ۔ بیٹے کی وجہ سے اسے میکہ بھجوا دیا مگر روتی آنکھیں دیکھ کر دل نہ مانا ۔ اگرچہ بیوی کے جانے کے باوجود بھی نادیدہ کے شب خون کا سلسلہ جاری رہا لیکن نہ جانے ان دیکھے قدموں پر بیوی کی چاپ کا شبہ کیوں گزرتا ، نادیدہ کے کندھے پر بیوی کی گردن چپک جاتی ، بستر پر بیوی کا جسم محسوس کرتا تو آیۃ الکرسی کا ورد کرتا ۔ لونگ کے دائرہ میں خالی بستر سے خوف آتا ۔

بیوی کے خط پڑھے بغیر پھاڑ دیتا ، دروازے پر پرچیاں کرنے کے لئے اس نے نقشِ سلیمانی بھجوایا تو دیکھتے ہی چولہے میں پھینک دیا ، اس رات زبردست طوفان

آیا۔ بادل چھت پر گرجتے اور بجلی کمرہ پر کڑکتی رہی۔

(۲)

اس نے سوچا!

نادیدہ میری تلاش میں ہے تو کیوں نہ میں خود اس کی تلاش شروع کر دوں۔ اُلجھی ڈور کا سرا کیسے ملے۔ کیوں نہ وہاں جاؤں۔ جہاں اس کی موجودگی کا امکان ہو۔ یہ سوچ سارا سارا دن جنگل میں گھوما کیا شکر دوپہریں بھی بجلی سے جھلسے ٹنڈ منڈ درختوں کے نیچے بسر کیں۔ دونوں وقت میں پیپل کے نیچے سویا۔ بڑ کی داڑھی پکڑ جھولا۔ مگر اسے نہ پا سکا۔ کوئی آسیب تھا بھی تو وہ درخت کی جڑ میں سمٹ گیا پتوں میں بکھر گیا اور جھونکوں کی سائیں سائیں میں تبدیل ہو گیا۔

جنگل بیچ درختوں میں گھری گھاس کی طشتری تھی وہ اس میں دائرہ دائرہ پیشاب کرتا۔ مگر بدروح نمودار نہ ہوتی۔ پرندے ٹیڑھی گردن کئے دیکھتے تو انہیں پکا دتا، وہ اُڑ جاتے تو اداس ہو جاتا نہ اُڑتے تو پریشان!

تتلی دیکھی تو رنگ بھرا بچپن بیدار ہو گیا۔ تعاقب کیا۔ پکڑی تو پھولی سانسوں میں دل خوشی سے دھڑک رہا تھا۔ لمحہ بھر کو تتلی کے پر کانپے اور پھر وہ کوّا بن گئی۔ مگر وہ کائیں کائیں قہقہہ میں تبدیل ہو گئی، سارا جنگل قہقہہ کی بازگشت بن گیا، پوروں پر تتلی کا رنگ چمک رہا تھا۔ جسم میں بجلی کی لہر، بھاگنے کو قدم اُٹھایا تو پاؤں اپنے ہی پانی میں پائے۔ درخت دیوانگی سے جھوم رہے تھے، پتے دہشت سے تالیاں بجا رہے تھے۔ پرندے انجان بنے گلکاریاں مار رہے تھے۔

بے لگام گھوڑے کی مانند بھاگنا چاہا مگر جانتا تھا کہ یوں بھاگا تو کہیں کا نہ رہے گا۔ فرار کی خواہش کے باوجود بھی سکون سے چلتا رہا کم از کم یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا رہا اور یہ کوشش بھی کہ کسی پرندہ پر نگاہ نہ پڑے، درخت کی جڑ میں زخمی فاختہ دیکھی تو اسکی دُکھی

آنکھوں میں درد کی تحریر پڑھنے سے انکار کر دیا اور رحم پر دہشت کی چھری چلا دی۔

(۳)

ماموں نے بتایا۔

"جنگل کے آخری سرے پر، قبرستان کے پچھواڑے ایک بہت بڑا عامل ہے۔ اس کے پاس چلتے ہیں وہ ہانڈی اُڑاتا ہے۔"

"ہانڈی کیا؟"

"کالے علم کا سب سے خطرناک ہتھیار" سالخوردہ عامل بتا رہا تھا جس کا چہرہ ایسا گویا ہڈیوں پر گوشت مڑھا ہو۔ اس کی لمبی عمر کے بارے میں کئی قصے مشہور تھے۔ مگر کوئی جھری نہ تھی۔ کاغذ جیسی جلد ایسی کہ آر پار دیکھا جا سکے، لمبی سی ناک اندر کو بھنچے باریک ہونٹ گویا لکیر کھنچی تھی۔ سر کے بال پلکیں، بھنویں سب صاف، جسم پر بھی بالوں کا نشان تک نہ تھا۔ لنگوٹ باندھے کوڑے کے جس ڈھیر پر بیٹھا تھا اس سے بدبو کو مجسم صورت میں اُبھرتے دیکھا جا سکتا تھا۔ ایک دائرہ کے اندر خود تھا۔ باہر اس کا کانا چیلا بھی بالوں سے آزاد تھا۔ اس دائرہ کے باہر ایک اور دائرہ تھا جس کے کنارہ پر یہ دونوں تھے۔

حبس اور بدبو بھری فضا میں سانس لینی دشوار، پسینے سے چپچپاتا جسم، عامل بتا رہا تھا۔ "کالے علم میں تن کی حفاظت بہت ضروری ہے"۔ اس کے ہاتھوں پر سیاہ رگوں کا جال تھا۔ ناخن بڑھ کر یوں مڑے کہ گدھ کے پنجہ میں تبدیل ہو گئے۔ آواز میں صدیوں پُرانے اندھے کنویں کی بازگشت"۔ اگر دشمن کو بال مل جائیں۔ ناخن مل جائیں، کپڑے مل جائیں تو ان پر عمل کر کے وہ تباہ کر سکتا ہے"۔

اس کی آنکھوں میں زرد آگ تھی "کس پر شک ہے"؟

"بیوی پر"

"کیوں"

"کہہ نہیں سکتا اُس کا خیال ہے کہ میں اس کی بہن میں دلچسپی لیتا ہوں۔"

ان کے درمیان دائروں کی لہریں پھیلی تھیں۔ دائروں کے باہر سے یہ بول رہے تھے اور دائرہ کے مرکز میں سے عامل مگر آواز کے دائرے زمین کے دائروں سے ہم آہنگ نہ ہو پاتے۔ اندھے کنویں کی گونج بتا رہی تھی۔

"دشمن کو حقیر مت جانو۔ اُسے ختم نہ کروگے تو وہ تمہیں ختم کر دے گا۔" اس کی زرد آنکھوں کا الاؤ روشن تھا۔" میں نے ایک دشمن کی خاطر کالا علم سیکھا۔"

"تو کیا اُسے ختم کر دیا۔"

"نہیں وہ اپنے علم میں محفوظ ہے۔"

"اور تم؟"

"میں اپنے علم میں محفوظ۔"

سائے سرکتے سرکتے پاؤں سے جا لگے۔ فضا میں حبس اور بو کو جسم کی مانند محسوس کیا جا سکتا تھا۔ ہر سانس ناگوار۔

چیلا بولا "سائیں تو رات کو قبر میں سوتا ہے۔"

"قبر میں؟"

"میں نے اپنی قبر آپ کھود رکھی ہے۔ اگر رات کے وقت دشمن غالب آجائے تو میں قبر ہی میں رہ جاؤں۔"

"مگر کیوں؟"

"حرام موت کے بعد روح بھٹکتی رہتی ہے۔ زندگی میں انسان جتنا چاہے بھٹک لے مرنے کے بعد روح کو نہیں بھٹکنا چاہیے۔ دشمن میرا مردہ حاصل کر لے تو وہ میرا کلیجہ چبا جائے گا، میرے ناخنوں کا ہار پہنے گا اور میری لنگوٹی سے روحیں بلانے کا عمل کرے گا۔ اس لئے میں دن کو ان دائروں سے باہر نہیں نکلتا اور رات کو قبر میں سوتا ہوں۔"

رات دبے پاؤں چلی آئی تھی۔ دائرہ کے اندر اور دائرہ کے باہر ہم کلام دو الگ سیاروں کے پاس تاریکی میں چہرے چھپ گئے آوازوں نے معنویت اختیار کر لی۔

"ہانڈی کالے علم کا سب سے بڑا اور خطرناک ہتھیار ہے۔" قبرستان کی سائیں سائیں میں عامل کی آواز گھل مل رہی تھی۔

"اس میں کیا ہوتا ہے؟"

"یہ ایسا بھید ہے جسے جاننے کے لئے لوگ جانیں دے چکے ہیں اور اُسے ہانڈی نہ کہو، موت کہو موت۔ عامل جب ہانڈی اُڑاتا ہے تو پھر اسے روکنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہوتا ہے ہاں اس سے بڑا عامل ہو تو اور بات ہے"

"بابا! ہمارا کیا بنے گا؟"

"بے فکر رہو"

"دشمن ختم ہو جائے گا؟"

"اگر وہ تمہاری بیوی ہے اور کسی چھوٹے موٹے تعویز کی بات ہے تو وہ آسانی سے ختم ہو جائے گی۔"

"اور اگر...؟"

"اگر کسی بدروح نے تم میں بسیرا کر لیا ہے تو اس کے لئے لمبا عمل ہوگا اور خاصہ وقت لگے گا۔ کیا تم اس کا کپڑا لائے ہو؟"

"جی"

اس نے دوپٹہ چیلے کی طرف پھینکا جس نے عامل کو پکڑا دیا۔

پہلے پہر کا کمزور چاند منظر پر مریض روشنی ڈال رہا تھا اس مردہ روشنی میں عامل اور چیلا خود بھی روح ہی نظر آرہے تھے۔

وہ اچانک چیخا "رُک جا!"

آواز کی کڑک نے رونگٹے کھڑے کر دیئے "رک جا"

سامنے کیکر کی شاخوں کے عقب میں سیاہ ہانڈی اُڑی آرہی تھی اس کے تحکمانہ لہجہ سے وہ ایک لمحہ کو جیسے فضا میں معلق رہ گئی، ساکت ہو گئی۔

خوف سے پھیلی پتلیوں نے ہانڈی کو دیکھا جو بالکل عام سی تھی، کم روشنی میں وہ سیاہ گولہ نظر آرہی تھی۔ عامل زور زور سے جاپ کر رہا تھا۔ ہانڈی اب تک معلق تھی۔ ان دونوں نے بھاگنا چاہا مگر خوف سے اکڑی ٹانگوں نے حکم نہ مانا۔ سانس رُکی تھی کہ چل رہی تھی وہ بے خبر تھے۔ جاپ کی رفتار میں آہستہ آہستہ کمی آتی گئی۔ لہجہ کی شدت میں بھی نرمی پیدا ہو رہی تھی اور پھر جیسے آواز کی ڈور سے بندھی ہانڈی آہستہ آہستہ نیچے اُترنے لگی، نیچے اور نیچے، اور نیچے اور اب وہ ان کے سروں پر معلق تھی، اگر ان دونوں کے منہ سے چیخیں نہ نکلیں تو اس لئے کہ خشک حلق چیخنے کے قابل ہی نہ تھے۔

ہانڈی چند لمحے سروں پر معلق رہی اور پھر زمین پر اُتر آئی عامل بے حد خوش تھا، اس نے چیلے سے کہا "یہ پہلا موقع ہے کہ میں اس کی ہانڈی اُتارنے میں کامیاب رہا ہوں۔ اب یہ ہانڈی میں اس کی طرف بھیجوں گا" وہ دائرہ سے باہر نکل سیدھا ہانڈی کی طرف گیا۔ پیچھے پیچھے چیلا تھا۔ "اب یہ بے ضرر ہے" اس نے جیسے خود کو تسلی دی۔ ہانڈی کو چھوتے ہی زوردار دھماکہ ہوا۔

(۴)

وہ فضا سے بلند ہوا تو نیچے میلے کپڑوں کی مانند جسم بکھرے پڑے تھے اس نے اپنا جسم دیکھنا چاہا مگر وہ جھاڑی میں اٹکا تھا۔ باقی نہ جانے کہاں غائب تھے۔ اس کے سامنے کئی راستے تھے مگر وہ اپنا راستہ جانتا تھا۔ اس نے اپنی سسرال کا رُخ کیا۔

آشوبِ چشم

"مکھی کی بظاہر دو آنکھیں نظر آتی ہیں، لیکن یہ دو آنکھیں بہت سی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی آنکھیں مختلف زاویوں سے بڑی آنکھوں میں لگی ہوتی ہیں اور ان ہی کی بدولت مکھی آگے پیچھے دائیں بائیں چاروں طرف دیکھ سکتی ہے اور یوں اپنے نادیدہ دشمن سے محفوظ رہتی ہے۔"

کمال ہے: اس نے حیرت زدہ ہو کر کتاب رکھ دی۔ مکھی ایسی مخلوق کو اتنی زیادہ آنکھوں سے نوازا گیا اور ہم انسان — اشرف المخلوقات کو محض دو آنکھوں پر ٹرخا دیا گیا، ہمیں زیادہ آنکھوں کی ضرورت ہے کہ مکھی کو؟ کیا صرف مکھی ہی کو نادیدہ دشمن سے محفوظ رہنے کا حق حاصل ہے؟ گندگی کی اس پوٹ کو تو آنکھوں کے بغیر ہونا چاہیئے تھا اور اس کے برعکس ہم انسانوں کی آنکھیں ایسی ہوتیں کہ پیچھے بھی دیکھ سکتے۔ پھر سوچا اگر نہ دیکھیں تو سامنے کی آنکھیں بھی کس کام کی؟

اس نے آنکھیں بند کر کے سر کرسی کی پشت پر ٹکا دیا۔ آنکھیں بند کیں تو اسے آنکھوں کے بارے میں کچھ اور بھی یاد آیا۔ وہ کئی دنوں سے یہ دیکھ رہا تھا کہ کچھ لوگوں کی آنکھیں پیشانی کی بجائے سر کے پیچھے جا لگی ہیں۔ یہ عجیب سا احساس تھا اور یوں لگتا گویا کار تو اندھیرے راستہ پر جا رہی ہو اور پچھلے بمپر پر ہیڈ لائٹیں روشن ہوں۔

آنکھ بطور عضو پیشانی ہی پر نظر آتی یعنی پلکیں بھی ہیں ان کے پیچھے آنکھ کی پتلی بھی حرکت کرتی نظر آتی آنکھ جھپکتی دکھائی دیتی — سب کچھ ایسے ہی تھا جیسے ہونا چاہیے لیکن پھر بھی نظر آنے پر بھی نہ نظر آنے کا گریز یا احساس جیسے ہانٹ کرتا رہتا۔ یوں لگتا جیسے آنکھ میں کوئی تنکہ پڑ

گیا ہے جو نہ نظر آتا ہے اور نہ نکلتا ہے عجب سی رڑک تھی !

کہیں میری آنکھیں بھی تو پیچھے نہیں جا لگیں ؟ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور فوراً ہاتھ سے سر کی پشت ٹٹولی اور پھر مطمئن ہو کر آنکھیں بند کر لیں ۔ لیکن پھر بھی اندیشہ ہی رہا، ہو سکتا ہے آنکھ گردن پر بالوں کے اندر چھپ گئی ہو لہٰذا مزید اطمینان کرنے کو آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آنکھیں دیکھیں ۔ بلاشبہ آنکھیں اپنے مقام پر ہی تھیں ۔ پھر سوچا کہیں آنکھوں کا نظر آنا بھی فریب نگاہ نہ ہو کہ صحرا میں آنکھوں والا ہی سراب دیکھتا ہے اور اندھا پرندہ کبھی دام میں نہیں پھنستا ۔

چند دن قبل تک وہ آنکھوں کے جال میں نہ پھنسا تھا لہٰذا بے دیکھے آزاد اور مسرور زندگی بسر کرتا تھا ہوا یہ کہ وہ دوست کے پاس بیٹھا اس کی سیاسی گفتگو سن رہا تھا ۔ یہ بہت مشہور اخبار کا مدیر تھا ۔ اور اس کے اداریوں پر ایمان لانے والوں کی تعداد لاکھوں سے بھی تجاوز کرتی تھی ۔ گفتگو کے دوران وہ ٹیلی فون کرنے کو مڑا تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ مدیر کی آنکھیں گدی پر لگی تھیں ۔ اس نے حیرت سے آنکھیں جھپکا کر غور سے دیکھا تو واقعی اس کی آنکھیں پشت پر تھیں ۔ کمال ہے ! اس نے حیرت سے سوچا یہ اداریہ کیسے لکھ لیتا ہے ۔ کیا اداریہ لکھتے وقت سامنے کی چیزوں کی طرف پشت کر لیتا ہے ؟

" ارے تمہاری آنکھیں ..... "

" کیا ہوا میری آنکھوں کو ؟ " اس نے عینک اتار کر پوچھا ۔

" یہ ..... یہ ..... "

" کیا یہ یہ لگا رکھی ہے ؟ "

" وہ — پیچھے کیا ہے ؟ "

" پیچھے کرسی ہے دیوار ہے ۔ "

وہ اسے ٹکر ٹکر دیکھتا رہ گیا اب بھلا اتنے بڑے اخبار کے اتنے نامور مدیر کو وہ یہ کیسے بتلائے کہ اس کی آنکھیں تو پیشانی سے اور کہیں منتقل ہو چکی ہیں ۔ وہ عزیز دوست ہیں لیکن غالباً وہ یہ بات

تو نہ سن سکے گا اور نہ ہی تسلیم کر سکے گا پھر بیکار اپنا مذاق اڑوانے کا کیا فائدہ ؟

" بولتے کیوں نہیں ؟"

" کچھ نہیں یار ـــــ ایسے ذرا تم سے مذاق کر رہا تھا ۔"

" تم ایسے چغد ہو کہ ڈھنگ سے مذاق بھی کرنا نہیں آتا ۔"

اس پر وہ جل کر بولا ۔" تمہاری آنکھیں پیچھے لگی ہیں ۔"

" ہا ہا ہا " ! اس کا قہقہہ اخبار کے دفتر میں یوں گونجا جیسے اجڑے اہرام میں گذشتہ زمانوں کی ہنسی !

" میں نہ کہتا تھا کہ تم اتنے چغد ہو کہ تمہیں ڈھنگ کا مذاق بھی نہیں آتا " وہ پھر زور سے ہنسا ۔ ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا اس نے عینک اتار کر رومال سے آنکھیں پونچھیں ۔ وہ ذرا اٹھ کر اس کی پشت کی طرف گیا تو دیکھا کہ پشت کی آنکھوں میں ہنسی کے آثار نہ تھے ۔ اس نے زچ ہو کر سوچا ۔ میں انگلیاں چبھو کر اسے پشت کی آنکھوں کا احساس کراتا ہوں ۔ اس نے جب پلک نہ جھپکنے والی آنکھوں میں دونوں انگلیاں گاڑ دیں تو اسے یقین تھا کہ انگلیوں کے سرے اس کی چپ چپاتی پتلیوں سے چھوئے ہیں ۔

وہ چڑ کر بولا ۔" ابے یہ میرے بال کیوں کھینچ رہے ہو ۔"

" ہائیں ! تمہیں کچھ نہیں محسوس ہو رہا ؟"

بال کھینچو گے تو ضرور محسوس ہوگا ۔"

" بس ؟"

" اور ـــ کیا ؟"

جب وہ خفیف سا ہو کر جا رہا تھا تو اسے یقین تھا کہ پشت کی آنکھ نے شرارت سے آنکھ ماری ہے !

کمال ہے اتنے بڑے اخبار کا اتنا بڑا اداریہ نگار !

دو تین دن بعد اپنے پروفیسر دوست سے ملاقات ہوئی جو لائبریری سے بھاری بھر کم

کتابیں بغل میں دابے نکل رہا تھا یہ ادب کا بہت بڑا نقاد تھا اسکے تنقیدی مقالات ملک کے مقتدر ادبی جرائد میں طبع ہوتے تھے ۔حضرت علامہ اقبال اس کا محبوب موضوع تھا ان دنوں علامہ کے فلسفہ میں نگاہ کی اہمیت کے موضوع پر مقالہ لکھ رہا تھا ۔ پروفیسر نقاد بڑے جوش سے بتا رہا تھا کہ کن کن نظموں میں حضرت علامہ نے آنکھ کی تشبیہات اور استعارات استعمال کئے ہیں بلکہ اُس نے تو یہ گنتی بھی کر رکھی تھی کہ تمام کلامِ اقبال میں نگاہ کا لفظ کتنی مرتبہ استعمال ہوا مگر وہ اُلجھا اُلجھا سا تھا کیونکہ اس کی بھی پُشت پر آنکھیں تھیں اور اسے بھی پیشانی کی آنکھوں کے بے مصرف ہونے کا احساس تک نہ تھا وہ بڑے جوش سے اسے بتا رہا تھا ۔

" ایک بہت بڑی اقبال کانفرنس منعقد ہونے والی ہے اس میں بڑے بڑے اقبال شناس آ رہے ہیں ۔ مجھے بھی بلایا ہے ۔"

" تو یہ سب کتابیں ..... ؟"

" ہاں ! اسی مقالے کے لیے ہیں — یہ جمالیات کی ہیں یہ نفسیات کی اور یہ کانٹ اور نطشے کے افکار ہیں ۔"

" مگر تم انہیں پڑھو گے کیسے ؟"

" اندھا ہوں کیا ؟"

" تو پھر..... ؟ پیشانی کی آنکھیں خشمگیں تھیں ۔

" تمہاری آنکھیں تو پُشت پر ہیں ۔"

"WHAT?" اس نے سر کی پشت پہ ہاتھ مارا اور پھر ہنس کر بولا ۔" یار ! کوئی ڈرامہ کرنا تو تم سے سیکھے ۔"

" نہیں تو "

" وہ زور سے ہنستا ہوا بولا ۔" آخر کو ہو نا افسانہ نگار ۔"

" نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ۔" وہ اب محجوب سا تھا ۔

"ان دنوں ٹی وی کے لئے کوئی پلے لکھ رہے ہو" ۔؟

"ٹی وی والے آنکھوں کی تھیم پر ایک ڈرامہ سیریز شروع کر رہے ہیں ۔مجھے بھی کہا تھا۔ لیکن میں شاید لکھ نہ پاؤں"۔

"کیوں ؟"

"مجھے تو آنکھیں ہی ٹھیک مقام پر نظر نہیں آتیں"۔

پروفیسر نے مصنوعی شفقت سے اس کا گال تھپتھپایا اور کہا۔

"مُنّے! آنکھوں کا علاج کرا ڈالو"۔

اور اپنی اس بات سے وہ اتنا محظوظ ہوا کہ دیر تک ہنستا رہا اور ہنستا ہوا ہی رخصت ہوا۔

اس کے بعد سے وہ اسی کھوج میں رہا کہ کس کی آنکھ کہاں لگی ہے گو ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تو نہ تھی ۔تاہم پشت پر آنکھ والے بھی نظر آجاتے تھے۔

ایک بہت بڑا لیڈر ایک عظیم الشان جلسے میں اپنے زورِ بیان سے لاکھوں اعصاب میں زیر و بم پیدا کر رہا تھا ۔مہمانِ خصوصی ایک بہت بڑا مل اونر تھا ۔سامنے کرسیوں پر ملک کی دیگر مقتدر سیاسی شخصیات تھیں۔ مگر ان کی پشت پر لگی آنکھوں میں خفیہ مذاکرات بھی ہو رہے تھے وہ سخت خوفزدہ رہنے لگا کہ میری آنکھیں بھی پشت پر منتقل نہ ہو جائیں ۔چنانچہ ہر وقت سر ٹٹولنے کی عادت پڑ گئی تھی اور پھر خدا کا شکر ادا کرتا کہ ابھی تک وہ سامنے والی آنکھوں سے ہی دیکھ رہا ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اس کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا کیونکہ پشت پر آنکھوں والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا رکشا والا ٹریفک میں بڑی مہارت سے رکشا نکالے جا رہا تھا لیکن آنکھیں پشت پر تھیں سینما ہال میں فلم بینوں کی اکثریت پشت پر آنکھیں لیے بیٹھی تھی ۔سپاہی چالان کر رہا تھا مگر آنکھیں پشت پر ہی تھیں ۔یونیورسٹی میں طلبا کا جمِ غفیر دیکھا مگر آنکھیں ان کی بھی پشت پر ہی نظر آئیں ۔سوچتا ہمارے اخبارات کو کیا ہو گیا ہے ۔انتڑیوں کی بیماری کی خبریں تو چھاپ

رہے ہیں لیکن آنکھوں کی اس پراسرار بیماری کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ یہ خاموشی کی سازش ہے یا آنکھوں پر معدہ کو فوقیت حاصل ہو چکی ہے ؟

ایک رات اس پریشانی میں نیند نہ آئی اس نے اوندھی لیٹی بیوی کی چٹیا پکڑ کر اٹھائی تو اس کی آنکھیں بھی پشت پر نظر آئیں ۔ دہشت زدہ ہو کر کمرہ سے نکل بھاگا۔

صبح اٹھ کر بیوی بولی" تمہاری آنکھیں خراب ہو رہی ہیں "۔

" کیوں ؟"

" بس ! مجھے محسوس ہو رہا ہے ۔ جیسے تمہاری آنکھوں میں کچھ خرابی ہو"۔

" خرابی اس لیے کہ یہ پشت پر نہیں ؟"

" کیا کہہ رہے ہو"۔ وہ حیرت سے بولی ۔

" ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں " مگر اسے معلوم تھا کہ اسے کچھ محسوس نہ ہوگا ۔ جب اسے کچھ محسوس نہ ہوگا تو پھر وہ کیسے ٹھیک کہہ رہا ہے ۔

وہ کھڑی اسے گھور رہی تھی " اگر یہ تمہارا کوئی پرائیویٹ مذاق ہے تو میں اس کا مطلب نہیں سمجھ سکی "۔

" کچھ نہیں ! کچھ نہیں !" وہ پیچھا چھڑانے کو بولا ۔

" تو پھر چلتے ہو؟"

" کہاں ؟"

" ڈاکٹر کے پاس ۔۔ اور کہاں ؟"

" مگر ۔۔۔۔"

" جان ! تمہیں احساس نہیں مگر تمہاری آنکھیں واقعی خراب ہیں "۔

وہ اسے حقیقتِ حال سے آگاہ کرنا چاہتا تھا مگر یہ بھی جانتا تھا کہ پیشانی کی آنکھوں کے درمیان حقیقت کا مفہوم بدل جاتا ہے ۔ لہٰذا بے کار کی بحث سے بچنے کے لیے بیوی کا

کہا مان لیا اور سوچا ہو سکتا ہے میری ہی آنکھیں خراب ہوں جو مجھے سب کی پشت پر آنکھیں نظر آتی ہیں لیکن جب سپیشلسٹ کی آنکھیں بھی پشت پر نظر آئیں تو بھاگا ہراساں ہو کر۔
شہر میں اکثریت اب پشت پر آنکھوں والوں کی تھی اور یہ یا اس ایسے چند اور غریب الوطن لگتے تھے۔

اور اس دن تو انتہا ہو گئی اس کے رشتہ دار کے بیٹا ہوا تھا یہ سب مبارک باد دینے گئے۔ بڑا پیارا بچہ تھا۔ گول مٹول سا، موٹے موٹے اور پولے پولے گال اور سر پر سنہری بالوں کا تاج! پہلا شاک تو اسے یہ لگا کہ گھر کے تمام افراد کی آنکھیں پشت پر تھیں لیکن اس وقت تو گویا ہائی وولٹ کا جھٹکا لگا جب اس نے بچہ کو گود میں لیا تو پشت در ننھی منی معصوم آنکھیں پائیں۔
شہر میں اب ہر شخص کی آنکھیں پشت پر جا پہنچی تھیں۔ بیوی کے بعد اولاد کی آنکھیں بھی پشت پر دیکھیں تو تنہائی کے عذاب کا احساس ہوا۔ سڑک پر جاتا تو پشت پر لگی آنکھوں کے ہجوم میں خود کو گم شدہ بچہ کی طرح محسوس کرتا۔ تمام زندگی کا نظام پشت کی آنکھوں پر چل رہا تھا ایک وہی تھا جو اپنی آنکھوں کے عذاب میں مبتلا تھا۔

ایک دن کمرہ بند کر کے رو دیا، خدایا! اگر یہ کوئی نائٹ میئر ہے تو اب اسے ختم کر دے اور مجھے دیکھنے کے اس عذاب سے جھٹکارا دلا اگر میں مر چکا ہوں اور یہ جہنم ہے تو مجھے آنکھوں کے اس جہنم سے نکال کر آگ والے جہنم میں ڈال دے۔ میں آنکھوں والا ہو کر اندھوں سے بدتر ہوں۔ خدایا! میری آنکھیں چھین لے، مجھے اندھا کر دے۔ مجھے اپنی ان بے معنی آنکھوں کے عذاب سے نجات دلا، تب اس کی آنکھوں سے ساون بھادوں برسے یوں رو کر اور آنکھوں کو کسی مصرف میں لا کر اسے قدرے سکون کا احساس ہوا۔

وہ آزردہ سا سر جھکائے بیٹھا تھا کہ میز پر اسے مکھی نظر آئی۔ اس نے پہلی مرتبہ گندگی کی اس پوٹ کو رشک سے دیکھا، یقیناً مکھی انسان سے افضل ہے کہ ایک آنکھ میں کئی آنکھیں رکھتی ہے

"پیرِ تسمہ پا"

جب منیر شامی نے اپنی مطلوبہ کو حاصل کر لیا تو اس کی شادی کی سب سے زیادہ خوشی حاتم طائی کو ہوئی۔ ایمان کی بات ہے کہ وہ ان مسلسل مہمات سے سخت تھک چکا تھا۔ ہر چند کہ طلسمات کی تسخیر، نامعلوم کو معلوم کرنا اور ہر سوال کا درست جواب لاکر شہزادی کی آنکھوں میں حیرت اور تعریف کی چمک دیکھنا ان میں سہ آتشہ شراب کی سرشاری تھی۔ اس لیے جب آخری سوال کے جواب میں مرغی کے انڈے کے برابر موتی شہزادی کو پیش کیا اور وہ اس کی ہمت اور جرأت پر آفرین اور مرحبا کہتی ہوئی سرِ دقد ہو کر تسلیم بجالائی اور کہا:

"اے حاتم میں اب تیری ہو چکی تو جو چاہے مجھ سے سلوک کر" تو اس لمحہ میں کہ شہزادی خود سپردگی کی زندہ تصویر بنی کھڑی تھی اور اس کی آنکھوں میں عجیب دمک تھی۔ تو اس ایک لمحہ حاتم کے جی میں آئی کہ شہزادی کو اسی وقت قبول کر لے، اس کو عقد میں لائے اور اس کے عالیشان قصر میں دلجمعی سے باقی عمر گذار دے۔ مگر حاتم قول کا دھنی تھا۔ جان جائے بچن نہ جائے۔ اس نے تمام زندگی یہی مسلک رکھا تھا اب ایک عورت کی خاطر عمر بھر کی نیک کمائی کیسے گنوا دے، یقیناً یہ سودا مہنگا تھا۔ اس میں سراسر خسارہ حاتم کے لیے تھا۔

اس نے خندہ پیشانی سے منیر شامی کے عقد کی تقریبات میں شرکت کی۔ دونوں کو دعائیں دیں اور ایک دن رختِ سفر باندھ کر ان دونوں سے اجازت کا طلب گار ہوا۔

اگرچہ مہمات سر کرنے کے سلسلہ میں مسلسل دشت گردی اور صحرا نوردی کے باعث وہ اب خاصہ عمر رسیدہ ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود اس کی نگاہ کی تیزی کا یہ عالم تھا کہ سبز پتوں میں چھپے طوطے

کو دیکھ لیتا، جن ہاتھوں نے گھوڑے کی باگ تھام رکھی تھی ان میں رعشہ نہ تھا۔ اس کے ذہن کی تیزی اور کمر کی مضبوطی میں کمی نہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود اب وہ خود کو بے حد تھکا ہوا محسوس کرتا ۔ یہ پہلا موقع تھا کہ سستی اس پر غالب آ رہی تھی جو حاتم اپنے گھوڑے سے زیادہ چاک و چوبند رہتا تھا اور بالخصوص کسی مہم کی تسخیر کے بعد تو گویا وہ خود میں نئی زندگی محسوس کرتا، اس حد تک کہ رگوں میں دوڑتے خون کی سنسناہٹ سن سکتا تھا۔ خلقِ خدا کے ساتھ بھلائی کرنے کے احساس سے ہی وہ خود میں نئی امنگ پاتا تھا اور درحقیقت یہ امنگ اور اس سے جنم لینے والا یہ احساس کہ میں فانی انسان اپنی بے لوث خدمت سے قرطاس روزگار پر سخاوت، نیکی اور احسان کی نئی داستان رقم کر رہا ہوں۔ اس سے نہ صرف یہ کہ متعدد مہمیں سر کرا چکے تھے بلکہ ہر مشکل سفر اور جان لیوا مشکلات کے باوجود اس میں خدمتِ خلق کے جذبہ کو موجزن بھی رکھتے تھے۔ اس لیے اس کے بڑھاپے پر نوجوانوں کو رشک آتا تھا۔

مگر اب تو یوں محسوس ہو رہا تھا۔ گویا رگوں کا خون پانی بن گیا ہو، بازو بے جان ہوں اور جیسے آنکھوں کو نیند نے غبار بن کر دھندلا کر دیا ہو۔ وہ کہ گھوڑے سے بھی زیادہ پھرتیلا تھا۔ اب گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر گھوڑے کی ٹاپوں کی تال پر جیسے اونگھ جاتا۔ پہلے وہ چلتا جاتا، منزلیں مارتا جاتا اور سفر میں اس کے لیے قیام سے زیادہ راحت تھی مگر اب درختوں کے ڈھلتے سائے گویا رسیاں بن کر اسے جکڑنے لگتے جس کے نتیجے میں اس کا جی مچل اٹھتا کہ وہ بھی کسی تناور کی جڑمیں اس کے سائے کی مانند سکڑ کر سو جائے۔ صبح اٹھنا بھی قیامت بنتا جا رہا تھا وہ کہ پرندوں سے پہلے بیدار ہو کر ان کی بولی سنتا تھا۔ اب کئی مرتبہ دن چڑھے تک سوتا رہتا۔

بے پایاں اور بے امان تھکن — جو پھیلتی دھند کی طرح اسے ملفوف کر رہی تھی، وہ اس تھکن کے مقابلہ میں خود کو بے بس پاتا تھا۔ وہ حاتم کہ بڑے سے بڑے جن بھوت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی جرأت رکھتا تھا۔ وہ حاتم جس نے خوفناک عفریتوں کے جبڑے چیر دیئے تھے اور وہ حاتم جس نے سانپوں جیسے لہریاتے بالوں سے پکڑ کر چھپلی پایوں کو ہلاک کیا تھا۔

وہ حاتم اپنے وجود کے بھوت سے رفتہ رفتہ عاجز آتا جا رہا تھا۔ وہ خارج کے طلسمات اور جادو کے قلعوں کو تسخیر کر سکتا تھا۔ مگر اندر کی اس تھکن نے تو اس کی خواہش، ارادہ اور انا کو کسی طلسمی فصیل کے حصار میں مقید کر دیا تھا۔ اور پھر اس کی زندگی کا پہلا دن ایسا آیا جب وہ سارا دن درختوں کی چھاؤں میں ہری ہری دوب پر لیٹا ٹھنڈی ہوا کی لوریاں سنتا رہا۔ رات بھر کی نیند اس کی تھکن اتارنے میں ناکام رہی تھی۔ چنانچہ صبح خاصی تاخیر سے اٹھنے کے باوجود بھی وہ لیٹا جمائیاں لیتا رہا۔ ، یا منظہر العجائب! یہ کیا کرشمہ ہے۔ کہ میں اپنے وجود سے ہارتا جا رہا ہوں۔ بڑی کاہلی سے اٹھ کر اس نے کچھ پھل توڑ کر کھائے اور ندی کا رُخ کیا۔

ندی کا شفاف پانی دعوتِ غسل دے رہا تھا۔ مگر پہلی مرتبہ اسے پانی کی خنکی سے خوف آیا۔ کھلی ہوا میں ٹھنڈے پانی سے نہا کر کہیں بینڈا تپ نہ جائے۔ اس نے جھرجھری لیتے ہوئے سوچا۔ جب پانی پینے جھکا تو ندی میں اپنا عکس دیکھ کر ٹھٹکا۔ یہ بوڑھا کون ہے؟

اس نے ایک اور جھرجھری لی اور سوچا تو کیا میں اتنا ناتواں ہو گیا ہوں کہ ایک ہی زقند میں بڑھاپے نے مجھے آ لیا، اس نے بے یقینی سے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ ابھی آنکھوں کے گرد کسی پرندے کے پنجے کی مانند جھریوں نے قدم نہ جمایا تھا۔ تو پھر لہروں سے جھانکنے والا بوڑھا کون ہے؟ یا منظہر العجائب! یہ کیسا طلسم ہے؟ کیا میں کسی پلید روح کے زیر اثر آ چکا ہوں؟ -

گھوڑے نے ہنہنا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ حاتم کو ایک دھچکہ لگا زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے گھوڑے کو کھلائے بغیر خود پیٹ بھر لیا تھا۔ یہ بھول کیوں؟ کیا میری یادداشت کسی اور کے قبضے میں جا چکی ہے۔ یہ گھوڑا جنم کا ساتھی تھا۔ جانور نہیں بلکہ دوست تھا۔ ان دونوں نے مل کر لاتعداد مہمیں سر کی تھیں تو آج اسے کیسے بھول گیا۔ یقیناً اس کے جسم میں کسی بدروح نے بسیرا لے لیا ہے۔

اس نے گھوڑے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر گویا معذرت کا اظہار کیا۔ مگر گھوڑا خوشی سے نہ

ہنہنایا بلکہ دوسری طرف منہ کئے کھڑا رہا۔ شاید وہ آزردہ تھا یا غصہ میں ہوگا پہلی مرتبہ یہ گھوڑا اسے ایسا جانور لگا وہ جس کی بولی سمجھنے سے قاصر تھا۔

اس نے گھوڑے کی رسی کھول دی — اور وہ پلٹ کر نہ آیا۔

حاتم کو تعجب ہو رہا تھا کہ یوں گھوڑے کے چلے جانے سے وہ خفیہ طور پر خوش تھا۔ اب تو سفر جاری رکھنے کا کوئی بہانہ بھی نہ رہا تھا۔ نہ کوئی مصیبت میں تھا۔ نہ کوئی مہم دربیش تھی اور نہ ہی اس کا رخشِ صبا رفتار— تو پھر سفر کیوں ؟

اس مقام پر پھیلاؤ درختوں کی کمی نہ تھی۔ ندی کا پانی تھا اور شاید نزدیک میں کوئی بستی بھی ہو، تو کیوں نہ ایک کٹیا بناکر آرام کرے۔ خوب سو کر جنم جنم کی تھکن دور کرلے۔ دوسروں کی خدمت میں جی جان گنوائے اب ذرا اپنے جسم کے احکام بھی تو بجا لاؤں اور جسم کا پہلا حکم تھا، آرام کرو، جسم ہلائے بغیر حالت سکون میں رہو۔

پھر اسے منیر شامی یاد آیا — یقیناً وہ زیرک شہزادہ تھا کہ جان جوکھوں میں ڈالے بغیر گوہرِ مقصود حاصل کر لیا۔ اور مجھے کیا ملا ؟ — اس نے ایک طویل جمائی لیتے ہوئے سوچا۔ تھکن؟ تو کیا مہم بازی کا انعام محض تھکن ہے اور نیکی کر دریا میں ڈالنے والے یوں تھک کر کٹے درخت کی مانند ڈھے جاتے ہیں ۔؟

ادھر جمائیاں تھیں کہ چیلوں کی مانند جھپٹے مار رہی تھیں۔ حاتم نے خود کو ان چیلوں سے بچانے کی سعی نہ کی بلکہ ایک بے جان بچھڑے کی مانند خود کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

ایک دن ایک مرد گذرا تو حاتم نے نقاہت بھری آواز میں پکارا

" اے بندہ خدا " مگر وہ کوئی حاتم تھوڑا تھا جو ترت رکتا۔ اور اسکی احتیاج رفع کرنے کی سعی کرتا اسے اپنے کام کی جلدی تھی۔ چنانچہ اس نے تیز قدم روکے بغیر اسکی طرف گردن گھما کر دیکھا اور پھر آگے نکل گیا۔ اسی طرح کئی لوگ آئے اور حاتم نے ان سب کو پکارا۔ مگر کسی نے لبیک نہ کہا۔ تب ایک پُر شباب نوجوان کا گذر ہوا جس کے تیور دیکھ کر حاتم کو اپنی جوانی یاد آئی۔ اس نے

صدا لگائی "اے جانے والے"

"کیا بات ہے بابا" نوجوان نے قریب آکر ادب سے پوچھا۔

"بیٹا ذرا ندی پار کرا دو۔"

"کیا آپ کو تیرنا نہیں آتا؟"

"آتا تھا بیٹے کبھی بہت کچھ آتا تھا مگر اب میں بے بس ہوں۔ تم برائے خدا میری مدد کرو اور دوسرے کنارے پر اتار دو۔"

نوجوان نے حاتم کو اپنے پر قوت بازوؤں سے اٹھا کر اپنے مضبوط کندھوں پر بٹھا لیا اور چلا ڈبکی!

حاتم نے اطمینان کی ایک طویل سانس لی اور اپنے جسم کو نوجوان کے جسم کے ہچکولوں کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا۔ اسے بہت مزا آ رہا تھا۔ عافیت کا احساس ہو رہا تھا۔

اچانک ایک موڑ پر اس کی نظریں اپنے گمشدہ گھوڑے سے چار ہوئیں۔ جس نے پہلے تو اسے تعجب سے دیکھا اور پھر نفرت سے منہ موڑ لیا۔ مگر حاتم نے پروا نہ کی کہ وہ تختِ رواں پر بیٹھا گویا چوتھے آسمان کی جانب محوِ پرواز تھا۔

"بچہ جمورا"

"میں کون؟"

"عامل"

"تم کون؟"

"معمول"

"جو پوچھے گا بتلائے گا؟"

"بتلائے گا"

"سچ سچ بتلائے گا؟"

"سچ سچ بتلائے گا!"

"جھوٹ تو نہیں بولے گا؟"

"نہیں بولے گا"

"اِدھر آؤ"

"آگیا!"

"گھوم جاؤ"

"گھوم گیا"

"کیا دیکھا؟"

"سب کچھ دیکھا"

"کیسا دیکھا؟"

"خوب دیکھا"

"ان صاحب کی جیب میں کیا ہے؟"

"کچھ نہیں"

"ان صاحب کی جیب میں کیا ہے؟"

"نوٹ ہی نوٹ"

"یہ نوٹ کہاں سے آئے؟"

"کسی اور کی جیب سے۔"

"گھوم جا"

"گھوم گیا"

"ان صاحب کے دل میں جھانکو"

"جھانک لیا"

"کیا پایا؟"

"کھوٹ"

"ان صاحب کے دل میں کیا ہے"؟

"دغا اور بغض"

"یہ صاحب کہاں جا رہے ہیں؟"

"گھر"

"کس کے؟"

"اپنے دوست کے"

"دوست کدھر ہے؟"

"دو ہی ہیں"

"گھوم جا"

"گھوم گیا"

"ادھر آ جا"

"آ گیا"

"یہ بھولی صورت والا کیا کرتا ہے؟"

"پاکٹ کاٹتا ہے"

"اور یہ صاحب؟"

یہ بھی"

"اور یہ بھی ——؟"

"یہ رات کو چوری کرتا ہے"

"تم کون؟"

"معمول"

"میں کون"

"عامل"

"جو دیکھے گا بتلائے گا؟"

"بتلائے گا"

"کیا دیکھا؟"

"گلیوں میں گندگی"

"اور؟"

"ان پر ننگے"

"اور؟"

"کتّے"

"بچے کیا کرتے ہیں؟"

"کتّوں کو کھانے نہیں دیتے۔"

"اور کیا دیکھا؟"

"گھر"

"کیسا گھر؟"

"گندا گھر"

"اور؟"

"گندی عورت"

"کیسے؟"

"خاوند جو اسے پیٹ رہا ہے"

"گھوم جا"

"گھوم گیا"

"کیا دیکھا؟"

"لاش"

"کس کی؟"

"پتہ نہیں۔"

"کیوں؟"

"کھائی جا چکی ہے۔"

"گھوم جا"

" گھوم گیا "

" اور آگے جاؤ "

" چلا گیا "

" کیا دیکھا ؟"

" بچہ "

" بچہ کھیل رہا ہے ؟"

" نہیں "

" بچہ شرارت کر رہا ہے ؟"

" نہیں "

" بچہ پڑھ رہا ہے ؟"

" نہیں "

" بچہ ہنس رہا ہے ؟"

" نہیں "

" تو بچہ کیا کر رہا ہے ؟"

" بے ہوش ہے "

" کیوں ؟"

" بوری میں جو بند ہے "

" گھوم جا "

" گھوم گیا "

" کیا دیکھا ؟"

" مرد "

"کیا کرتا ہے؟"

"جاتا ہے۔"

"کدھر؟"

"دوسرے مرد کی طرف"

"کیوں؟"

"دل میں چاقو اتارنے"

"گھوم جا"

"گھوم گیا"

"کیا دیکھا؟"

"خاوند"

"کیا کرتا؟"

"بیوی سے دغا"

"اور کیا دیکھا؟"

"چور"

"چوری کرتا؟"

"نہیں"

"پھر؟"

"چوری کیے بغیر پکڑا جاتا"

"تم کون؟"

"معمول"

"جو پوچھے گا بتلائے گا؟"

"بتلائے گا"

"گھوم جا"

"گھوم گیا"

"اور گھوم جا"

"اور گھوم گیا"

"اور گھوم جا"

"اور گھوم گیا"

"جو دیکھے گا بتلائے گا"

"بتلائے گا"

"کیا دیکھا؟"

"میدان"

"اور کیا دیکھا؟"

"چمکیلی دھوپ"

"اور کیا دیکھا؟"

"خوبصورت پھول"

"اور کیا دیکھا؟"

"پھول جیسے بچے"

"کیا کرتے ہیں؟"

"پڑھتے"

"اور ؟"

"کھیلتے"

" اور ؟"

" چین کی نیند سوتے "

" اور کیا دیکھا ؟"

" ایک مرد "

" کیا کرتا ؟"

" اندھے کو راستہ دکھاتا "

" اور کیا دیکھا ؟"

" دو دوست "

" چاقو مارتا ؟"

" نہیں "

" پھر ؟"

" گلے ملتا "

" گھوم جا "

" گھوم گیا "

" کیا کوئی چور دیکھا ؟"

" دیکھا "

" کیا کرتا ؟"

" توبہ "

" اور کیا دیکھا ؟"

" ایک مرد "

" اس کے دل میں جھانکا ؟"

"جھانکا"

"کیا ہے وہاں؟"

"شرافت اور محبت"

"کوئی عورت دیکھا؟"

"دیکھا"

"کیسا ہے؟"

"عزت دار"

"کیسے؟"

"کسی کو بُری آنکھ سے نہیں دیکھتا"

"اور مرد لوگ؟"

"وہ کسی کو بُری آنکھ سے نہیں دیکھتا"

"گھوم جا"

"گھوم گیا"

"کیا دیکھا؟"

"ایک ملازم"

"کیا کرتا؟"

"محنت سے کام کرتا"

"اور کیا دیکھا؟"

"تاجر"

"کیا کرتا؟"

"جائز نفع لیتا"

"اور کیا دیکھا؟"

"نگران"

"کیا کرتا ہے؟"

"ذمہ داری سے نگرانی کرتا۔"

"اور کیا دیکھا؟"

"حاکم"

"کیا کرتا؟"

"رعایا سے محبت کرتا۔"

"تم کون؟"

"۔۔۔۔۔"

"میں کون ہو؟"

"۔۔۔۔۔"

"گھوم جا"

"۔۔۔۔۔"

"اِدھر آجا"

"۔۔۔۔۔"

تخلیق

تمام طلسمی قوتیں بروئے کار لاتے ہوئے اپنی تمام مخلوق جمع کرتا ہوں۔ ان میں سے کچھ میرے لیے جگر گوشوں ایسے ہیں تو بعض سے محض شناسائی ہے۔ کچھ کے نقوش واضح ہیں، کچھ کے ردشن، کچھ کے دھندلے، جب کہ بعض ابھی تک ہیولوں کی صورت میں ہیں۔ میرے ذہن سے پروجیکٹر کی طرح ___ مگر ایکس ریز سے بھی زیادہ تیز لہریں نکلتی ہیں اور اس تمام گریز پا مخلوق کو جکڑ لیتی ہیں۔ میری قوت، قوتِ ارادی کے روپ میں ان کے گرد اس سانپ کا حصار ثابت ہوتی ہے جس کی دم اس کے منہ میں ہو۔

"خاموش!" ___ میں گرج کر کہتا ہوں۔

سب شور مچا رہے ہیں۔ ہاتھ نچا رہے ہیں، آوازیں نکال رہے ہیں۔

"خاموش!" ___ میں ایک مرتبہ پھر چلاتا ہوں۔ مگر اب بھی ان پہ کوئی اثر نہیں ہوتا۔

میں دھمکی دیتا ہوں ___ "اگر تم خاموش نہ ہوئے تو سب کی P.T. شروع کر دوں گا۔"

اس دھمکی کا کچھ اثر ہوتا ہے۔ میں اور زور دے کر کہتا ہوں ___ "میں سب کو قد کے لحاظ سے ۳ قطاروں میں تقسیم کر دوں گا۔"

سب خاموش ہیں، مجھے خوف سے دیکھ رہے ہیں۔ لیکن ان خوف زدہ آنکھوں کے پیچھے سلگتی بغاوت کو بھی محسوس کر سکتا ہوں۔ ان کے ہونٹ بھنچے ہیں مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کھلنے پر یہ کڑوی شکایات اگلیں گے۔ ہر طرح کی شکایات۔ مثلاً کسی کو خود میں خلا کا احساس ہوتا

ہے تو کوئی خلا میں خود کو محسوس کرتا ہے۔ اسی لیے تو میں انھیں نظم وضبط کا۔ کسی زنگر ورٹ کی طرح ۔۔۔ عادی بنانا چاہتا ہوں۔ لیکن مجھے یہ بھی احساس ہے کہ یہ میرے تمام ارادوں کو بھانپ لیتے ہیں۔

مکھیوں کی بھنبھناہٹ ایسا شور صورت پذیر ہوتا جا رہا ہے۔

"کیا بات ہے؟"

"ہمیں یہ سب ناپسند ہے۔"

"کیا ناپسند ہے؟"

"یہی۔"

"کیا یہی؟"

"ہم باہر آنا چاہتے ہیں!"

(عورت (۱) کی کرخت آواز سنائی دیتی ہے ۔۔۔ 'میں اپنے حسن کی نمائش چاہتی ہوں')

"تم اب بھی باہر ہو۔"

"نہیں، نہیں!!"

('میں ٹاپ لیس بکنی چاہتی ہوں' ۔۔۔ عورت (۲) کہتی ہے)

"تم ظالم ہو۔"

"تم نے ہمیں نیند میں رکھا ہے۔"

"تم نے قید کر رکھا ہے۔"

"تم نے ہمیں گلاس نرسری کے پھول بنا رکھا ہے۔"

('میں ڈیکوریشن پیس بننا چاہتی ہوں' ۔۔۔ عورت (۲) کہتی ہے)

('چُپ کتیا' ۔۔۔ عورت (۱) کی کرخت آواز میں غراہٹ ہے)

دونوں دانت کٹکٹا کر ایک دوسرے پر جھپٹتی ہیں۔ میں دو بیویوں والے خاوند ایسی بے بسی

سے چیختا ہوں ۔۔۔ "تم دونوں کیوں لڑتی ہو ۔۔؟"

دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلتا ہے ۔۔۔ "اس عورت کی نرگسیت ناقابل برداشت ہے ۔"

"تمہیں نرگسیت سے کیا لینا ؟"

"میری اپنی نرگسیت مجروح ہوتی ہے ۔" دونوں بیک زبان کہتی ہیں ۔

ایک باوقار شخصیت کی رعب دار آواز پس منظر کی موسیقی ایسے شور پر وقتی طور سے غالب آ جاتی ہے ۔۔۔ "خواتین وحضرات ! خاموش ! پلیز ۔۔ خاموش !!" ۔۔۔ سب اس کی طرف دیکھتے ہیں ۔ وہ اپنے قریب کھڑے ایک غبی کے کندھوں پر سوار ہو جاتا ہے اور یوں خطاب کرتا ہے ۔۔

"اس نے مجھے بنایا ۔۔ تسلیم ، اس نے مجھے اعلیٰ ترین ذہنی صلاحیتوں سے نوازا ۔۔ یہ تسلیم ، اس نے مجھے خوش رو اور خوش خلق بنایا ۔۔ یہ بھی تسلیم ، میں سراپا سپاس ہوں ، رہین منت ہوں ۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔" میں یہ جان چکا ہوں کہ "لیکن" ، ایک خطرناک موڑ ہے ، اس لیے میں فوراً چیختا ہوں ،

"یہ تم اس غریب کے کندھوں پر کیوں سوار ہو ؟"

"کس غریب کے ۔۔؟"

"غبی کے ؟"

"نہیں ۔۔ غبی تو میرا پاؤں ہے ۔"

"غلط ۔۔"

"بالکل درست ! ۔ ۔ ۔ ۔ یہ میرے وجود کا حصہ ہے ، میرے اُجالے کی تاریکی !!"

"اور تم ۔۔"

"اس کے لیے جہنم" ۔۔۔ عورت (۱) کی کرخت آواز سنائی دیتی ہے ۔ سب ایک دم بھسر بولنے لگتے ہیں ۔ عورت (۲) گرے ہوئے غبی کو اٹھا کر اپنے سینہ سے لگا لیتی ہے ۔ وہ ایک چھوٹا سا بچہ بن جاتا ہے ۔ بچہ بلک رہا ہے ، بچہ رو رو کر دودھ مانگ رہا ہے ، بچہ

سسک رہا ہے ۔ وہ چیخ کر میری طرف مڑتی ہے ---

" مجھے دودھ دو !"

" دودھ نہیں ہے ۔"

" کیوں نہیں ہے ؟ "

بچہ آگے بڑھ کر عورت (۱) کا دامن پکڑ لیتا ہے ۔ وہ روئے جا رہا ہے ۔ مجھے دودھ دو ، مجھے دودھ دو ۔ بچہ کی آنکھیں عورت (۱) سے کہتی ہیں ۔

" تمہارے لیے دودھ نہیں ۔"

" کیوں ؟ کیوں ؟" --- بچہ کی آنکھیں سوال سے ابلی پڑتی ہیں ۔

" تم میرے نہیں ہو ۔"

" کیوں ؟ کیوں ؟" --- بچہ کا سانس سوال سے پھولا جاتا ہے ۔

" تم ..... تم ....." وہ ہانپ جاتی ہے ۔

--- بچہ گر کر دم توڑ دیتا ہے ۔

عورت (۲) پھر چیختی ہے --- " مجھے دودھ دو !"

" دودھ نہیں ہے ۔"

" کیوں نہیں ہے ؟"

" اس لیے کہ تم مکمل عورت نہیں ہو ۔"

" کیا --- ؟؟؟"

" تمہارے پستان نہیں ہیں ۔"

" تو یہ کیا ہے --- ؟"

وہ انگیا میں ہاتھ ڈال کر ربڑ کی دو گیندیں نکالتی ہے ، معمولی دباؤ سے ان کی ہوا خارج ہو جاتی ہے ۔ وہ بے جان پھیپھڑوں جیسی ربڑ زمین پر پٹک کر میری طرف دیکھتی ہے ۔ اس کا منہ کھلتا

ہے مگر اس سے چیخ برآمد نہیں ہوتی۔ آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔ اب وہ ایک سنگی مجسمہ ہے۔ عورت (۲) کی چیخ گویا عورت (۱) کی ہنسی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ وحشیانہ ہنسی! ہسٹریکل ہنسی!!

"تم کیوں ہنستی ہو؟" — پوچھنے والے حیرت زدہ ہیں۔

"تم کیوں ہنستی ہو؟؟" — پوچھنے والے خوف زدہ ہیں۔

"تم کیوں ہنستی ہو؟؟؟" — پوچھنے والے غضب ناک ہیں۔

عورت (۱) بمشکل ہنسی روکتی ہے — "وہ ..... وہ ..... اور وہ ٹاپ لیس بکنی پہننا چاہتی تھی" — ہنسی پھر فوارہ کی طرح چھوٹتی ہے — "عورت تیرا نام نرگسیت ہے"

اس کی ہنسی میں سبھی شریک ہیں۔ ہنستے ہنستے بے دم ہوئے جاتے ہیں۔ پھر اچانک ہی ہنسی سیلاب کے پانیوں کی طرح اتر جاتی ہے۔ اب وہ خاموش ہیں، پریشان ہیں، سوچ میں گم! — پھر جیسے ان کی سوچ اپنی توانائی بحال کر لیتی ہے اور اب وہ دو کھوئی کھوئی آنکھوں اور پریشان بالوں کا روپ دھار لیتی ہے۔ وہ بھیڑ کے آخری کنارے سے یوں سامنے آتا ہے جیسے تاریک بادل سے کرن نکلے۔ وہ خاموش عورت (۲) کے مجسمہ کو تک رہا ہے۔ پھر وہ جھک کر عورت (۲) کے سنگی پاؤں کو بوسہ دیتا ہے۔ مجمع سحر زدہ ہے (صرف میں اس کے ارادوں سے واقف ہوں) وہ عورت (۱) کی طرف مڑ کر کہتا ہے —

"تمہیں ہنسنا نہ چاہیئے تھا۔"

وہ جواب دینے کی بجائے عورت (۲) کی پتھریلی آنکھوں میں نفرت سے جھانک رہی ہے۔

"اب تم روؤ گی!" — وہ پیغمبر کی طرح گویا پیشین گوئی کر رہا ہے۔

"مجھے دنیا کی کوئی طاقت رونے پر مجبور نہیں کر سکتی۔"

وہ خاموش ہے، وہ میری طرف دیکھ رہا ہے۔ سب کی نظریں میری دو آنکھوں میں سوئیوں کی طرح چبھتی جا رہی ہیں۔ عورت (۱) ہونہہ کہہ کر منہ پھیر لیتی ہے۔

"تم رونے کو کہہ رہے ہو! میں تو ہنسوں گی — میں ہنس رہی ہوں۔"

وہ ہنسنا شروع کر دیتی ہے۔ ہنستی جاتی ہے، مسلسل، بے تکان ــ حتیٰ کہ ہنستے، ہنستے سانس اکھڑنے لگتی ہے اور آنکھوں سے پانی بہہ نکلتا ہے۔ وہ جواب تک نہایت اطمینان سے کھڑا تھا اب آگے بڑھ کر اس کی آنکھوں کے پانی میں رنگ حل کر کے مجسمہ بنی عورت (۲) کی شبیہہ بنانے لگتا ہے۔

سب غور سے تک رہے ہیں۔ عورت (۱) مُردہ بچہ اور مجسمہ بنی عورت (۲) بھی ــ سب غور سے تک رہے ہیں! ایک لمحہ کو تو میں بھی خود فراموشی سے بے جان خطوط میں حیات آمیز رنگوں کا امتزاج دیکھنے میں محو ہو جاتا ہوں۔

"نہیں، نہیں!!" ــ مجمع چلاتا ہے۔

"ہرگز نہیں!" ــ عورت (۱) چلاتی ہے۔

"یہ غلط بنا رہا ہے۔"

"اس کی چھاتیاں نہ تھیں۔"

"وہ اتنی خوبصورت نہ تھی۔"

"کلائیوں میں کنول کے ڈنٹھلوں ایسی لچک نہ تھی۔"

"کمر میں سُر کا لوچ نہ تھا۔"

"انگ میں دیپ سی جوت نہ تھی۔"

"لبوں پہ ملکوتی تبسم نہ تھا۔"

وہ بہرہ بنا خاموشی سے اپنے کام میں مصروف ہے۔ اچانک اسے احساس ہوتا ہے کہ سرخ رنگ ختم ہو چکا ہے۔ وہ دل میں برش ڈبوتا ہے اور ہونٹوں کی سُرخی دمک اٹھتی ہے۔ دوبارہ برش دل میں ڈبو کر چھاتیوں کے سرے گلابی بنا دیتا ہے۔

"یہ صحیح نہیں!"

"یہ غلط ہے!"

"یہ درست نہیں"!

عورت (ا) چیختی ہے —— "میری آنکھوں کا پانی ضائع گیا۔"

تصویر اب مکمل ہے۔ اس کی برہنہ چھاتیوں کی سرخی جیسے دودھ کے بوجھ سے پھٹی پڑتی ہے وہ تھکا تھکا اور نڈھال ہے، مجمع اب غصہ سے بے قابو ہو چکا ہے، سب غراہٹ سے تصویر پر پل پڑتے ہیں اور کسی زندہ جسم کی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے برش کو دل میں چبھو کر خودکشی کر لیتا ہے۔

"تم ظالم ہو"!

"تم جابر ہو"!

"تم حاسد ہو"!

وہ سب مٹھیاں ہلا ہلا کر مجھے دھمکا رہے ہیں۔

"خاموش"! —— میں انہیں ڈانٹتا ہوں —— "میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں تو غیر جانبدار تماشائی تھا۔ وہ تم میں سے تھا۔ اس نے جو کچھ کیا تمہارے لیے، تم نے اسے مار ڈالا"۔

"نہیں"!

"ہاں! تم نے"!

"نہیں، نہیں!!"

"ہاں، ہاں! تم نے"!

عورت (ا) کہتی ہے "یہ ہماری سرشت ہے"۔

"تو میں کیا کروں"!

"تم ہمیں ٹھیک کرو"!

"تم مشین تو نہیں جس کے اسپیئر پارٹس منگوائے جاسکیں!"

"تم سب کچھ کر سکتے ہو۔"

"تو بولو کیا چاہتے ہو!"

سب ایک دم سے بولتے ہیں ۔"نہیں ایک ایک کر کے!"

سب سے پہلے عورت (۱) بولتی ہے ۔۔۔" میں جلی جا رہی ہوں۔ میں پھنک رہی ہوں۔ انجانے شعلے مجھے جلاتے رہتے ہیں۔"

"یہ آگ نہ بجھے گی۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ تم سنٹرلی ایئرکنڈیشنڈ ہو۔"

"کیا؟" ۔۔۔ اس کا منہ سوالیہ فقرہ کے نشان کی صورت میں کھلتا ہے، پر بند نہیں ہوتا۔

باقی سب پھر بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ مجمع میں سے ایک نوجوان آگے بڑھتا ہے، وہ التجا کر رہا ہے ۔۔" مجھے مکمل آسودگی چاہیئے۔"

"ایسا نہ ہوگا۔"

"کیوں، کیوں ۔۔۔ ؟؟"

"تم HYPER MOTALITY کے مریض ہو۔"

وہ ایک دم بوڑھا ہو کر زرد پتہ کی طرح فرش پر بکھر جاتا ہے۔

اب پھر سب بول رہے ہیں۔ میں دونوں ہاتھ اٹھا کر کہتا ہوں ۔۔۔ "خاموش!"

سب مجھے کینہ توز نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

"چلو لفٹ میں!"

"کیوں ــــ کیوں ــــ ؟" اب سب گھبرا رہے ہیں۔

"یہ تمہیں لفٹ رکنے پر معلوم ہوگا۔"

میں ان سب کو بھیڑوں کی طرح لفٹ میں ہانک دیتا ہوں۔ اس کے بعد دروازہ بند کرکے آخری منزل پر جانے کا بٹن دبا دیتا ہوں۔ میں ہنستے ہنستے بے دم ہوا جاتا ہوں ابھی چند لمحوں بعد بجلی نے فیل ہو جانا ہے۔

بے چہرہ لوگ

آنکھوں سے، چہروں اور دھڑوں سے لدی ہوئی بس میں ایک دھڑ پہ ٹکے چہرہ پہ لگی دو آنکھیں چونکیں، ٹانگوں کے جنگل میں گھری دو ٹانگوں میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ دھڑام سے سڑک پہ آ رہا۔

ریلوے کالونی میں شیڈ میں کھڑے مرمت طلب لاوارث ڈبوں کی طرح قطار میں لگے کوارٹروں کی تاریک دیواروں میں روشنی سلیٹیں جڑی ہیں۔ دیواروں کی اونچائی میں کوئی فرق نہیں۔

محکمہ ریل کے وزیر نے افتتاحی تقریب میں اعلان کیا تھا:

"حکومت نے ایک مشہور ماہر تعمیرات سے اس کالونی کے لیے جو نقشہ بنوایا اسے تمام ملک میں ایسی کالونیاں بنانے کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ کوارٹر ایک جیسے ہوں گے۔ سڑکیں زاویہ قائمہ پہ ایک دوسرے کو کاٹیں گی۔ گلیاں ایک دوسرے کے متوازی زاویہ قائمہ پہ ایک دوسرے کو کاٹیں گی ہر مکان میں دو کمرے، ایک برآمدہ، ایک صحن، ایک . . . ۔"

(تالیاں! تالیاں!!)

وہ سوچتا نہ جانے ان تین سو کوارٹروں میں اس ایسے کتنے کلرک ہیں۔ ان میں سے کتنوں کے بچے ہیں۔ کتنے بغیر بیویوں کے پل رہے ہیں اور کتنوں نے ایک سے زائد بیویاں رکھ چھوڑی ہیں۔ اس کی بیوی تو خیر سے ایک ہی تھی۔ بچے البتہ چار تھے۔ لڑکی لڑکا لڑکا لڑکی کوئی اس سے اچانک بچوں کا پوچھ بیٹھتا تو یوں محسوس ہوتا گویا کسی بحر کے رکن ہیں یا گردان کے صیغے! بچوں اور بیوی کے حصار سے کیسے باہر نکلے، چند ماہ پیشتر آپریشن ہوا تو رسولیوں کے ساتھ ساتھ بیوی کا رحم بھی نکال دیا گیا۔ بچے اوپر تلے کے ہیں۔ خوب لڑتے اور شور مچاتے ہیں۔ لیکن رات کا کھانا کھا کے سو جاتے ہیں۔

سونے سے پہلے وہ گھر کا کام کرتی وہ دفتر کا اور پھر وہ دونوں مل کر!

"ارے بابو صاحب آج تو چھٹی تھی آپ کیوں چلے آئے!"

"بابا گھر دل نہ لگا۔"

چوکیدار دفتر کی طرح سال خوردہ تھا۔ کبھی وہ بھی نئی چابی ہوگا۔ مگر اب تو زنگ آلود تھا۔ وہ ہنسا تو دانتوں کی نامکمل قطار دیکھ کر سکون کا احساس ہوا۔

"اچھا تو گھر دل نہ لگا۔"

"ہاں بابا! کچھ سمجھ میں بھی نہ آیا کہ کیا کروں، پھر سوچا چلو ضروری لیٹرز ہی نکال آؤں۔"

الماریوں کی قطاروں، خاکی فائلوں اور ڈرافٹ پر ٹائپ رائٹر کی متوازی لکیریں دیکھیں تو سکھ پایا!

الماریوں کی قطار کی طرح دروازوں کی فہرست سے وہ گزرتا گیا۔ بعد میں سڑک کو ایک اور سیدھی سڑک کاٹے گی، پھر ایک اور سیدھی سڑک، اور پھر ایک اور سیدھی سڑک کاٹے گی۔

"ہر بلاک میں دس دس کوارٹر ہوں گے۔ دس آمنے سامنے اور دس کی پشت دس سے ملے گی۔ ان پر ایک جیسا روغن کیا جائے گا اور ایک جیسا....."

"آج جلد نہیں آ گئے۔"

"ہاں! بس جلدی مل گئی تھی۔"

"خوب بھیڑ ہوگی۔"

"ہاں! تھی تو۔"

وہ باورچی خانے کے ادھ کھلے دروازہ سے کھانا گرم کرتی نظر آ رہی تھی۔ کمال ہے! آج تک بیوی کو مکمل ہی نہ دیکھ پائے۔ کیونکہ چاند کی طرح وہ بھی کبھی پوری نہ دیکھی جا سکی۔ اس لیے وہ کبھی بھی وثوق سے یہ نہ جان پایا کہ اسے پڑوسی کی بیوی زیادہ اچھی لگنی چاہیئے یا پڑوسی کو اس کی!

اس نے دوسری تیسری مرتبہ تعجب سے دیکھا واقعی یہ اس کی بیوی کا بازو تھا۔ کمال ہے! میری بیوی اور خوب صورت بازو۔ بس کھچا کھچ بھری تھی۔ مرد بھی ٹھنسے تھے اور عورتیں بھی بھنسی تھیں۔

کالی، پیلی، سانولی، گوری بانہوں کی ٹہنیوں میں اسے گندمی بازو دمکتا نظر آیا۔ سرخ چوڑیاں تھیں اور سونے کا ایک کڑا! بس کے ہر جھٹکے کے ساتھ بازو تن جاتی مگر نیلی رگوں کا جال نہ ابھرتا۔ کمال ہے! میری بیوی کا یہ بازو تو واقعی خوب صورت ہے۔ آج تک کبھی اس کے کسی بازو کو غور سے دیکھنے کا موقع ہی نہ ملا کمال ہے! وہ اس بچہ کی طرح متعجب اور خوش تھا جس کی مٹھی کا پیسہ روپیہ ثابت ہو، حد ہو گئی! ایک رگ بھی تو نہیں ابھری! برتن اٹھانے جھکی تو اس کے بازو کو غور سے دیکھا۔ مگر اب کوئی خاص بات نظر نہ آسکی۔ کمال ہے! وہ کئی مرتبہ سوچ سوچ کر حیران ہو چکا تھا۔ بس میں بانہوں کی قطار میں بازو چمک سکتا ہے تو گھر میں اسی بازو کو کیا ہو جاتا ہے۔ کمال ہے! اپنی بیوی ہے، بلکہ کئی سالوں سے ہی بطور بیوی چلی آتی ہے، مگر آج تک وہ کبھی پوری دیکھی ہی نہ جا سکی۔ ایک ہی نگاہ میں وہ کیسے بیک وقت نظر آسکے گی؟ کیا پتہ وہ واقعی خوب ہی ہو اور کیا پتہ پڑوسی واقعی اس پر رشک کرتے ہوں۔ لیکن اب تو رحم نکلوا کر وہ آخری اسٹیشن بن چکی ہے اور کیا آخری اسٹیشن سے آگے ریل نہیں جا سکتی؟ اگر جائے تو کیا ہو؟

"ایکسیڈنٹ! نہیں؟!"

"ہاں! ہاں!!"

"کیا کہہ رہی ہو۔"

"واقعی!"

"مجھے تو پتہ ہی نہیں۔"

"کئی ڈبے دوسرے ڈبوں میں پھنس گئے اور ایک انجن تو بالکل تباہ ہو گیا۔"

"کچھ مرے بھی؟"

"ہاں! آٹھ دس لاشیں تو شناخت بھی ہو چکیں۔"

"کمال ہے! مجھے تو پتہ ہی نہ چلا۔"

"آج دوپہر کی بات ہے نا! کل اخباروں میں خبریں آئیں گی۔"

گنگناتے سنا تو کان کھڑے ہوئے، اس نے تو کبھی غسل خانہ میں بھی گنگنانے کی جرأت نہ کی اور اس نے اب تک اسے نہ تو ایسی نظروں سے دیکھا اور نہ کبھی یوں ہنستی اور یہ بازو...... بغیر آستین کی قمیص میں پی۔ آئی۔ اے کی ایرہوسٹسوں والا پاجامہ پہنے واقعی وہ ایک سنسنی خیز لڑکی تھی۔ ٹانگوں کے جنگل میں پھنسا وہ اس بازو کو دیکھتا رہا۔ جس کی مچھلیاں بس کے جھٹکوں کے ساتھ ہلکورے کھا رہی تھیں۔ پلاسٹر آف پیرس کے بنے اس بازو کو اس کی نظریں مساس کرتی رہیں۔ کمال ہے! اتنا سفید بازو! بال کٹے تھے اور قمیص پشت پر سے بھی V بناتی تھی اور اس V کے درمیان ریڑھ کی ہڈی کا ابھار! کمال ہے! کمال ہے!! وہ بس سے اتری تو اس نے سوچا آج بہت سے شوہر اپنی بیویوں سے بدکاری کریں گے، مگر اس کی بیوی کس بس سے سفر کر کے آئی ہے؟

اب وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ثابت ہو رہے تھے۔ دونوں کی ہر ادا خلافِ معمول تھا۔ وہ بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی، آنکھوں کی پتلیاں پھیلنے کو تھیں۔

"تم۔ تم—" الفاظ حلق میں اٹکے اٹکے

"میں؟" وہ کمرے کے وسط میں حیران حیران

"کون ہو تم؟" وہ چیخی۔

"میں — میں — تمہارا —" وہ ہکلاتا ہے۔

"نہیں! نہیں!! نہیں!!!"

"شور نہ کرو بچے جاگ جائیں گے۔"

"بچے؟ کیسے بچے!! بچے یہاں کہاں؟" وہ پوری قوت سے چلاتی ہے: "تم کون ہو؟"

دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں حیرت کی تحریر پڑھتے ہیں۔ وہ بالآخر تھکی تھکی سی پلنگ پر ڈھے جاتی ہے: "یہ کوارٹر نمبر ۱۱۵ ہے۔"

"اوہ!"

" حکومت نے ایک مشہور ماہر تعمیرات سے اس کالونی کے لیے جو نقشہ بنوایا اسے تمام ممالک میں ایسی کالونیاں بنانے کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ کوارٹر ایک جیسے ہوں گے۔ سڑکیں زاویہ قائمہ پر کاٹیں گی۔ گلیاں ایک دوسرے کی متوازی زاویہ قائمہ پر ایک دوسرے کو کاٹیں گی۔

ہر مکان میں دو کمرے، ایک برآمدہ، ایک صحن اور..." (تالیاں !تالیاں!!)

زاویہ قائمہ بناتی سڑکوں کے ملاپ پر دو کھمبے ہیں۔ ایک کا بلب فیوز ہے اور دوسرے میں بلب لگ ہی نہیں سکتا۔!

جو جاگے ہیں خواب میں!

"ہیں خواب میں"

عجب آسیبی فضا تھی کہ فضا کم تھی کچھ اور زیادہ تھی۔ گویا غیر مرئی آنکھیں پلک جھپکے بغیر گھور رہی ہوں۔ لیکن مڑ کر دیکھنے پر پھولوں میں، پتوں میں اور جھاڑیوں میں تبدیل ہو جائیں۔ شاہ بلوط کے سر کشیدہ درخت کی شاخیں بازو پھیلائے مکان کو اپنی پناہ میں لئے تھیں۔ ابتدائی چاند کی مریض روشنی میں مکان آسیب زدہ کھنڈر کی مانند اپنی خاموشی کے اسرار میں ملفوف تھا۔ لہریا لیتی پگڈنڈی پر قدم رکھا تو سانپ بھی ساتھ ہوئے۔ لیکن دیکھنے پر سائے میں تبدیل ہو جاتے۔ دور سے کسی گیدڑ کی آواز آئی مگر ہو سکتا ہے وہ گیدڑ نہ ہو کچھ اور ہی ہو۔ لیکن جس نے راستہ کاٹا وہ بلی نہ تھی بلکہ سیہہ تھی کہ کانٹوں کے لبادہ میں بہت بج رہی تھی۔

بے خواب کیواڑوں کے ماتھے پر زنجیر کا جھومر سج رہا تھا۔ ایک، دو، تین اور پھر چار زنجیر کے چار حلقے جوابا گھور رہے تھے۔ جسم کے اندر تہ در تہ بند مساموں سے باہر آنے کے لئے پسینہ زور لگا رہا تھا مگر جسم میں بند بدبو راستہ نہ دے رہی تھی۔ جس کا بوجھ تہ تر تہ بڑھتا جا رہا تھا۔ مگر زنجیر کے لمس نے موسم تبدیل کر دیا کہ ہاتھ بڑھایا تو خنک زنجیر نے ریڑھ کی ہڈی کو سردا دیا۔

دستک سے شیشے جیسی خاموشی کرچیوں میں تبدیل ہو گئی۔ مکان کے باطن میں آواز یوں گونجی گویا اندھے کنویں میں پتھر پھینکے جا رہے ہوں۔ اس نے ابھی تک زنجیر نہ چھوڑی تھی جو

چپ چپاتے جسم میں قطرہ قطرہ تازگی منتقل کرتی جا رہی تھی۔ مگر حبس کی بھی ایک اور تہ جم گئی تھی۔
زنجیر مزید زور سے ہلانے کی مستقل مزاجی رنگ لائی۔ روشنی کی کپکپاتی لکیر گرد آلود شیشے سے طلوع ہو رہی تھی۔

زنجیر سے ہاتھ اٹھالیا جو ٹھنڈک کی خیرات دینے کے بعد پسینہ پسینہ تھی۔ ہاتھ میں موم بتی لئے لکڑی کا دیمک کھایا چہرہ گھور رہا تھا۔ سر پر خشک بیلوں کا جال، چہرہ پر جھریوں کی سلوٹوں میں دو گھونسلے جن سے نظریں چڑیا کے خوفزدہ بچوں کی مانند جھانک رہی تھیں۔

ساکت فضا اور دم سادھی ہوا میں موم بتی کی لَو تن کر کھڑی تھی!

وہ خوش دلی سے مسکرا کر کچھ کہنے کو منہ کھولتا ہے مگر اندر آنے کا اشارہ کرتا ہوا مڑ جاتا ہے گویا وہ اِسی کا منتظر تھا۔ موم بتی کی روشنی کے عقب میں اُس کے شانے زیادہ جھکے ہوئے اور چال زیادہ بے ترتیب نظر آتی ہے۔ چوبی فرش پر قدموں کی بازگشت اور روشنی کے نیم جاں دائرہ میں وہ چلے جا رہے ہیں۔ جہاں روشنی کا دائرہ دم توڑتا ہے، وہاں سایوں کی مانند پھیلی چوبی دیواریں اور چھت کی کڑیاں ہیں۔ بازگشت اور دائرہ سیڑھیوں پر متحرک رہنے کے بعد ایک کمرہ میں ساکت ہو جاتے ہیں۔

سر پر لٹکتی لالٹین کے سائے میں تین صورتیں گھور رہی ہیں۔ بوڑھا ان کے درمیان خالی جگہ پر بیٹھ کر سائے کے دائرہ کے باہر موم بتی رکھ دیتا ہے۔ لَو کی کمر میں لمحہ بھر کے لئے خم پیدا ہوتا ہے لیکن فوراً ہی تن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

آنکھ سے آنکھ کا تعارف ۔ لڑکی؟ غالباً جوان! پتلیوں میں موم بتی کی لَو رقص کر رہی ہے۔ عورت! یقیناً بوڑھی! پتلیوں میں لَو نقطہ بنی ہوئی ہے۔ مرد؟ مرد دیکھا نہیں جا سکتا کہ نظریں چراتا ہے۔

اپنے تعارف کو منہ کھولا تو دیکھا کہ چاروں فرش پر ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں۔ لڑکی، عورت، مرد اور بوڑھا۔ کھلی ہتھیلیوں کی ترتیب سے ہاتھوں کا پہیہ بنا ہے

وہ پوچھنا چاہتا ہے، مگر سب اس کی موجودگی سے لاتعلق ہیں۔ جھجک کے بعد وہ بھی ان کے ہاتھوں پر ہاتھ دھر دیتا ہے۔ بوڑھا کھلی ہتھیلی پر موم بتی رکھ دیتا ہے۔

سر پر ٹنگی لالٹین کے سائے میں پانچ ہاتھوں کی کھلی ہتھیلیاں اپنے اپنے وجود کا لمس موم بتی میں منتقل کر رہی ہیں کہ شعلہ اس کا عالم رقص میں ہے۔

شاید روح بلانے کے لئے یہ کوئی پُراسرار عمل کرنے جا رہے ہیں۔ چنانچہ منتظر رہا کہ ابھی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے پر سوار رُوح آئے گی اور ماضی کے دفینوں اور مستقبل کے خزینوں کی نشاندہی کرے گی۔ سُن رکھا تھا کہ ایسے موقعوں پر روشنی مدھم ہو جاتی ہے۔ کمرہ نامانوس خوشبو سے بھر جاتا ہے، تب رقصاں ذرّات سے مرتب ہونے والے ہیولی کے دائرہ میں روح نظر آتی ہے۔

کچھ بھی نہ ہوا، نہ سرد جھونکا، نہ رقصاں ذرات، نہ خوشبو!

محسوس ہو رہا تھا گویا متوقع بیٹھے بیٹھے وہ خود ہی غیر مرئی وجود اور رقصاں ذرّات میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔ یوں کہ اگر تیز ہوا آ جائے تو انہیں اڑا کر، کھلی کھڑکی سے باہر لے جا کر بکھیر دے۔

پانچوں موم بتی کی لَو پر نگاہیں جمائے بیٹھے رہے اور پھر جیسے روشنی کا دائرہ سکڑتا گیا، حتیٰ کہ وہ محض ایک نقطہ بن کر رہ گیا۔ ادھر ان کے وجود برقی ذرّات میں تبدیل ہو کر نقطے کے دھڑکتے دل کی تال پر رقص کر رہے تھے۔

موم بتی بجھ جاتی ہے!

وہ گویا نیند سے بیدار ہو جاتے ہیں مگر لالٹین کے دائرے میں خاموش بیٹھے جیسے ایک دوسرے کی سانسوں کی کہانی سُن رہے ہوں۔

سب اٹھتے ہیں اور خاموشی سے اپنے اپنے کمروں کا رُخ کرتے ہیں۔ بوڑھا اُسے جس کمرہ میں لے جاتا ہے وہاں کمرے کی اپنی روشنی نہیں مگر مریض چاند کی بیمار روشنی نے

اجالا منتشر کر رکھا ہے۔ بوڑھا شب بخیر کہے بغیر نکل جاتا ہے۔

بستر آرام دہ ہے مگر نیند بھی چڑیا کی مانند قریب آنے سے کترا رہی ہے۔

"ہنوز"

نیم تاریک کمرہ میں چیزیں کم اور ان کے سائے زیادہ ہیں۔ حتیٰ کہ بستر پر لیٹے لیٹے وہ خود کو بھی ایک سائے میں تبدیل ہوتے محسوس کرتا ہے اور جس طرح سایہ کا آشنا سایہ ہوتا ہے اسی طرح اُسے محسوس ہوتا ہے کہ دروازہ کے باہر سے سایہ گذرا ہے۔ وہ اُٹھ کر باہر آتا ہے۔ واقعی کوئی سیڑھیاں اتر رہا ہے، یہ بھی پاؤں دبا کے پیچھے اترتا جاتا ہے۔ یہ لڑکی ہے جس کی پتلیوں میں موم بتی کی لَو رقص کر رہی تھی۔ وہ خاموش باغ کی روشوں پر چل رہی ہے۔ سفید لباس پر درختوں سے آتی روشنی اور جاتے سایوں کا سفر ختم ہونے پر وہ باغ کے ایک اجاڑ گوشے میں رُک کر اپنے ہاتھوں سے نرم زمین کھودنے لگتی ہے بغیر تھکے اور دم لئے۔ حتیٰ کہ ایک چھوٹا سا گڑھا بن جاتا ہے، وہ لباس کی تہوں سے ایک تھیلی برآمد کرتی ہے۔ اس میں سے بیج نکال کر گڑھے میں ڈالتی ہے۔ جسے مٹی سے پُر کر کے ہتھیلیوں سے آہستہ آہستہ زمین تھپتھپاتی ہے۔ اُس کے بعد لمحہ بھر ساکت کھڑی ہو کر اپنے کام کا جائزہ لیتی ہے، مسکراتی ہے اور پھر واپس مڑتی ہے۔ وہ جھاڑی کی اوٹ میں ہو جاتا ہے۔ وہ جب پاس سے گذری تو گنگنا رہی تھی۔

دبے پاؤں واپس آکر ابھی لیٹا ہی تھا کہ پھر ایک سایہ کھڑکی کے سامنے سے گذرا اور مارے تجسس کے یہ بھی پیچھے ہو لیا۔ یہ عورت ہے جس کی پتلیوں میں لو ایک نقطہ کی مانند جمی تھی اور سیدھی وہیں پہنچی جہاں لڑکی نے گڑھا کھود کر بیج ڈالے تھے۔ عورت پانی بھر کر لائی ہے اور اس گڑھے پر احتیاط سے چھڑکاؤ کرتی ہے۔ نہ اتنا زیادہ کہ بیج ڈوب جائیں اور نہ اتنا کم کہ بیج پیاسے رہ جائیں۔ ایک لمحہ کو وہ رک کر پانی سے تر گڑھے کو دیکھتی ہے جہاں سے سوندھی سوندھی بھاپ اٹھ رہی ہے، مسکراتی ہے اور گھر کا رخ کرتی ہے

آ کر لیٹنے بھی نہ پایا کہ کسی کے گذرنے کا احساس ہوا۔ یہ مرد ہے جو نظریں چراتا تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا سیدھا اسی مقام پر پہنچتا ہے۔ نرم گڑھے کی مٹی کھود کر تمام بیج باہر نکال دیتا ہے۔ یوں لگا جیسے وہ بیج پھینک دے گا۔ پھر ارادہ بدل کر انہیں اپنے منہ میں رکھ کر چباتا ہوا واپس مڑ جاتا ہے۔

یقین تھا کہ اب بوڑھا بھی پیچھے پیچھے آتا ہوگا چنانچہ واپسی کی بجائے وہیں جھاڑی کی اوٹ میں کھڑا رہا، چند لمحوں بعد بوڑھا نمودار ہوتا ہے۔ وہ گڑھے کی مٹی گڑھے کو لوٹاتا ہے۔ اور پھر ہاتھوں سے تھپتھپا کر سطح یوں ہموار کر دی گویا کبھی گڑھا تھا ہی نہیں۔

"جو جاگے ہیں خواب میں"

صبح نیچے اترا تو چاروں بیٹھے تھے۔ اسے دیکھ کر لڑکی بولی: "آپ تمام رات چلتے رہتے ہیں ؟"

"ہاں!" عورت بولتی ہے۔ "میں نے آپ کو باغ میں منڈلاتے دیکھا تھا۔"

مرد بولا: "کچھ لوگوں کو خواب میں چلنے کی بیماری ہوتی ہے۔"

بوڑھا بولا: "اس عمر میں یہ مرض اچھا نہیں۔ آپ کسی اچھے معالج سے علاج کرائیے۔"

وہ حیرت زدہ ان کی باتیں سنتا اور سب کے سنجیدہ اور مطمئن چہرے دیکھتا ہے۔ آٹھ آنکھیں اسے دلچسپی سے گھور رہی ہیں۔ وہ کچھ کہنے کو منہ کھولتا ہے مگر سوچتا ہے کہ ان کے درمیان الفاظ کا پل نہ بن سکے گا۔

اس نے باغ کا رخ کیا تو چاروں بھی پیچھے ہو گئے وہ ان کا جھوٹ بے نقاب کرنے سیدھا باغ کے اس گوشے میں جاتا ہے جہاں رات بھر ناٹک ہوتا رہا۔ اس کی فاتحانہ انگلی گڑھے کی طرف اس طرح اشارہ کر رہی ہے گویا کسی مجرم کی نشان دہی کر رہی ہے۔

"اوہ یہ — !"

سب ہنستے ہیں۔ تب لڑکی پانچ سالہ بچی کی آوازیں بتاتی ہے " میری چڑیا مرگئی تھی اسے میں نے دفن کیا تھا۔"

اور تب اُسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ پرندوں کی آوازوں سے محروم، باغ کے اندھے کنویں جیسے سناٹے کو صرف ان کی سانسیں توڑ رہی ہیں۔

آئینہ تکرارِ تمنّا

۔۔۔۔۔۔۔ اور پھر اس ستارے کا ظہور ہوا جو بظاہر تو ایک رنگ تھا مگر ہر دیکھنے والے کے لیے جدا جدا رنگ کا !

مرد تھے ، دنیا کے تین خطوں سے متعلق !

وہ چٹیل صحرا کا باسی تھا ۔ پیشانی ہموار اور ہاتھ کی لکیریں الجھی پگڈنڈیاں ۔ رات کے پچھلے پہر دھنسی ہوئی آنکھیں اٹھا کر دیکھا تو آسمان کے موتیوں بھرے تھال میں وہ ستارہ زمرد بنا رنگ افروزِ نظر آیا ۔ ستارے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا ، سو دل میں پھیلی صحرا ایسی ویرانی نخلستان میں تبدیل ہوئی کہ ستارہ نخلستان کی ہریالی تھا ۔ ہوش کو جسم میں لرزش کی طرح محسوس کیا ۔ خواب اس زمرد کے روپ میں سامنے تھا مگر تعبیر کے لیے سفر درکار تھا ۔ وہ سفر کے لیے تیار تھا

وہ چٹانوں کا سینہ چیر کر کھلنے والا پھول تھا ، شریانوں میں رگِ سنگ کا لہو ، ناک پہاڑی عقاب کی چونچ !

بڑے پہاڑ کی بلند چوٹی کو جب یاقوتی ستارے سے دمکتے پایا تو اس کی اور اپنے لہو کی سرخی میں ایک ہی رنگ آمیز پایا ۔

رات غار میں بسر کی ۔ یہاں رات بھر جانوروں کی آوازیں سنیں اور سانپوں کو جھانکتے پایا ۔ جب یاقوتی ستارے کو راہنما بنا کر چلا تو اس کی بھیڑوں نے اداس اداس آنکھیں اٹھا کر دیکھا مگر وہ اب بے پروا تھا ۔ لہو کی سرخی عظیم تر سرخی کی طرف رجوع کر رہی تھی ۔

وہ اس رات بہت بے چین تھا ، دل یوں دھڑکتا گویا کوئی اہم اور انجانی بات ہونے والی

ہے۔ سمندر کی تہہ سے ابھرا تو بھیگی آنکھوں کو دور جزیرہ مردہ مچھلی کی آنکھ سا نظر آیا تھا۔ اپنی آنکھوں ایسا نیلا سمندر اب دل میں اندیشوں کی سیاہی جیسا تھا۔ جب تیر تیر کر تھک گیا تو خود کو سمندر کی لہروں پر طوفان میں غرق جہاز کے بے مصرف تختے کی طرح چھوڑ دیا۔ کھارا پانی جھولے دے رہا تھا۔ معاً آنکھوں کو نیلمیں ستارے سے دوچار پایا — نیلاہٹ ایسی گویا سمندر کا رنگ نتھر گیا ہو۔ وہ سحر زدہ تکتا رہا۔ سامنے میں نیلی آنکھوں والی طرح دار کنواری کا معصوم بلاوا تھا۔ اب تک وہ اس ستارے کو ان دیکھی آنکھوں سے دیکھتا رہا تھا، سو اب دیکھا تو جانا کہ سفر کی گھڑی آ گئی ہے۔ وہ بے چین لہر کی طرح ساحل سے ٹکرایا اور جسم خشک کئے بغیر چل دیا۔

تین مرد تھے، دنیا کے تین خطوں سے متعلق، ایک ہی سمت رواں تھے۔ وہی ایک ستارہ ان کی منزل تھا جو بظاہر یک رنگ تھا مگر ہر دیکھنے والے کے لیے جدا جدا رنگ کا! بھوک پیاس نے صورتیں تبدیل کر دیں، موسموں نے جسم روند ڈالے مگر راستے کی رکاوٹیں شکستہ پائی کا جواز نہ بن سکیں کہ دل کے نخلستان میں زمرد نما ستارے سے رونق تھی۔ لہو کی سرخی یاقوتی ستارے کی تال پر دھڑکتی اور آنکھوں میں نیلمیں ستارے سے جوت تھی۔

دنیا کی وسعتیں سمٹ گئیں، ہر روز وہ ستارے سے خود کو قریب تر پاتے۔ آخر ایک روز تینوں کے راستے آن ٹکرائے۔ اَن جانی محبت نے جوش مارا، بچھڑے ساتھیوں کی طرح گلے ملے۔ بولی نہ سمجھتے تھے مگر انھیں بات چیت کی ضرورت ہی کب تھی۔ تینوں کی آنکھوں میں ایک ہی تحریر تھی جسے سبھی پڑھ سکتے تھے۔ دلوں میں ایک ہی لگن الاؤ کی طرح روشن تھی۔ وہی ایک ستارہ ان کی منزل تھا جو بظاہر یک رنگ مگر ہر دیکھنے والے کے لیے جدا جدا رنگ کا!

چلتے چلتے — چلتے چلتے وہ ایسے ہولناک اور ویران علاقے میں جا پہنچے جہاں پچھل پائی کا جگر پانی ہو، فضا ایسی مکدر کہ شاہین کی آنکھ اندھی ہو۔ خشک چٹانیں گویا لاوا جم گیا ہو۔ بے آب و گیاہ راستے پر ساتھ ساتھ سانپ چلتے جاتے اور پھر تھک کر پیچھے رہ جاتے۔ سیاہ بچھو ٹیڑھا ڈنک اٹھائے راستہ کاٹ جاتے۔ رات کو ہوا غضبناک ناگن کی طرح شوکتی اور دن کو سورج سوا نیزے پر آ کر چٹانوں

کو تابنہ بنا دیتا۔ دور فضا میں زہریلی مکڑیاں مہین اور خوبصورت جال بناتی رہتیں کہ دل پھنسنے کو چاہے۔ طاقت ختم ہونے کو تھی مگر عزم جوان تھا راستے کی ہونا کی کا یوں احساس نہ تھا کہ دل کے نخلستان میں پناہ لیتا۔ خون کی گردش میں کمی ہو تو ہو مگر سرخی اب بھی ستارے ایسی تھی۔ آنکھیں بظاہر پرسکون مگر نیلاہٹ میں سمندر کے طوفان۔

ستارہ اب پھل کی طرح اتنا قریب تھا گویا اچھل کر توڑ لیں گے۔ وہ بڑھتے رہے حتیٰ کہ ایک دن خود کو منزل پر پایا۔ چاروں اور وحشت ناک سناٹے کا راج تھا۔ سامنے بہت بڑے آتش فشاں کے جہنمی دہانے پر آگ کی ہزاروں زبانیں ہانپ رہی تھی۔ چاروں طرف قد آور مجسمے تھے۔ مختلف چہروں والے اور مختلف حالتوں میں۔ سب کے چہروں پر وحشت اور حسرت کھنڈی ہے۔

اور تب انہیں علم ہوا کہ وہ ستارہ محض آتش فشاں کا عکس تھا۔ ستاروں کے بغیر آسمان سیاہ تھا اور اس سیاہی میں صرف آتش فشاں سائیکلوپس کی آنکھ بنا چمک رہا تھا۔ ایسی آنکھ جسے وہ اندھا نہ کر سکتے تھے۔

شدت غم نے چیخ بن کر نجات چاہی تو منہ نہ کھلے — وہ مجسمے بن چکے تھے۔

خاموشی کا کیپسول

محسوس ہوتا، یوں جیسے بدآہنگ آوازوں نے روپ دھار لیا۔ ان کا لمس کینچوے کی طرح اعصاب میں ناگواری اور کراہت ابھارتا، عورت کی سمع خراش آواز، بچے کے حلق سے نکلی ہوئی کانوں کو چیرتی چیخ، سرخ روشنی پہ رکتی کار کے ٹائروں کی گھسیٹ — یہ سب اپنے غیر مرئی روپ کو چھوڑ کر خوابوں کے بھوت بنے میرے اردگرد منڈلاتے۔ میں چیخ اٹھتا ہوں۔ بلکہ زیادہ بہتر تو یہ ہے کہ چیخنے کی کوشش کرتا ہوں، کیونکہ میرا منہ کھلتا ہے لیکن حلق سے انڈیلی جانے والی آواز کہیں ایسی گم ہو جاتی ہے کہ میں سوچتا رہ جاتا — یہ چیخ میری تھی یا مجھے اپنے گھیرے میں لیے آوازوں کے بھنور ہی کی ایک لہر!

دونوں اکٹھے لیٹے ہیں۔ کان کے نیچے عورت کی دھڑکن کمرے کی گاڑھی سیاہی میں پھلجھڑیاں چھوڑ رہی ہے۔ اچانک اس کی آواز کا دھماکا! لذت کی گراں باری تلے ڈوبتے ڈولتے، ڈولتے ڈوبتے اعصاب نیچے کی رسیوں کی مانند ٹوٹنے لگتے ہیں۔ چیخ اٹھتا ہوں۔ وہ بھی چیختی ہے، کمرے کی رات اور بھی تاریک ہو جاتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو نظر نہ آنے والی آنکھوں سے تک رہے ہیں۔ آنکھیں جن میں خوف سے اور پھیلنے کی سکت نہیں۔ اس مرتبہ چیخنے کی ہمت بھی نہیں کہ اپنی چیخ سے زیادہ مکروہ، دنیا میں اور کوئی شے نہیں ہو سکتی۔

"بیوی سے بازاری عورت بہت اچھی!"

"کیوں؟"

"خراٹے تو نہیں لیتی۔"

"WHAT ABSURBITY!"

میں خاموش ہوں، وہ بولے جا رہی ہے، وہ بولے جا رہی ہے، میں خاموش ہوں۔ ہونٹوں سے فارغ ہوتے ہی وہ پھر بولنا شروع کر دیتی ہے، پھر بولنا شروع کر دیتی ہے اور پھر بولنا شروع کر دیتی ہے جب اس کی گردن کے گرد انگلیوں کا دائرہ بن رہا تھا تو وہ خاموش نہ تھی کیونکہ وہ یہ سمجھی کہ یہ بھی پیار کا ایک انداز ہے، لیکن میں جانتا ہوں کہ مجھے بہرحال اس کی زبان بند کرنا ہی ہو گی کہ مجھے اس سے محبت ہے — گہری اور والہانہ محبت! مگر آواز کے پتھر سے شیشے کی طرح چکنا چور ہونے والی محبت نہیں۔

منحوس عورت نے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکال کر مرنے کا لطف غارت کر دیا — بالآخر — طویل جدوجہد کے بعد — میں اپنے گرد خاموشی کا ایک کیپسول بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہوں۔ میں ایک بچے کی طرح خوش ہوں۔ خاموشی کی گاڑھی سفیدی میں روشن دان، دروازے، کھڑکیاں حتیٰ کہ جھری تک بھی نہیں۔ ایک مدوّر پھیلاؤ، ایسا حصار جس میں آوازوں کے برمے گھاؤ پیدا نہ کر سکیں۔

سناٹا! وہ سناٹا جہاں آواز دبے پاؤں چلتی ہے۔ وہ سناٹا جہاں دل بھی دھڑکتے گھبرائے۔ وہ سناٹا جو اپنی گمبھیرتا میں پھیل کر صحرا ایسی وسعت اختیار کر لے اور سمٹنے پہ آئے تو دل میں سما جائے۔ میں خاموشی کے اس صحرا میں خود کو ذرّہ محسوس کرتا ہوں، میں خوش ہوں حتیٰ کہ خاموشی نغمہ بن کر اعصاب میں سرایت کر جاتی ہے۔ میں آسودہ ہوں کہ خاموشی کی کومل دلہن اب آواز کے ہاتھوں گندی نہ ہو گی۔

"مجھے چھپکلی سے بہت ڈر لگتا ہے!"

"کیوں؟"

"مچھر کی طرح آواز نہیں آتی۔"

خاموشی سانپ بن کر ڈسنے لگتی ہے۔ ذہن سٹوڈیو ہے۔ بلو فلموں کی شوٹنگ برابر جاری ہے۔

مصنف، کیمرہ مین، ہدایت کار، فلم ساز اور اداکار: میں!

تمام کام خاموشی سے ہوتا ہے، بیک گراونڈ میوزک کے لیے خاموشی!

خاموشی شوکتی ہے۔ سٹوڈیو سے ٹیپ ریکارڈ لے آتا ہوں۔ ٹیپ خالی ہے کس چیز سے بھروں؟ خاموشی کے دربار میں آواز تو مجرم ہے، آواز کہاں سے آئے؟ آواز کو کون آواز دے سکتا ہے؟

خاموشی!

میں چیخنا چاہتا ہوں لیکن خاموشی کی دلدل نگلے جا رہی ہے۔ خالی ٹیپ کو اپنی چیخ سے بھرنا چاہتا ہوں، لیکن چیخ بھی بھولی یاد بن چکی ہے۔ اوہ! خالی ٹیپ کو کس سے بھروں؟

"اے ماہ لقا! اپنی شرط بیان کر!"

"اے نیک مرد حاتم! جا اور کوہِ ندا کا احوال دریافت کر!"

"اے زہرہ جبیں! کیا صرف اسی سے گل مراد حاصل ہوگا؟"

"ہاں حاتم!"

بو فلموں کی شوٹنگ بند ہو چکی ہے۔ ان فلموں کے ریلیز ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ ان میں عورت کی دھڑکن سے پھلجھڑیاں نہ چل سکیں۔ پھلجھڑیاں چلانے کے لیے جس کیمرہ ٹرک کی ضرورت تھی وہ کیمرے کے بس کا روگ نہ تھا۔ ٹیپ اب بھی خالی ہے کہ اس میں دھڑکن مقید کرنے کا ذریعہ نہ تھا۔ از خود تو ٹیپ دھڑکنے سے رہا۔ پھر اسے کس شے سے زندہ کروں؟

خاموشی! خاموشی!!

باہر کی چڑیلوں، آسیبوں اور عفریتوں سے ڈر کر خاموشی کے کیپسول میں پناہ لی تھی مگر اب تو خود سے رشتہ ٹوٹتا جا رہا تھا۔ میں جانتا ہوں یا یہ کہ جان چکا ہوں کہ صرف آواز سے اپنے وجود کو دریافت کر سکتا ہوں۔ خاموشی کی جما ہی لیتی کھائی پر صرف آواز کا پُل کام دے گا۔ پُل کیسے بنے؟ ٹیپ بھی تو خالی ہے؟

اور تب حاتم نے کہ سفر کی گرد میں ملبوس تھا، آن کر کہا:

"سن اے مہ لقا! کوہِ ندا کا راز خاموشی ہے۔"

دونوں کے درمیان خاموشی کا مہین پردہ ہٹا کر اُس نے پوچھا: کیا تم اس خاموشی کا راز پانے کے لیے سفر نہ کرو گے؟

"ہرگز نہیں"

"کیوں؟"

"اس کے لیے مجھے داخلی خلا میں جانا ہوگا۔"

"تو؟"

"اسی سے فرار کے لیے تو میں دوسروں کے لیے مہمیں سر کرتا پھرتا ہوں۔"

اور یوں اس پاگل سوال نے حاتم کا شاندار کیریئر تباہ کر دیا۔

"خاموشی! خاموشی!! خاموشی!!!"

خاموشی طوفانِ نوح کی طرح موجیں مار رہی ہے اور آواز سمندر کی تہ میں ڈوبی ناؤ! یوں محسوس ہوتا ہے جیسے خاموشی کے اُلجھے ہوئے دھاگوں میں میری آواز کا سرا گم ہو چکا ہے۔

"اے غار میں میں اترنے والے! اس ڈور کا سرا مضبوطی سے تھامے رہنا۔ ڈور چھوٹ گئی تو ہمیشہ کے لیے غاروں کی بھول بھلیوں میں اُلجھ کر رہ جاؤ گے۔"

جو مجھے نہ کرنا چاہیے تھا میں نے وہی کیا کہ خاموشی کے کیپسول میں اپنی آواز کی ڈور کو گنوا بیٹھا ہوں۔ سر ٹکرانا چاہتا ہوں کہ شاید سر کا سودا ہی اس حصار کو توڑ دے مگر سامنے بے کراں وسعتیں نمودار ہو جاتی ہیں۔ بھاگ بھاگ کر تھک جاتا ہوں، پاؤں ٹوٹ جاتے ہیں۔ ہونٹوں پر نمکین ذائقے سے معلوم ہوتا ہے کہ بے آواز آنسو بہا رہا ہوں، خاموشی سے سسکیاں لے رہا ہوں۔ مجھے اب یاد آیا کہ طلسم کی تسخیر کرنے والا اسم اعظم بھول گیا ہوں۔

خاموش چیخ سے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ آنکھ کھل جانے پر شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ محض خواب ہی تھا۔

مگر ہنوز خواب جاری ہے پھر خاموش چیخ سے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ آنکھ کھل جانے پر شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ محض خواب ہی تھا مگر ہنوز خواب جاری ہے۔ پھر! خاموش چیخ سے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ آنکھ کھل جانے پر شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ محض خواب ہی تھا مگر ہنوز خواب جاری ہے۔

ٹیپ ابھی تک خالی ہے اسے کس شے سے بھروں؟

ایک عجیب بات ہوتی ہے تقریباً انہونی۔ خاموشی کا کیپسول سکڑنے لگتا ہے۔ یہ مہیب گنبد بے در چھوٹا ہوتا جاتا ہے۔ میں دیوانہ وار ان پاگل کر دینے والی وسعتوں کو تلاش کر رہا ہوں۔ کیونکہ اسم اعظم بھلا بیٹھا ہوں۔ اس لیے ہر دم سکڑتے کیپسول کو بلبلے کی مانند پھونک سے نہیں اڑا سکتا۔ وہ سکڑ رہا ہے۔ وہ سکڑتا جا رہا ہے۔ وہ سکڑ رہا ہے۔ وہ سکڑ چکا ہے۔

میرے گھٹنے پیٹ سے لگ چکے اور میں نہیں جانتا کہ آسودہ ہوں یا مردہ!

سفرنامے

- خانہ بدوش — مستنصر حسین تارڑ
- پیار کا پہلا شہر — مستنصر حسین تارڑ
- پرندے — مستنصر حسین تارڑ
- اُندلس میں اجنبی — مستنصر حسین تارڑ
- ہنزہ داستان — مستنصر حسین تارڑ
- نکلے تری تلاش میں — مستنصر حسین تارڑ
- پیرس ۵۰۰ کلومیٹر — محمد اختر ممونکا
- زمین اور فلک — انتظار حسین
- اے آبِ رُودِ گنگا — رفیق ڈوگر
- لندن لندن — قمر علی عباسی
- دائروں میں دائرے — فردوس حیدر
- سفر در سفر — اشفاق احمد
- دو سفرنامے — مُنیر فاطمی
- آجاؤ افریقہ — کشور ناہید
- اواگون — [illegible] فرخ